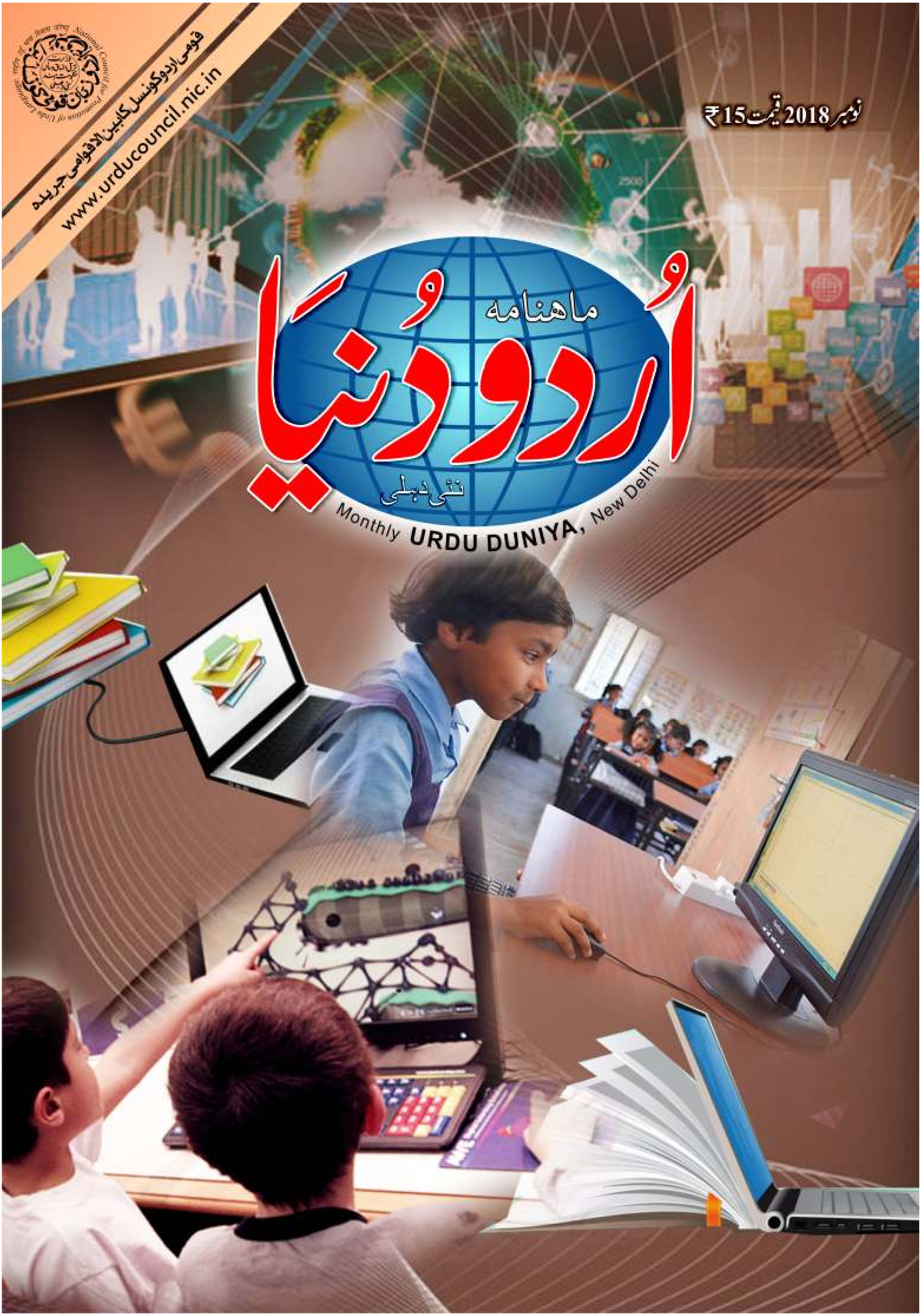
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
نومبر 2018 قیمت 15₹
ماھنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

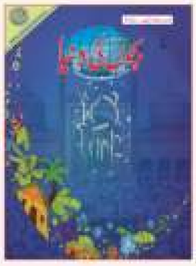

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:11، نومبر 2018

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746،   فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ
ہماری بات — 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 5

انٹرویو
ترجمہ ایک وجدانی عمل ہے: قطب سرشار — محبوب خان اصغر — 7

زبان و تعلیم
سوال کی اہمیت — وجیتا پرویز — 12
اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی — انجم پروین — 14

نقد و نگاہ
لالہ مادھورام جوہر — پی پی سریواستو رند — 18
ہندو ذولسانی شعرا پر ایک نظر — محمد یحییٰ جمیل — 20
جاں نثار اختر کی طویل نظمیں — صدیق محی الدین — 23
صفی لکھنوی — عبدالناصر فاروقی — 26
ڈپٹی نذیر احمد کے مکتب میں سائنس کی تعلیم — شاداب تبسم — 30

ناموران نومبر
نیر مسعود کی افسانہ نگاری — عریشہ تسنیم — 33
اکبر الہ آبادی کی شاعری — محمد یاسین — 36
اسماعیل میرٹھی — سمیع احمد — 38
بچوں کے ناول نگار کرشن چندر — سالک جمیل براڑ — 40
مولانا ابوالکلام آزاد — عالیہ بیگم — 42
اقبال کی نثر — شہاب الدین — 44

خراج عقیدت
علامہ شبلی اور ملا واحدی — محمد الیاس الاعظمی — 46

تاریخ و ثقافت
منیر شریف کی چھوٹی بڑی درگاہوں کی تاریخی اہمیت — مہتاب جہاں — 48

چراغ دل
اورنگ آباد کے صوفیائے عظام — قاضی نوید احمد صدیقی — 51

ہم نے جنھیں بھلا دیا
اختر تلہری: ایک گمنام ادبی شخصیت — سید ابوذر علی — 55
زاہر حیدری — محمد یوسف رضا — 57

عالمی ادبیات
کیٹس کا شاہکار — منظر نیاز — 60

ماحولیات
ماحول اور موسمی تبدیلی — رفیع الدین ناصر — 63

فنون لطیفہ
ہندوستانی موسیقی میں پرانے فلمی نغموں کا مقام — نثار راہی — 67

سلسلۂ صحافت
پختون رہنما خان بخاری کابلی — اوم پرکاش سونی — 9

کمپیوٹر
ایم ایس آفس — 71

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ — 7

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ — 82

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 83

ہماری بات

ہر ادارے کے تاسیسی مقاصد، ترجیحات کے علاوہ ایک دائرۂ عمل ہوتا ہے۔ قومی اردو کونسل بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس کی اپنی ترجیحات اور مقاصد ہیں۔ کونسل کے اغراض و مقاصد میں اردو زبان کا فروغ، ترویج و اشاعت، اردو زبان اور اس کی تعلیم کے متعلق معاملات میں حکومت ہند کو مشورے دینا اور عربی اور فارسی کے فروغ کے لیے اقدامات کرنا شامل ہے۔ قیام سے لے کر اب تک قومی اردو کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ میں فعال اور متحرک کردار ادا کر رہی ہے اور قومی اور عالمی سطح پر اردو کے ایک بڑے ادارے کے طور پر اپنی شناخت بھی مستحکم کر چکی ہے۔ قومی اردو کونسل نے ہندوستان کے طول و عرض میں فاصلاتی تعلیم اور کمپیوٹر کے مراکز قائم کر کے اردو سے عوام کو جوڑنے کی کوشش کی ہے اور یقینی طور پر یہ قومی اردو کونسل ہی کا فیض ہے کہ بہت سے وہ علاقے جو اردو زبان کے لیے نامانوس اور اجنبی تھے وہاں بھی اردو زبان کے لیے بہتر فضا ہموار ہو رہی ہے۔ کونسل کی کوششوں کے باوجود اب بھی کرنے کے لیے بہت سے کام باقی ہیں کیونکہ بہت سے ایسے امکانی علاقے ہیں جہاں اردو کی رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ اب کوشش کی جائے گی کہ اردو ان علاقوں تک بھی پہنچے اور وہاں اردو کی تعلیم و تدریس کا بہتر انتظام ہو کیونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کسی خاص مذہب، طبقہ یا علاقے سے جڑی ہوئی نہیں ہے بلکہ پورے ہندوستان کی زبان ہے اور اس کے اندر اتنی شیرینی اور مٹھاس ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنا اسیر بنانے کی پوری قوت رکھتی ہے۔ اگر اس ضمن میں سنجیدگی سے اردو کی تمام تنظیمیں، ادارے، اکیڈمیاں کوشش کریں تو اردو کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو اس ملک میں صرف تعصب کی شکار ہے دوسری زبانوں میں بھی بہت سے ایسے افراد ہیں جو اردو سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے اردو شجر ممنوعہ نہیں ہے بلکہ وہ اردو کو اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کا ایک اچھا ذریعہ سمجھتے ہیں خاص طور پر اردو شاعری نے بہت سے غیر اردو داں طبقے کو اردو زبان سے جوڑنے کا بڑا اہم کام کیا ہے۔ آج ہندی اور دوسری زبانوں کے بہت سے ایسے شعرا اور ادبا ہیں جو صرف شاعری کے وسیلے سے اردو زبان سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ اردو میں غزل کہنے کے لیے نہ صرف اردو زبان سیکھ رہے ہیں بلکہ عروض اور بحور و اوزان کی بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ خوش آئند بات ہے کہ جس طرح ایک زمانے میں ابن صفی کے جاسوسی ناولوں نے بہت سے لوگوں کو اردو زبان سیکھنے کے لیے مجبور کیا تھا اسی طرح آج اردو شاعری بھی دوسری زبانوں کے شاعروں اور ادیبوں کو اردو سیکھنے کے لیے مہمیز کر رہی ہے۔

قارئین! ڈائرکٹر کی حیثیت سے قومی اردو کونسل کی جو ذمے داریاں مجھے سونپی گئی ہیں آپ کی محبتیں، مشورے اور عنایتیں شامل حال رہیں تو یقینی طور پر میں فروغ اردو کے لیے بہتر کام کرنے اور اردو کو کمپیوٹر اور عصری ٹیکنالوجی کے علاوہ اس ادارے کو گاؤں اور قصبات سے بھی جوڑنے کی کوشش کروں گا کیونکہ گاؤں اور قصبات میں بھی بہت سی ذہانتیں ہیں جن کا مرکزی سطح پر کبھی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ فروغ اردو کے اور بھی کام ہیں جو محبانِ اردو کے مشورے سے پایۂ تکمیل تک پہنچائے جائیں گے اور یہ بھی کوشش ہوگی کہ حکومت ہند نے زبان اور اقلیتوں کے لیے جو اسکیمیں وضع کی ہیں ان سے بھی اردو داں طبقے کو متعارف کرایا جائے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر ماہ اس تعلق سے مضامین شائع کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ میری اوّلین ترجیح یہ ہوگی کہ اردو کے بنیادی تعلیمی ڈھانچے کو مضبوط کیا جائے اور اردو کو عوام سے جوڑا جائے۔ حاشیائی فنکاروں پر خاص طور پر توجہ دی جائے کیونکہ یہ فنکار مرکز سے دور رہنے کی وجہ سے نہ صرف شہرت و مقبولیت سے دور ہیں بلکہ ان انعامات و اکرامات سے بھی محروم ہیں جن کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

'اردو دنیا' میں شخصی نوعیت کے جو انٹرویوز شائع کیے جاتے ہیں ان کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ ان میں بے معنی مباحث پر گفتگو کے علاوہ بے جا تشہیری مواد ہوتا ہے اس لیے آئندہ صرف وہی انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جن میں فروغ اردو کے متعلق تجاویز اور مشورے ہوں گے۔ ادارے کی طرف سے ایک سوالنامہ تیار کیا جائے گا اور تمام محبانِ اردو کی خدمت میں پیش کیا جائے گا کیونکہ کونسل کا بنیادی مقصد ادبی نظریات اور مباحث پر گفتگو نہیں بلکہ زبان اردو کا فروغ ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہم اردو سے جڑے ہوئے لوگوں تک سوال نامے یا دیگر ذرائع سے پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

خطوط

اکتوبر ماہ کا شمارہ اس ملک کے سربراہوں میں سرِفہرست مہاتما گاندھی کی نہایت خوبصورت تصویر والے سرورق و معیاری مضامین سے آراستہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ جناب ہمایوں اشرف نے ظہیر صدیقی کے ساتھ اپنے انٹرویو میں جتنے معقول سوالات کیے ہیں، اتنے ہی موزوں و مناسب جوابات موصوف نے بھی دیے ہیں۔ آخر میں ان کا یہ قول بھی درست ہے کہ ''نظم کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔'' علی سردار جعفری اور اختر الایمان دونوں ہی کا یہ عندیہ تھا کہ غزلوں میں عموماً حیات سے متعلق موضوعات کے بیان کی زمین کا طول و عرض مقابلتاً اتنا وسیع نہیں ہوتا ہے، جتنا کہ نظم کا۔

سر سید احمد خاں سے متعلق دونوں مضامین بھی معیاری ہیں۔ عبدالسمیع نے شہرۂ آفاق شاعر ندا فاضلی کے غالباً فراموش کردہ ہندی دوہوں کی صنفِ سخن پر مبنی ایک بلند پایہ مقالہ پیش کیا ہے۔ دیگر مضامین بھی معیاری ہیں۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک، پٹیالہ

'اردو دنیا' ستمبر کے اداریے 'اپنی بات' میں اردو زبان کے تعلق سے بڑے کام کی بات ہمارے سامنے رکھی گئی ہے جو ہمیں غور و فکر کی بھی دعوت دیتی ہے کہ اردو موجودہ صورتِ حال میں ختم نہیں ہو رہی ہے بلکہ ایک نئی شروعات کر رہی ہے۔ دور بدلتے ہیں، حالات بدلتے ہیں، حکومتیں بدلتی ہیں، وقت بدلتا ہے لیکن زبان کے بدلنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں اور اردو ابھی اپنی نئی صدی کا آغاز کر رہی ہے جو کہ گزری صدی میں صفحۂ قرطاس پر ہمیں پڑھنے کو ملتی تھی لیکن آج سوشل میڈیا کے ذریعے موبائل کی صورت میں ہماری مٹھی میں سما چکی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بند ہو رہا ہے بلکہ اشاعت کے ساتھ (Globle) دنیا کا وجود بھی اردو کی وسعتوں کو لے کر مزید اضافے کی شکل میں نمودار ہو رہا ہے جس کی وجہ سے عالمی سطح پر اردو کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم ہوا ہے اور پھر سونے پہ سہاگہ بقول آپ کے انگریزی میں اردو ادب کی نہ صرف تاریخیں لکھی گئی ہیں بلکہ پریم چند سے خواجہ احمد عباس تک اور خواجہ احمد عباس

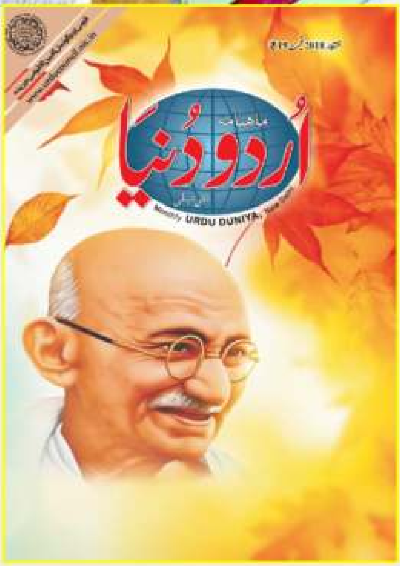

سے شمس الرحمٰن فاروقی تک انگریزی تراجم اردو کو پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے اداریے کے آخری پیراگراف میں یعنی حاصل اداریہ میں آپ نے جو انکشاف کیا ہے وہ برحق ہے کہ اردو زبان نہ صرف ہندوستان بلکہ امریکہ، لندن اور خلیجی یورپی ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور اس کا بنیادی سبب تراجم ہی ہیں جو اردو اور ادب اردو کی پہچان بنائے رکھے ہیں۔ جمال اختر کا مضمون 'ڈاکٹر گوپال داس نیرج کی یادیں' نظر سے گزرا جس میں جتنے بھی ان کے لکھے ہوئے مکھڑوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے وہ بے شک آج بھی ان کی مقبولیت کے حامل ہیں لیکن ایک بات غور طلب ہے کہ یہ سارے گیت اردو ہی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں— مثلاً — ہم تو مست فقیر، ہمارا کوئی نہیں ٹھکانہ ہے— آدمی ہوں آدمی سے پیار کرتا ہوں— اس حال میں جینے کی دعا کون کرے گا— کہتا ہے جو کر سارا زمانہ— انسان کو انسان بنایا جائے— جسم مرجانے سے انسان نہیں مرتا ہے— مجھے پلانے میں تم نے کیوں کمی کی ہے—

ان سارے گیتوں کا بغور جائزہ لیں تو کہیں بھی ان میں ہندی الفاظ نہیں ہیں۔ آج جو انھیں مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ اردو ہی کی عطا ہے۔

اردو کی علاقائی خبر میں صفحہ نمبر 94 میں پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر شافع قدوائی کو 'اقبال سمان' سے نوازے جانے کی خبر شائع ہوئی ہے۔ پروفیسروں کے علاوہ اردو ایوارڈ کے حق دار کیا وہ شعرا ادبا نہیں ہیں جو کسی یونیورسٹی یا کالج میں پروفیسر کے عہدے پر فائز نہیں ہیں۔ یہ واقعی اردو ادب اور ان ٹھیکیداروں کا بہت بڑا دل خراش المیہ ہے جس پر غور کرنے اور آواز اٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔

کیا آپ ایک دور افتادہ فن کار کے احساس کو اپنے قارئین تک پہنچانے کی جسارت کریں گے۔

'اردو دنیا' اگست کے اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے یومِ آزادی مبارک کے ساتھ اداریے کی شروعات کی ہے آپ کی بات برحق ہے کہ آزادی سے زیادہ بیش بہا اور کوئی چیز نہیں ہوتی اور اس آزادی کی جنگ میں مجاہدوں کے ساتھ ساتھ شانہ بہ شانہ اردو زبان بھی کمربستہ ہو کر اس محاذ میں کود پڑی ہے۔ حصہ مضامین میں محترمہ عائشہ خاتون نے جگر مرادآبادی پر مضمون لکھتے ہوئے اپنے خیالات کم اور دوسروں کے حوالہ جات کا سہارا زیادہ لیا ہے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر 2018 کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ خاص طور پر سرورق پر آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کا فوٹو ان کی بلند کرداری اور صاف ستھری سیاست کی یاد دلاتا ہے۔ اپنی بات یا ہماری بات کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔ اردو کے حوالے سے مدیر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تحریر قابل توجہ ہے جس میں انھوں نے اردو کے فروغ و ارتقا کے بارے میں سیر حاصل تحریر سپردِ قلم کی ہے اس میں شک نہیں کہ آج اردو دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں مختلف انداز میں مستعمل ہے۔ انھوں نے بہت سی اردو کتابوں کے تراجم کا بھی ذکر کیا ہے لیکن پروفیسر صاحب اردو تو خلا میں بولی گئی تھی جب بھارت کے ذریعہ ایک خلا باز راکیش شرما نے خلا سے ہمارے ملک کو دیکھ کر علامہ اقبال کے ترانہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا... پڑھ کر اس وقت کی وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی کو سنایا تھا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نہ صرف محبت، خلوص و تہنیت کی زبان بلکہ اس کو خلائی زبان بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو

کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو کے رسم الخط کو بچائیں اور موجودہ نسل کو دیگر عصری تعلیم کے ساتھ اردو رسم الخط سے بھی اچھی طرح واقف کرائیں۔ یہی ہماری اردو سے سچی عقیدت ہوگی کیونکہ رسم الخط کے بغیر زبانیں بولیاں بن جاتی ہیں۔ حامیان اردو اور اردو کے اداروں سے وابستہ سبھی لوگوں کی مشترک ذمہ داری ہے۔

❖ **ڈاکٹر مہتاب امروھوی**: چیف پراکٹر/صدر شعبۂ صحافت، نایاب عباسی پی جی کالج، امروہہ (یوپی)

ستمبر کا اُردو دنیا میرے سامنے ہے جس میں معروف افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد کا انٹرویو شامل اشاعت ہے۔ موصوف نے سچ ہی کہا ہے کہ قاری ہی تخلیق کا سب سے بڑا نقاد ہوتا ہے۔ ویسے موجودہ دور کے نقاد تو گروپ ازم کا شکار نظر آتے ہیں اور کسی کو پروموٹ کرنے کے لیے باقاعدہ لابنگ بھی کی جاتی ہے۔ جناب مشتاق کریمی نے قاضی مشتاق احمد سے جو چبھتے ہوئے سوالات پوچھے ہیں ان کے جوابات پڑھ کر مزہ بھی آیا اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ سچ پوچھیے تو کچھ تشنگی کا احساس بھی ہوا۔ علاقہ خاندیش کے اس مقبول قلمکار کے انٹرویو کی اشاعت پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

❖ **ارتکاز صابر**: معاون مدرس، اقرا شاہین اردو ہائی اسکول مہرون، جلگاؤں (مہاراشٹر)

'ماہنامہ اردو دنیا' بابت ستمبر 2018 حسب سابق اپنی تمام تر علمی ادبی رنگارنگ مشمولات سے مزین نظر نواز ہوا۔ اس کے مستقل کالموں میں کالم انٹرویو مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ ممتاز و معروف فن کاروں کے انٹرویوز پڑھ کر قارئین گوناگوں فنی تجربات سے مستفیض ہو رہے ہیں نیز ارباب ہنر کی پزیرائی کا حق بھی ادا ہو رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اردو دنیا کا یہ سلسلہ لائق تحسین ہے۔ اس ماہ معروف افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد صاحب سے مشتاق کریمی صاحب کا مصاحبہ خاصے کی چیز ہے۔ چونکہ وہ صحافی نیز افسانہ نگار بھی ہیں، موصوف نے قاضی صاحب سے پر مغز سوالات کر کے فکر و فن کے بیش بہا گوہر قارئین کی نذر کیے ہیں۔ چنانچہ اس انٹرویو کو ایک مثالی انٹرویو کہا جا سکتا ہے۔ انٹرویو کے ضمن میں ناچیز کی رائے ہے کہ فن کار کے انٹرویو کے ساتھ اگر اس کی شاہکار تخلیق بھی شائع کی جائے تو قارئین کے لیے مزید دلچسپی کا باعث ہوگا۔ بہر کیف اردو دنیا زبان و ادب کی بحسن و خوبی تاریخ ساز خدمات انجام دے رہا ہے۔

❖ **سلیم خان**: ملت نگر، فیض پور، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

ستمبر 2018 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ زیر نظر شمارہ کے اداریہ 'ہماری بات' میں عالمی ادبیات کے تراجم کے اردو زبان میں منتقل ہونے کی بات کہی ہے جو واقعی اردو زبان کے لیے خوش آئند ہے اردو کا دامن وسیع ہو رہا ہے
مشمولات میں قاضی مشتاق احمد کا انٹرویو 'صفی اورنگ آبادی کی رباعی گوئی' میرے رشک قمر' اور معاشرے میں استاد کا کردار' قابل ذکر ہیں۔ مشتاق کریمی نے قاضی صاحب سے انٹرویو کے ذریعے خاندیش اور اس کے ایک فنکار سے متعارف کروایا ہے۔ مشتاق صاحب نے صحیح کہا ہے کہ قاری ہی تخلیق کا سب سے بڑا نقاد ہوتا ہے۔ صفی اورنگ آبادی کی رباعی گوئی پر سیر حاصل جائزہ پیش کیا ہے۔ 'میرے رشک قمر' فنا بلند شہری کی مشہور غزل ہے۔ مکمل غزل کے ساتھ ان کی صوفیانہ شاعری میں زبان کی پختگی و دلکشی لطیف، شائستہ انداز بیان کی خوبیوں کے ساتھ تعارف پیش کیا ہے۔ اسی طرح یوم اساتذہ کے موقع پر معاشرے میں استاد کا کردار قابل ذکر مضمون ہے مصنف نے آج کے حالات کے مد نظر اساتذہ کی ذمہ داریوں 'تدریس سے مراد' اور روایتی تدریسی طریقوں کی خامیوں اور مسائل کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ امریکہ اور ملیشیا کی تعلیمی و فلاحی تنظیم کا جائزہ پیش کر کے اساتذہ کی فکری ارتقا اور اصلاحی تجدید کی ضرورت پر زور دیا اور بہت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ 'تبصرہ و تعارف' کتاب اور مصنف کا تعارف کروانے کا اہم ذریعہ ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب کی مغرب میں تنقید کی روایت ڈاکٹر مدحت الاختر کی کتاب انسلاکات تحقیق اور نظیری نیشاپوری حیات و شاعر، مجتبیٰ حسین کی ابتدائی تین کتابیں، کا تعارف و تبصرہ پر از معلومات ہے۔ قاری کو مصنف اور کتاب کے بارے میں بیش بہا ذخیرہ فراہم ہوتا ہے ساتھ ہی خبروں کی دنیا 'اردو دنیا' کو قریب تر لانے کی کوشش ہے۔

❖ **ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان**: روبرو مولانا آزاد کالج نیشنل کالونی، پلاٹ نمبر 34، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ہر ماہ کی طرح ستمبر 2018 کا رسالہ بھی میری نظروں سے گزرا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح نئی معلومات کے ساتھ مطالعہ میں آیا۔ دوران مطالعہ یہ علم بھی ہوا کہ اس رسالہ 'اردو دنیا' میں میرا لکھا ہوا تبصرہ بعنوان 'صحبت پیر ہندی' (ناول) شائع ہوا ہے۔ اسے پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔

❖ **سہیم الدین خلیل الدین صدیقی**: ایم فل ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ پڑھا جیسے ہی میں نے اپنا خط دیکھا میری خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ اردو دنیا کے ہر شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ آپ کا اداریہ بہت معلوماتی ہے جب بھی آپ کا اداریہ پڑھتی ہوں بہت متاثر ہوتی ہوں۔ قومی کونسل اردو کی خدمات کے لیے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے اور اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے جی جان سے محنت کر رہا ہے۔ اس شمارے میں سبھی مضامین، تبصرے، انٹرویو اور خبریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مشتاق کریمی کا قاضی مشتاق احمد سے لیا گیا انٹرویو بہت معلوماتی ہے قاضی صاحب نے بہت بیباکی سے جوابات دیے ہیں اور ان کے اس جملے نے بہت متاثر کیا جب قاضی صاحب نے کہا میرے اصلی نقاد تو تخلیقات کو پڑھنے والے ہیں اور ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے قاضی صاحب کا ایک اور جواب بہت اچھا لگا انھوں نے کہا کہ جو لوگ زیادہ چھپ نہیں پاتے وہ لوگ ہی برائیاں کرتے ہیں۔ غضنفر صاحب کا اونکار ناتھ کول صاحب پر بہت اچھا مضمون ہے انھوں نے ان کی شخصیات اور ان کے کردار کو اس مضمون میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اسلم جمشید پوری، داؤد احمد، رؤف خیر، شمع اختر کاظمی کے مضامین بہت خوب ہیں۔ تبصروں میں عبدالحی پیام انصاری کی کتاب پر تبصرہ بہت پسند آیا اور اردو دنیا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نئے لکھنے والوں اور ریسرچ سکالروں کو چھپنے کا موقع ملتا ہے اور نئے لکھنے والوں کو بہت احترام سے چھاپا جاتا ہے اور اردو دنیا میں صرف ادب سے متعلق ہی نہیں بلکہ کمپیوٹر، سائنس اور صحت سے متعلق اچھے مضامین ہوتے ہیں۔

❖ **استوتی اگروال**: اگروال جیولرس، سرونج، مدھیہ پردیش

انٹرویو

ترجمہ ایک وجدانی عمل ہے

قطب سرشار

محبوب خان اصغر

ڈاکٹر قطب سرشار حیدرآباد دکن کے ادبی منظرنامے میں گزشتہ پانچ دھائیوں پرمحیط زبان وادب کی بیش بہاخدمات کے حوالے سے ایک روشن نام ہے۔ ان کی پذیرائی دکن سے شمال تک ادبی حلقوں میں یکساں ہے۔ادبی دنیا ان کی تخلیقات کے حوالے سے جتنا کچھ جانتی ہے اس سے اورآگے بھی ہم نے مصاحبہ کے وسیلے سے ان سے قریب ترھونے اوران کے ذھن کو کریدنے کی سعی کی ہے تاکہ ان کی زبان سے علم وحکمت کے مزید انکشافات اگلوالیے جائیں۔ (محبوب خان اصغر)

محبوب خان اصغر: اپنا تعارف کروائیں؟

قطب سرشار: میرا نام سید قطب الدین ہے اور قلمی نام قطب سرشار ہے۔ میں 15 رمئی 1945 کو فلک نما حیدرآباد دکن میں پیدا ہوا اور میرے تخلیقی سفر کی شروعات 1963 سے ہوئی ہے۔ اس سفر کے دوران میں نے کیا کھویا اور کیا پایا، یہ کہانی بڑی طویل ہے۔

م خ ا: میں روایت شکنی کرتے ہوئے آغاز میں یہ جاننا چاہوں گا کہ محبوب نگر (تلنگانہ) میں ماضی میں ادب کی رفتار کیا رہی ہے اور ادب کے حوالے سے اس علاقہ کے معروف ادیب وشاعر کے نام بتائیں؟

قطب سرشار: محبوب نگر سابقہ ریاست حیدرآباد دکن اور موجود ریاست تلنگانہ کا ایک ضلع ہے۔ یہ زبان وادب کے تخلیقی وتالیفی سفر کا نمائندہ رہا ہے۔ یہاں کے مسلمان اور برہمن نژاد ادیبوں اور شاعروں نے بڑی گراں قدر ادبی تاریخ بنائی ہے۔ عالم پور ضلع محبوب نگر کا ایک تعلقہ ہوا کرتا تھا۔ اس مقام کے برہمن شاعروادیب اور ترجمہ نگار جذب عالم پوری جن کا پورا نام رگھویندر راؤ تھا۔ پیشہ وکالت تھا۔ رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی تھی۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے عمرخیام اور حافظ شیرازی کی رباعیات کے ترجمے کیے۔ ان دنوں دہلی اسٹار پاکٹ بکس نامی اشاعتی ادارہ پاکٹ سائز کی کتابیں چھاپا کرتا تھا۔ ہر کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ ہوتی۔ اس رعایت سے جذب عالم پوری کے تراجم کی پورے ملک میں رسائی ہوئی۔ جذب عالم پوری خود رباعی گو تھے اور رباعیات کے مترجم بھی، اس حوالے سے انھیں خیام آندھرا کا خطاب ملا۔ آصف سابع میر عثمان علی خان بہادر کے دور حکومت میں محبوب نگر کے بجائے ناگرکرنول ضلع ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں ضلع ناگرکرنول اور اس کا تعلقہ کوڑنگل ادبی سرگرمیوں اور ماحول کے لیے مشہور تھے۔ ناگرکرنول میں حکیم قاری شیخ منصور علی منور صف اوّل کے وکیل، عالم دین اور بیک وقت سہ لسانی شاعر تھے۔ عربی، فارسی اور اُردو زبانوں میں انھوں نے بڑی معرکتہ الآرا غزلیں کہیں۔ بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے دہے کے دوران تعلقہ کوڑنگل کو ادبی ماحول کے حوالے سے دور دور تک جانا جاتا تھا جہاں بڑی تعداد میں بزرگ اور نوجوان شعرا ہوئے ہیں۔ یہاں بچے بچے کے شعری ذوق کا عالم یہ تھا کہ ہر کسی کو سیکڑوں اشعار ازبر تھے اور برموقع اشعار سنانے میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ کوڑنگل میں ایسی ادبی وعلمی فضا بنانے میں اس وقت کے بزرگ شاعر حضرت اسماعیل شریف ازل کا کردار ادبی تاریخ کا ایک حصہ تھا۔ ان کے بعد کی نسل کے شاعروں میں نور آفاقی (عبدالجبار) رحمت کوثر (رحمت خان)، حفیظ، کبیر عبدالمنان رہبر، حضرت اسماعیل شریف کے علاوہ پنڈت دامودھر پنت ذکی شامل تھے۔ جنھوں نے رسالت مآبؐ کی مدح میں بڑی اہم نظمیں کہی ہیں۔ اس حوالے سے انھیں اردو حلقوں

میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ادھر ناگرکرنول میں 1960 کے بعد شاعروں میں ڈاکٹر قطب سرشار، خواجہ معین الدین سوزاں، یوسف ندیم اور افسانہ نگار صادق حسین ادبی منظرنامے کے معتبر چہرے ہوا کرتے تھے۔ ضلع محبوب نگر کے مستقر پر پروفیسر مقبول فاروقی، پروفیسر عثمان غازی، (علیگ)، شکیل فاروقی، سلیم اقبال (افسانہ نگار)، جامی وجودی، ظہیر ناصری کی شبیہیں نمایاں نظر آتی تھیں۔

م خ ا: ادبی فن پارے میں کون سے تخلیقی عوامل ہوتے ہیں جو لکھنے پر اُکساتے ہیں؟

قطب سرشار: تخلیقی محرکات کے اسباب اور پس منظر ہوتے ہیں۔ کسی شعر یا نثری تخلیق کے محرکات تخلیق کار کی زندگی کے خارجی وداخلی منفی ومثبت تعاملات ذہن پر مرتسم ارتسامات معلومات ومطالعہ اور تدبر سے کشیدہ ہوتی ہیں۔ سارا اردو ادب عالیہ علمی، تحقیقی، تنقیدی، تخلیقی وفنی اظہار ہے جو قاری کی علمی لیاقت بڑھاتا ہے لسانی تربیت کرتا ہے وہ ذہنی تلذذ کا سبب بھی ہوتا ہے۔ حالی، شبلی، سرسید احمد خان، غالب واقبال، امجد حیدرآبادی اور اسرار احمد (ابن صفی) کے علاوہ تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دینے اور علم صحیح سے استفادہ اور حکیمانہ افکار کو اخذ کرنے کے لیے قرآن وحدیث کے صحت مند وحکیمانہ انکشافات جامع ومتوازن طرز حیات سے اکتساب کرتے ہوئے انسانی معاشرے کو امن وسلامتی کی معنویت سے معمور کرنے کی مثالیں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ شعر وادب کے تخلیقی عمل کا مطلب اگر لفظوں کی بازی گری اور کہانیوں میں معاشرہ کی عکاسی کرنا ہے تو برسوں سے تحریر کردہ ادب معاشرتی زندگی میں اثرانداز ہونے میں کس قدر کامیاب ہوسکا؟ افسانوں کی سماجی ونفسیاتی ترجمانی پرمبنی کہانیاں بڑے پُراثرانداز میں لکھی جارہی ہیں اس کے باوجود مجروح انسانیت کی سسکیوں میں کوئی مثبت تغیر کیوں نہیں آسکا ہے۔ ایسی تحریروں کا کیا فائدہ جن میں صراط مستقیم کی جانب کسی کو مائل کرنے کا ادارک نہیں پایا جاتا۔

م خ ا: فکری اعتبار سے آپ کی شاعری اور نثر کی جڑیں کافی گہری معلوم ہوتی ہیں باوجود اس کے آپ شہرت سے گریزاں کیوں ہیں؟

قطب سرشار: میں نہ ہی شہرت سے گریزاں ہوں اور نہ ہی شہرت کو اپنی نفسیاتی تسکین کا باعث بنا رکھا ہے۔ اپنے افکار کو اہل نظر تک پہنچانا میرا مقصد ہے سو میں اسے نبھا رہا ہوں۔ اپنا ڈھول پیٹنا اور شب وروز تشہیر کے ذریعہ مشاہیر ادب کی صفوں میں خود کو جاگر کرنا مجھے پسند نہیں ہے۔ ویسے دانشور اپنے افکار کی تشہیر نہیں ترسیل کو روا سمجھتا ہے۔ شہرت کی ہوس زودنویسی پر مائل کرتی ہے۔

ساری توجہات فکروتدبر پر کم اور زیادہ سے زیادہ اپنی پہچان بنانے پر مرکوز ہوجاتی ہے۔ ادب اظہارِ حکمت اور حکمت اظہار کی نمائندہ ہوتی ہے۔ شہرت پسندی حکمتوں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔ آپ نے استدلال کیا کہ میرے شعری ونثری ادب کی جڑیں گہرائی ناپنے لگی ہیں۔ اپنے فن کے تجزیہ سے عرض کرتا ہوں کہ شعر وادب سے میرا رشتہ کوئی ورثہ ہے اور نہ ہی کسی قدآور شاعر یا ادیب سے خود کو منسوب کرکے اپنا قد بڑھانے پر یقین رکھتا ہوں۔ ذات وکائنات اور کتابوں کے عمیق مطالعے سے

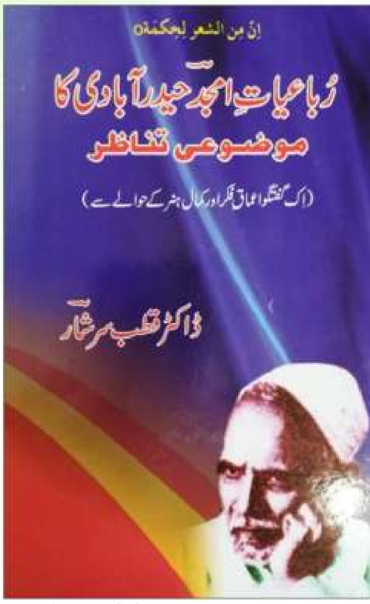

میرے شب وروز عبارت ہیں۔ جب کبھی کچھ لکھنے کی تحریک ہوتی ہے کوئی انجانی طاقت مجھے لکھنے پر مائل کرتی ہے تو لکھنے لگتا ہوں۔ ورنہ میں تو ایک معمولی اور خالی الذہن انسان ہوں کبھی کبھی عام قاری کی طرح خود اپنی تخلیقات پڑھنے لگتا ہوں تو یقین نہیں کہ میں اتنا کچھ لکھ پایا ہوں۔ زندگی ہو کہ تخلیقی عمل، ساری چیزوں کا انسان صرف امین ہے وہ مالک یا خالق نہیں ہوسکتا۔

م خ ا: کیا کبھی آپ کے اندر یہ خواہش ابھری کہ آپ کے فن کو سراہا جائے؟

قطب سرشار: تخلیق کار تعریف وتوصیف کے لیے نہیں بلکہ اپنے افکار کے ذریعہ اگر قارئین کے ذہن کی کھڑکیاں کھولنا چاہتا ہے۔ ایسا نہیں ہو پایا تو اس کا تخلیقی عمل فنی سطح پر کامیاب سہی معنوی اعتبار سے بے فیض ہے۔ میں نے اپنے افکار کی گہرائی اور گیرائی کو ناپنے کے لیے تنقید نگار کی توجہ نہیں چاہی کہ میرا فکری ماخذ قرآن وحدیث ہے۔

م خ ا: نئی نسل کی ادب سے دوری پر اظہار خیال فرمائیں۔

قطب سرشار: ادبی ذوق توارث ہے، ماحول کی دین ہے اور فطری میلان بھی۔ نئی نسل کی ادب سے بے نیازی اُردو زبان سے ناواقفیت اور گھر کے غیر ادبی وغیر علمی ماحول کے سبب بھی ہوسکتی ہے۔ وہ طبقہ جس کی مادری زبان اُردو ہے وہ اردو کی معاشی طمانیت سے مایوس ہوکر اپنی زبان سے منصوبہ بند طور پر بے علاقہ ہونے لگا ہے۔ اردو زبان وادب کو معاشی مستقبل سے جوڑ کر غیر ضروری سمجھ لینا یقیناً غیر منطقی اور نادانی کا سبب ہے۔ نئی نسل کے اردو زبان ادب سے بے علاقہ ہونے کے باعث اردو زبان وادب کا حلقہ بھی بتدریج تنگ ہونے لگا ہے۔ جب کوئی ادیب یا شاعر بڑے فخر سے کہتا ہے کہ میں نے اتنی ساری کتابیں لکھی ہیں تو نئی نسل کہتی ہے ٹھیک لیکن آپ ان کتابوں کا کیا کریں گے؟

م خ ا: کیا کسی فن پارے کی تفہیم وترسیل کے لیے وسیلہ تنقید ہوسکتی ہے؟

قطب سرشار: تفہیم وترسیل کے مرحلے میں تنقید معاون رول ادا کرتی ہے۔ کسی فن پارے کے مطالعہ کے دوران قاری کے ذہن میں تخلیق کے جو معنوی نقوش ابھرآتے ہیں۔ اس کا انحصار فن پارے کے وسیلہ اظہار یعنی کمال عرض ہنر پر ہوتا ہے ساتھ ہی قاری کی اپنی علمیت ذوق مطالعہ اور قوت فہم پر بھی تفہیم وترسیل انحصار کرتی ہے۔ تنقید نگار کسی فن پارے کو اپنی نظر، فہم اور معیارات کے پیش نظر تجرباتی عمل انجام دیتا ہے تو فن پارے کے گوناگوں معنوی ابعاد کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ قاری اپنی صحت فہم کے لیے مطالعہ کے ساتھ ساتھ حاصل مطالعہ کے حوالے سے تنقیدی کتابوں کا مطالعہ بھی روا رکھے۔

م خ ا: کیا آپ کی دانست میں مطالعہ کے لیے کتابوں کا انتخاب اہمیت رکھتا ہے؟

قطب سرشار: مطالعہ کے لیے کتابوں کا انتخاب ہر شخص اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق کرتا ہے۔ تمیز انتخاب، ریاضت مطالعہ کے بہت دنوں بعد پیدا ہوتی ہے تاہم عام قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب کے عالموں سے مشورہ کرے۔ ویسے بھی آج کا عام قاری کہیں گم ہوکر رہ گیا ہے۔ آج کل روزمرہ زندگی کا نظام العمل (شیڈول) اس قدر تنگ ہوگیا ہے کہ کوئی مطالعہ کے لیے وقت نکال نہیں پاتا۔ ٹی وی اور اسمارٹ فون نے معاشرتی زندگی کو حد درجہ الجھائے رکھا ہے۔ مطالعہ وہ لوگ کرتے ہیں جن کا کہیں نہ کہیں ادب سے علاقہ ہے یا پھر جامعات کے ریسرچ اسکالر جن کے لیے مطالعہ ناگزیر ہوتا ہے۔

م خ ا: آپ اپنے ہم عصروں کے درمیان منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے شعری محافل سے خود کو دور کیوں رکھا ہے؟

قطب سرشار: عصری ادب کے منظر نامے میں اپنے معاصرین کی صفوں کے درمیان میں کہاں کھڑا ہوں پتہ نہیں موازنے کی سوچوں میں حسد کے جراثیم پلتے ہیں۔ اپنی سوچوں کو غیر ضروری موضوعات میں الجھائے رکھنے سے ذہنی توانائی گھٹنے لگتی ہے۔ اکیس ویں صدی کے دوسرے دہے کے دوران تنقید نگاری کا میلان میرے اندر بتدریج بڑھنے لگا تو میری مصروفیت اور انہماک بھی بڑھ گیا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد میری نجی مصروفیت اور تصنیفی سرگرمیاں کم نہیں ہوئیں۔ ایسے میں ادبی محافل میں شرکت کے لیے وقت بچتا نہیں تاہم لکھنے پڑھنے کے کام سے تھوڑا سا وقت نکال کر جاؤں بھی تو کہاں وہاں جہاں دیوان خانوں میں چھ سات شاعر اکٹھا ہو کر آپس میں کلام سنالیا کرتے ہیں جہاں خلوص اور قدر شناسی کا فقدان ہے ہر شخص خود اپنا خدا ہے۔ خود اپنا پی آر او (PRO) ہے۔ ایسے ماحول میں روح کو اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ بس دیدہ ریزی اور عرق ریزی کو اپنا معمول بنا کر گھر بیٹھے رہو "ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی را"۔

م خ ا: اپنے خاندانی پس منظر بتانے کی زحمت گوارہ کریں۔

قطب سرشار: میرے والد نے بتایا تھا کہ میرے دادا میر عبدالقادر تعلقہ امرآباد (ضلع محبوب نگر ریاست حیدرآباد دکن) کے قاضی اور خطیب ہوا کرتے تھے۔ نانا کا تعلقہ کلواکرتی ضلع محبوب نگر سے تھا وہ بھی اپنے گاؤں کے قاضی اور خطیب تھے۔ لہٰذا نجیب الطرفین ہوا۔ میرے والد سید محبوب علی ناگر کرنول ٹپہ خانے پر اول منشی تھے۔ میرے بچپن اور عنفوان شباب کے دن ناگر کرنول، جو سابق میں ضلع کا صدر مقام ہوا کرتا، میں گزرے۔ والدہ سیدہ نورانی بھی شادی سے پہلے میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پڑھی لکھی نہیں تھیں جہاں دیدہ ضرور تھیں۔ ان کو میرے علاوہ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ میری ابتدائی تعلیم میٹرک تک رہی ناگر کرنول میں علی گڑھ کا ادیب کامل امتحان کامیاب کرنے کے بعد میرا عارضی تقرر کلواکرتی پر 1970 میں بہ حیثیت اردو پنڈت ہوا۔ اس تقرر سے پہلے 1969 میں میری شادی ایک سادات گھرانے کی لڑکی سیدہ اقبال بیگم سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو لڑکے سید محی الدین سہیل، سید امتیاز الدین فضیل، سیدہ فاطمہ بتول، سیدہ سعدیہ نصرت، سیدہ اعزاز طیبہ، سیدہ آمنہ تمکین اور سیدہ سلیمہ تحسین ہوئے۔

م خ ا: اپنا تعلیمی پس منظر بتائیں؟

قطب سرشار: ابتدائی تعلیم ذریعہ اردو کے ساتھ ساتویں درجے تک رہی اس کے بعد اگلے درجوں میں اردو میڈیم نہ ہونے کی وجہ سے تلگو میڈیم سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ کسی وجہ سے میٹرک کا امتحان نہیں لکھ پایا۔ چند دنوں بعد جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب کامل اور جامعہ عثمانیہ سے انٹرنس کے امتحانات کامیاب کیے۔ اس طرح بتدریج ڈپ اوال، بی اوال اور بی اے جامعہ عثمانیہ کیا اور 1979 میں جامعہ عثمانیہ ہی سے ایم اے کا امتحان کامیاب کیا۔ میٹرک کی تعلیم ادھوری چھوڑنے کے بعد سارے امتحانات فاصلاتی طرز پر کامیاب کیے۔ 2002 میں دہلی کے نامور ادیب محقق و نقاد ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمات پر پی ایچ ڈی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری ریاست آندھرا پردیش کے گورنر جناب سرجیت سنگھ برنالا کے ہاتھوں تفویض ہوئی۔ میرے مقالے کی نگراں جامعہ عثمانیہ کی سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ تھیں۔

م خ ا: عصری ٹکنالوجی کے اس دور میں اردو کا مستقبل تابناک ہے یا تاریک؟

قطب سرشار: زبان کا مستقبل انحصار کرتا ہے زبان کے بولنے لکھنے پڑھنے والوں پر۔ عصری ٹکنالوجی، وسائل کی فہرست میں سب سے زیادہ موثر اور توانا وسیلہ ہے۔ اہل اردو جہاں زبان و ادب کی ترویج سے رفتہ رفتہ بے نیاز و بیزار ہوئے جا رہے ہیں۔ ایسی عصری ٹکنالوجی سے اُردو کیسے مستفید ہوسکتی ہے۔ جس قدر عصری ٹکنالوجی سے استفادہ ہو رہا ہے وہ محدود ہے۔ اس لیے خوشی بھی ہوتی ہے اور مایوسی بھی اس لیے کہ اہل اُردو زبان و ادب سے بتدریج بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔

م خ ا: آپ کا تعلق صنف شاعری سے تو ہے ہی۔ کیا فکشن سے بھی آپ کا ربط رہا؟

قطب سرشار: میرا زیادہ تر میلان شاعری کی جانب رہا ہے۔ شاید نویں دہے میں دو تین کہانیاں لکھی تھیں جو رسائل میں شائع ہوئیں۔ کسی موقع پر نامور اسکالر ڈاکٹر آمنہ آفرین (حیدرآباد) نے بتایا کہ انھوں نے ایم فل کے مقالے میں میری کہانیوں کے حوالے درج کیے ہیں۔

م خ ا: اپنے جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کو وسیلہ اظہار کیوں بنایا؟

قطب سرشار: میرا شعری اظہار ذوق انتخاب نہیں، فطری میلان ہے۔ میں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات میں شاعری کے علاوہ ناول، افسانے اور داستانیں بھی پڑھی ہیں۔ فکشن میرے ذہن کو تھکا دیتا تھا جب کوئی غزل نظر سے گذر جاتی یا سماعت کو چھو جاتی تو میرے اندر

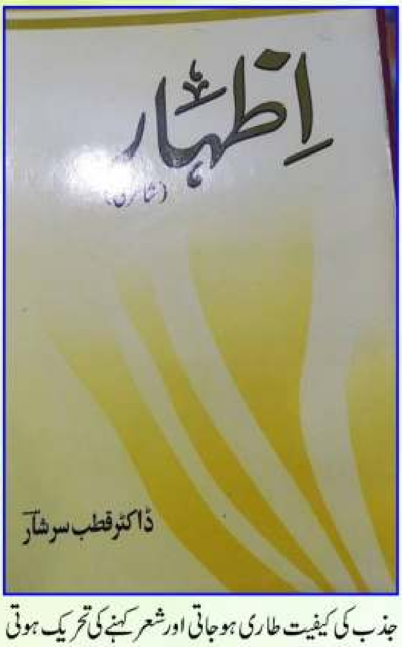

جذب کی کیفیت طاری ہو جاتی اور شعر کہنے کی تحریک ہوتی اور میں لکھنے بیٹھ جاتا۔

م خ ا: آپ نے پہلی بار شعر کب کہا تھا؟

قطب سرشار: یہ بتانے کے لیے مجھے پچاس برس پیچھے کی طرف دیکھنا پڑے گا اور میری یادداشت اتنی توانا نہیں ہے کہ نصف صدی کے کسی واقعہ کو دہرا سکوں۔

م خ ا: آپ نے امجد حیدرآبادی اور اقبالؒ کی شاعری کے حوالے سے کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان دونوں کی جانب کیوں کر رجوع ہوئے؟

قطب سرشار: میں نے اس سے پہلے بھی اور بھی شعراء اور ادبا کے حوالے سے تجزیاتی مقالے لکھے ہیں۔ مثلاً علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، جذب عالم پوری کی ترجمہ نگاری اور دیگر بہت سارے شاعروں کی شاعری کے حوالے سے لکھا ہے لیکن ان کے کلام کی معنویت مجھے بے فیض لگی البتہ حرف و ہنر کی مساعی میں شعرانا کام نہیں لگتے لیکن مجرد کمال عرض ہنر سے معاشرے میں اخلاقی اور تہذیبی سطحوں پر تغیر پذیری کے امکانات کو یقینی بنایا نہیں جاسکتا۔ اقبالؒ اور امجد حیدرآبادی کی شاعری کی معنویت انھیں تفنن طبع کے لیے شعر کہنے والوں کی صفوں میں شامل نہیں کرتی۔ دونوں کی شاعری سچائیوں کی ان سمتوں کی جانب مائل کرتی ہے جس سے ملت آدم کی ذہنی تربیت ہو جاتی ہے اور صراط مستقیم کی جانب توجہات مبذول ہونے لگتی ہیں۔ اقبال اور امجد حیدرآبادی کی تمام شاعری نے مجھے شدت کے ساتھ تحریک دی کہ مجھے ان کے افکار کو موضوع سخن بنانا چاہیے۔

م خ ا: میں چاہتا ہوں کہ آپ موجودہ ادبی منظر نامہ پر اظہار خیال فرمائیں۔

قطب سرشار: عصر حاضر کے ادیبوں،شاعروں کے فکری زاویے اور کمال فن بظاہر ارتقائے فن کی رفعتوں کوچھونے لگے ہیں۔لیکن ان کی معنوی اساس کوٹٹولیں تو کچھ بجھائی نہیں دیتا۔شعرا کا یقین غم ذات اور غم کائنات اور ذہنی تلذذ پر گزشتہ کی طرح برقرار رہے۔اور فکشن نگار معاشرتی زندگی کی عکس بندی اور کرداروں کی نفسیاتی وجذباتی ترجمانی کا رجحان نقادان فن سے منوانے میں لگے ہوئے ہیں۔ان کہانیوں میں معاشرتی تلخیوں گندگیوں بے قاعدگیوں کی عکاسی بالآخر کہاں جاکے رُکے گی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بتائے کہ ڈھیر سارا افسانوی ادب بے سمت انسانیت پر کہاں تک اثر انداز ہوتا ہےاور آگے امکانات کیا ہیں۔شعرا کی بھاری اکثریت منقسم نظرآتی ہے۔ادبی فرقہ بندیوں نے شاعروں کوایک دوسرے کےمقابل کھڑا کردیا ہے۔افسانہ نگارتنقید نگاراور محققین انفرادی طور پر اپنا کام کیے جارہے ہیں۔شاعر ہوں کہ ادیب تشہیر پسندی ان کی تخلیقی مساعی پرمسلط ہوکر رہ گئی ہے۔خود پسندی نے ہرشاعروادیب کوتنہا کررکھا ہے۔

م خ ا: اپنی تصانیف کے نام بتائیں اوران کے موضوعات بھی۔

قطب سرشار: میرا پہلا شعری مجموعہ انفس وآفاق 1983 میں شائع ہوا۔ 1993 میں دوسری شعری تصنیف اوراق تازہ کی اشاعت عمل میں آئی۔ اور تیسرا شعری مجموعہ 'اظہار' نومبر 2007 میں شائع ہوا۔چوتھا شعری مجموعہ 'اصباح' 2014 میں شائع ہوا۔ان کے علاوہ کتابیں امعان،رباعیات امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر اور تلگوادب میں نئے رجحانات کی اشاعت عمل میں آئی۔ باقی تین اور کتابیں تلگونظموں کے ترجموں پرمبنی ہیں۔جن کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔

م خ ا: آپ نے بیشتر تلگوشاعری اورنثرپاروں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔اس حوالے سے بات کیجیے گا۔

قطب سرشار: تلگوشعری ونثری ادب پاروں کے ترجمے بہت کیے،ایک طویل فہرست ہے۔یہ تراجم وقفے وقفے سے مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔گیان پیٹھ ایوارڈ، پدم بھوشن شاعرونقاد ڈاکٹرسی نارائن ریڈی کی (70) منتخب نظموں کا ترجمہ بہتا ہوانغمہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ 2002 میں رسم اجرا انجام دی گئی اور بہتا ہوانغمہ سے پہلے ڈاکٹرسری لتا کی نظموں کا ترجمہ کتابی صورت شائع اور آخر میں ورنگل کے شاعروی آر ودیارتھی کی نظموں کا ترجمہ آسمان کالمس شائع ہوکر منظر عام پرآیا۔ان کے علاوہ میں نے تلگو کے عقبری شاعرو نقاد سرینددرشرما کی منتخب نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ان کے ایک ڈرامے اورایک کہانی کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

تعارف نامہ

نام: سیدقطب الدین، **قلمی نام:** قطب سرشار، **والد:** سیدمحبوب علی

والدہ: سیدہ نوراں بی، **شریک حیات:** سیدہ اقبال بیگم

تاریخ پیدائش: 15 مئی 1945، **تعلیمی قابلیت :** ایم اے، پی ایچ.ڈی

ملازمت: موظف صدر شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج حکومت تلنگانہ

ادبی مصروفیت: شاعری،تنقید،تبصرہ، **مطبوعہ تصانیف:** انفس وآفاق،اوراق تازہ،اظہار،اصباح (شعری مجموعے)، امعان (تنقیدی مضامین)، تلگوادب میں نئے رجحانات (تحقیق وتنقید)، رباعیات امجد حیدرآبادی کا موضوعی تناظر، اقبال اور پیغام سروش (تازہ ترین تصانیف)

زیر طبع تصانیف: ڈاکٹرخلیق انجم :شخصیت اورادبی خدمات (تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ.ڈی)، ابن صفی ایک بے مثل تخلیقی فنکار، غالب کی تخلیقی جہتیں، موضوعات قرآن کے معنوی اعماق، حضرت صوفی غلام اک مردقلندر

مطبوعہ تراجم (تلگو سے اردو): بہتا ہوانغمہ (شاعری)، از پدم بھوشن گیان پیٹھ انعام یافتہ تلگوشاعرڈاکٹرسی نارائن ریڈی، آسمان کالمس (شاعری) وی آر ودیارتھی، انحراف (شاعری) ڈاکٹرسری لتا

انعامات واعزازات: کارنامہ حیات ایوارڈ کے علاوہ تمام تصانیف کوحکومت تلنگانہ کی جانب سے انعامات سے نوازا گیا

م خ ا: نئی نسل کے شعرا میں آپ کس کا نام لینا چاہیں گے جن کی شعری صلاحیتوں پرآپ کوبھرپوراعتماد ہے؟

قطب سرشار: دکن میں نئی نسل کے وہ شعرا جن کی فنی صلاحیتوں اور تخلیقی توانائی پر مجھے اعتماد ہے ان میں سرفہرست سردارسلیم ہیں۔ ڈاکٹر اقبال خسرو قادری کڑپہ، گلبرگہ کے اکرم نقاش اور بیدر کے میر بیدری ہیں جن میں تخلیقیت متنوع زاویہ ہائے افکاراور کمال حرف وہنر کے ساتھ بھرپور توانائی پائی جاتی ہے۔تاہم ان کا فکری ماخذ کیا ہےاس سوال کا جواب مجھے پتہ نہیں۔

م خ ا: عہد حاضر کے مسائل کواکثر شعراء نے موضوع بنایا ہے کیا آج کی شاعری کا دامن وسیع نہیں ہے؟

قطب سرشار: شاعری میں عصری مسائل کوموضوع بنانے سے زخم تازہ ہوجاتا ہے اور تڑپ اٹھتا ہے۔اس سے جبری مسائل میں کمی نہیں آسکتی۔شاعری کی جھولی میں عوام الناس کی ڈھیر ساری واہ واہ پڑجاتی ہےاور تجزیہ نگاروں کے حوالے دستیاب ہوجاتے ہیں۔عصری مسائل کے علاوہ اوربھی موضوعات شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔لوگ شعر پڑھتے اور سنتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے۔ پھراس کے بعد زندگی کے روزمرہ کے مسائل کے ہجوم میں کھوجاتے ہیں۔آپ چاہیں شاعری کو جس قدر وسیع کرلیں انتشار معاشرہ روزافزوں بڑھتا ہی جائے گا۔ شاعری اگر ذہن ساز ہو اور صحیح سمتوں کی نمائندہ ہوتو انسانیت کی صحت کے لیے مفید ہوسکتی ہے۔

م خ ا: آپ کی مادری زبان اردو ہے تلگواور فارسی پردسترس رکھتے ہیں توپھر تلگوزبان سے کیسے نسبت ہوگئی؟

قطب سرشار: میری مادری زبان دکنی اردو ہے اورجس زبان میں پڑھتا لکھتا ہوں وہ بین الاقوامی سطح کی ادبی اردو ہے۔تلگومیرے معاشرے کی زبان ہے جہاں اس کے بولنےاور لکھنے پڑھنے والے بھاری اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔ اکثریت کی زبان کوسیکھنے سے سماجی رشتوں کوہموار رکھنےاور معاملات کوسہل بنانے میں مدد ملتی ہے ورنہ لسانی اجنبیت کے سبب معاشرتی زندگی میں دراڑ پیدا ہوسکتی ہے۔ان ساری باتوں سے قطع نظر تلگوزبان سے میری دلچسپی کا سبب حسب ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ میرا فطری میلان ہے۔میں نے نہ صرف یہ زبان سیکھی بلکہ تھوڑی بہت استعداد بھی حاصل کرلی جوترجمہ نگاری کے مرحلے میں میری معاون ہوا کرتی ہے۔

م خ ا: ویسے ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے کسی اورزبان کا ترجمہ اردوزبان میں کرنا یہ تجربہ آپ کوکیسا لگتا ہے؟

قطب سرشار: ترجمہ نگاری کا عمل میری فنی صلاحیت کوتسکین پہنچاتا ہےاور مہمیز بھی کرتا ہے۔میں نے جتنے بھی تراجم کیے اردوحلقوں میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ماہ نامہ شاعر ممبئی نے میرے تراجم پرایک خصوصی گوشہ بھی شائع کیا ہے۔

م خ ا: ترجمہ نگاری سے متعلق ایک اور سوال۔کسی زبان کا ترجمہ کسی اورزبان میں کیا جاتا ہےتو کیا ترجمہ نگار کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ جس زبان کا وہ ترجمہ کررہا ہےاس کی تہذیب،مزاج اورفطرت سے بھی آگہی رکھے؟

قطب سرشار: یقیناً۔اگرایسا نہ ہواتو ترجمہ ترسیل کے مرحلے میں ناکام ہوجاتا ہے۔اردوکثیرالمعنی زبان ہے۔ دکنی زبانوں کا ترجمہ اردو زبان میں کرتے ہیں

تو بہت ساری تہذیبی لسانی اور جذباتی زبان کی اصطلاحات کا ترجمہ دشوار ہوجاتا ہے۔ میں چونکہ تلگو سرزمین کا باشندہ ہوں۔ تلگو ماحول تہذیب روایتوں اور طرز فکر کی ترجمانی میں مجھے دشواری سے گذرنا نہیں پڑا جہاں مذہبی اور تہذیبی اصطلاحات درپیش ہوتی ہیں۔ انھیں جوں کا توں لکھ دیا جا کر حاشیے میں ان کا پس منظر درج کرتا ہوں۔ خصوصاً شادی بیاہ کے مرحلے میں جن روایتی اصطلاحوں کا استعمال ہوتا ہے ان کا اردو زبان میں ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انھیں ان کی صوتی ہیئت کے ساتھ ترجمہ میں شامل کرنا پڑے گا۔

م خ ا: جس تخلیق کار کی تخلیق کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے تب مترجم کو تخلیق کار کے افکار میں خود کو حلول کرلینا پڑتا ہے؟

قطب سرشار: یقیناً۔ ترجمہ بھی ایک وجدانی عمل ہے۔ ترجمہ نگاری کو تخلیق کار کے افکار میں خود کو جذب کرلینا ضروری ہوجاتا ہے۔ ورنہ ترجمہ اک سپاٹ بیانیہ سے زیادہ نہیں رہ جاتا۔ میں ترجمہ نگاری کے دوران ایسے تجربوں کا ذائقہ محسوس کرتا رہا ہوں۔

م خ ا: ترجمہ نگاری فن ہے یا تخلیقی عمل، یا اصل تخلیق کو دوسری زبان میں پیش کرنے کا عمل ہے۔ واضح کریں؟

قطب سرشار: ترجمہ نگاری کسی دوسری زبان کی تخلیق کو Reproduce کرنے جیسا عمل ہرگز نہیں ہے۔ یہ فن بھی ہے اور تخلیقی عمل بھی۔ کسی خیال کو رسم الخط کی تبدیلی کے ذریعہ دوسری زبانوں میں کماحقہ منتقل کرنا ترجمہ نگاری کے تقاضوں کے مغائر ہوتا ہے۔ ترجمہ کسی غیر زبان کے فن پارے کو ترجمے کی زبان میں سمجھنے اور سمجھانے کی ایک فنی مساعی ہے۔ ترجمہ پڑھتے ہوئے قاری کو لگے کہ وہ ترجمے کی زبان میں اصل تخلیق کی روح سے متعارف ہورہا ہے۔ ترجمے کو ہرگز Production wrtiting نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ یہ تخلیقی اور فنی جہد کاری ہے۔ ترجمہ نگاری کا عمل دراصل اس زبان کے ادبی سرمائے کو مزید متمول کرتا ہے جس زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔

م خ ا: کچھ اپنی نجی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

قطب سرشار: ہوش سنبھالتے ہی مفلسی اور تنگ دستی کے تلخ ترین تجربات کا ذائقہ چکھنے لگ گیا۔ والد صاحب کا وظیفہ اس قدر قلیل تھا کہ گزارہ مشکل ہوگیا تھا۔ یہ حالت بیسویں صدی کے چھٹے سے ساتویں دہے کے اختتام تک برقرار رہی۔ لگتا تھا زندگی اک عرصہ سزا ہے۔ رفتہ رفتہ آگہی ہوئی کہ مسائل حیات سے جیتنے کا قرینہ ملتا ہے۔ عنفوان کو پہنچے تو پڑھے لکھے بزرگوں کے ساتھ زیادہ تر وقت کٹنے لگا۔ لہو ولعب کھیل کود، دوستوں کی صحبت سے رغبت نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا کھیل کود اور مچھلی کا شکار، ایسے

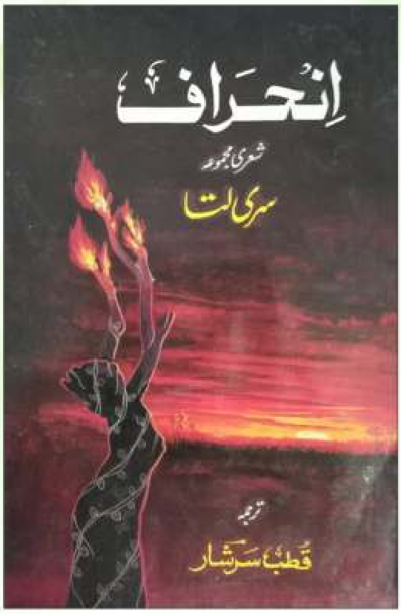

مشاغل زندگی کی لاقیمت ساعتوں کو ضائع کرتے ہیں۔ ان دنوں میرے صرف تین ہی دوست ہوا کرتے تھے۔ سراج الدین خان، صادق حسین اور شیخ عیسیٰ انھیں مجھ سے اور میری شاعری دونوں سے محبت تھی۔

م خ ا: آپ کی زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ ذکر کیجیے؟

قطب سرشار: میرے جوان بیٹے کی حادثاتی موت نے زمین سے آسمان کی طرف میری نگاہیں پھیر دی۔ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹنے میں کئی برس لگ گئے۔

م خ ا: آپ نے حمد اور نعتیں بھی کہی ہوں گی؟

قطب سرشار: کہی ہیں لیکن کم کم۔

م خ ا: شعر گوئی کے لیے جس ریاضت اور مشقت کی ضرورت ہے مبتدی شعراء اس سے دامن بچا رہے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے۔

قطب سرشار: شاعر کو شعر کے داخلی اور خارجی عوامل کا ادارک ہونا چاہیے۔ اس بات کی آگہی ضروری ہوگی کہ شعری اظہار میں فکری ماخذ کہاں سے کس سے اور کیسے حاصل ہوا ہے۔ آج کے شعرا خواہ وہ مبتدی ہوں کہ بزرگ یہ بات بہت کم کم ہی جانتے نظر آتے ہیں کہ شعر کا فکری ماخذ ہی شعر کی تعمیر و تشکیل اور قوت اظہار کی توانائی ہوتا ہے۔ بس جو کچھ سوجھا کہہ دیا۔ یا پھر مشہور شعرا کے شعری اظہار اسلوب اور بعض موضوعات کی تکرار کرنے لگے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مبتدی شعراء کی ایک بڑی اکثریت لایعنی اور بے وزن اشعار کے وسیلے سے جانی جاتی ہے۔

م خ ا: پاکستان میں شکیب اور ناصر جدید شاعری کے سرخیل رہے تو حیدرآباد میں جدید شاعری کے سرخیل کون رہے؟

قطب سرشار: حرف جدید تدریجی ارتقا کو ناپنے کا زمانی پیمانہ ہے۔ اس حوالے سے میں اپنی کتاب تلگو ادب میں نئے رجحانات کے تمہیدی کلمات کا اقتباس دہرانا چاہوں گا۔ ''ادب ہو کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو اس سے جڑا ہوا لفظ جدید ایک دلچسپ اور پرتجسس موضوع ہے۔ ہم جسے آفاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ زماں و مکاں کے لحظہ بہ لحظہ رونما ہوتے تغیرات کا دلچسپ اور حیرتناک تسلسل ہے۔ ہر گزرا ہوا لمحہ قدیم ہر لمحہ موجود جدید کہلاتا ہے اور آنے والا لمحہ اضطراب آگیں اور پراسرار سوال ہے،،۔ میری نظر میں پائیدار قدریں قید زماں کی گرفت میں نہیں آتی۔ شاعری ہو کہ کوئی بھی فن پارہ نہ قدیم ہوتا ہے نہ جدید۔ فطری اظہار اور اظہار حکمت قید زماں سے آزاد ہوتے ہیں۔ پاکستان کے شکیب اور ناصر ہوں کہ حیدرآباد کے مخدوم، جامی، شاذ یا آغا سروش محسن جلگانوی۔ ان کے ہاں مشاہدات و تجربات ذات وکائنات کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جن کی معنویت تغیرات زماں و مکاں کے ساتھ بتدریج دھندلی پڑنے لگ جائے گی۔ جب کہ غالب و اقبال اور امجد حیدرآبادی کا فکری ماخذ کسی نہیں بلکہ وہبی ہے جو قید زماں سے آزاد ہے۔

اگرچہ تم سمندر آشنا ہو
میں طوفان آشنا موج خودی ہوں
محبت اور اخوت کے لبوں پر
دعائے خیر ہوں حرف جری ہوں
انا کے خول سے باہر نکل کے دیکھو تو
ہمارے بیچ بھلا اختلاف ہے کتنا
ہمارا حال ہے معتوب امتوں کی طرح
ہمارے جھوٹ نے کتنے ہی سچ مٹا ڈالے
تم ایسی شاخ صندل ہو کہ جس سے
انا کا سانپ ایک لپٹا ہوا ہے
ستارے بانٹتا پھرتا ہے سب میں
وہ جس کے گھر میں مٹی کا دیا ہے
علم و حکمت سے بے نیازی تو
عقل و دانش کی خودکشی ہے میاں
صدیوں کی مسافت کا تھکا ماندہ زمانہ
تخریب کی منزل پہ کھڑا ہانپ رہا ہے
پھر جھوٹ کی گرفت میں قدریں سمٹ گئیں
محرومیوں نے روح سے سچائی چھین لی

■

Mahboob Khan Asghar
H.No:11-3-192 Mallapally,
Hydrabad-500001(Telangana)
Mob:9246272721
Dr Qutub Sarshar,H.No: 14-5-208/22
Krishna Nagar Colony
Mahboob Nagar - 509001 (Telangana)
Mob.: 09703771012

سوال کی اہمیت

وجیتا پرویز

تعلیم کے تعلق سے اس وقت جو چند سوالات بہت اہم ہیں ان میں کچھ سوال یہ ہے کہ کیا ہم طلبا کو معیاری تعلیم دے پا رہے ہیں؟ کیا تعلیمی ادارے میں اتنی آزادی حاصل ہے کہ طلبا مضمون سے متعلق استاد سے تبادلۂ خیال کرسکیں یا چند سوالات پوچھ سکیں؟ بطور استاد خود کو اتنا ذمے دار اور مہذب ہونے کے باوجود کیا ہم نصاب سے الگ بچوں کو اتنی آزادی فراہم کراپاتے ہیں کہ وہ سوالات پوچھ سکیں؟ طلبا اپنے اندران تمام خیالات اور متعلق معلومات سے جڑے سوالوں کو دل برداشتہ قبول کرتے ہیں اور وہی چیزیں اپنے ذہن میں بسا لیتے ہیں جو استاد اسے فراہم کراتا ہے لیکن پیچھے ایک تجسس چھوڑ جاتا ہے۔

ایک طرف جہاں دانشوران حضرات کا قول ہے کہ بچہ خود بخود علم حاصل کرتا ہے جس کے مختلف ذرائع ہیں۔ درجات میں بھی بچے کا یہی عمل ہوتا ہے جبکہ اسے صرف ایک راستہ دکھانا استاد کا اہم فریضہ ہے۔ استاد کا رسوخ بچوں پر اگر حاوی رہتا ہے تو بچے کی Creativity اس سے متاثر ہوتی ہے جس کے نتیجے سیکھنے کے اعتبار سے بہتر نہیں کہے جاسکتے۔ طلبا میں اس بات کا ہمیشہ خوف بنا رہتا ہے کہ اس کے ذریعے پوچھے گئے سوال کا خمیازہ کہیں اس کی بے عزتی یا مذاق میں تبدیل نہ ہوجائے۔

مشہور ماہر تعلیم Paulo Friere اپنی کتاب Pedagogy of The Oppresed (1968) میں اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ تعلیمی نظام ایک بینکنگ سسٹم کے مشابہ ہے جس کا مقصد طلبا میں علم کو اس طرح بھرا جاتا ہے جیسے بینک کو نوٹوں سے بھرے جاتے ہیں۔ طلبا بھی محض ایک حاصل جمع کردار کے مانند بنے ہوئے ہیں جو علم کے خزانے کو بغیر تحقیق و تنقید اور بغیر سوال و جواب کے حاصل کرتے جارہے ہیں۔ اس طرح کے نظام کو فروغ دینے اور باقی رکھنے کے پیچھے ایسے وجوہات کارفرما ہیں جس کی جڑیں بہت گہری اور حیرت ناک ہیں۔ دراصل جب طلبا کو تنقید یا سوال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی تو وہ سماج کو من وعن قبول کرلیں گے اور ویسے ہی ڈھل جائیں گے جیسا سماج ہوگا۔ Friere کے مطابق تعلیم یافتہ انسان مہذب ہوتا ہے وہ خود کو اس لائق بنا چکا ہوتا ہے کہ معاشرے کے مطابق ڈھل جائے اور یہی وہ نظریہ ہے جو باطل کو مستحکم بناتا ہے اور سماج کو وہ اپنے نظریے سے ڈھال لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا استحصال جاری رہتا ہے۔ تنقیدی رجحان سے طلبا کو واقفیت ہی نہیں کرایا جاتا جس کی وجہ سے طلبا میں Liberation یا Emancipation کا جذبہ نظر نہیں آتا۔ اس کے نظریے میں وہ آزادی نظر نہیں آتی اور نہ ہی پنپنے کی کوئی صورت ہی دکھائی دیتی ہے۔

Friere کے مطابق تعلیمی نظام کو Banking System سے مثال دی گئی ہے جہاں افکار کی صلاحیت کو معدوم کردیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں موجود نظام Status Que کو کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ رہے۔ اس طرح کی تعلیم طلبا کی تخلیقی کاوش میں رخنہ پیدا کرتی ہے اور پرانی گھسی پٹی اور روایتی انداز میں انھیں سماج میں شامل ہونے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طلبا کو جو علم درس گاہوں سے حاصل ہوتا ہے وہ انھیں مستحکم اور باروزگار بنانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے، لیکن وہ طلبا کے خیالات کی بلندی اور تنقیدی نظریات میں کمی کا احساس بھی کراتا رہتا ہے۔ اسے تنقیدی نظریے کو ترقی نہ پانے کی مخفی کوششیں بھی کہی جاسکتی ہیں۔

قومی نصابی خاکہ 2005 کے حوالے سے ایک بات اہم ہے کہ Educational Discourse میں ایک Paradigm Shift کا ذکر قابل غور ہے جس کے تحت اب طلبا مرکوز تدریسی اصول یا Child Pedagogy Centered کو عمل پیرا کرنا ضروری ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خصوصی طور پر تیار کیے گئے قومی نصابی خاکہ یا National Curriculum Framework-2005 کے مطابق اصول تدریس اب اس بات پر مبنی ہوگی کہ اکتساب (Learning) ایک سماجی عمل ہے جس میں سماج کے مختلف افراد کو اپنی ذمے داریاں سمجھنی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اس جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ طلبا اپنے معاشرتی تجربے کے ذریعے علم کی خود بخود تکمیل کرتے ہیں جس میں اس کے اساتذہ کا کردار اس طرح کے تجربے مہیا کرانے کا ہوتا ہے۔ ان سفارشوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طلبا کو مستحکم بنانے کے لیے بہت سے تدریسی انتظامات محض دستاویزوں میں کیے گئے ہیں مگر حقیقی اعتبار سے انھیں نافذ نہیں کیا جاتا۔ آج لگ بھگ

تعلیمی اداروں میں جس طرح کے نصاب اور تدریسی طریقہ وعمل کو رائج کیا جارہا ہے وہ محض اس خیال پرمبنی نظر آتے ہیں کہ تمام علم صرف کتابوں میں محفوظ ہیں اور کتابی علم کے ذریعے ہی سماج میں اپنے جگہ بنائی جاسکتی ہے۔ ایسے میں جوطلبا اپنے گردوپیش کے حالات وواقعات اور روزمرہ کے نشیب وفراز سے جو کچھ سیکھ یا سمجھ رہے ہیں وہ گویا کہ ان کے علم کا کوئی حصہ ہی نہیں ہوسکتا اور اس اعتبار سے انھیں ان واقعات پر اپنی تنقیدی نظریات پیدا کرنے کے بھی کوئی مواقع تعلیمی اداروں کے ذریعے پیدا نہیں کیے جاتے۔ اس طرح کی کوششوں کو Paulo Friere نے Transmission of Dead Knowledge قرار دیا ہے۔ (1968) جسے تعلیم فراہم کرنے کے بجائے Domestication جیسی اصطلاح کا نام دیا جاتا ہے۔ Domestication پر اپنی رائے واضح کرتے ہوئے Freire نے کہا ہے کہ یہ ایک ایسا تربیتی عمل ہے کہ جو انسان میں طلسمات اور اساطیری نظریات کو وجود میں لاکر اسے فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے جس سے انسان اپنے حالات کو بدلنے سے روکتا ہے اور انسان ان حالات کو اپنی زندگی کا اہم حصہ مان لیتا ہے۔ Freire کہتا ہے کہ انسان صحیح معنی میں تبھی سیکھتا ہے جب وہ اپنے حالاتِ زندگی کے بارے میں بیدار ہو، ساتھ ہی ان میں تبدیلی لانے کی کوشش کرے۔ اس جانب اسکول اپنی ذمے داری ہرگز نہیں اٹھا پاتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسکول کوئی سماج کا حصہ ہی نہیں ہے اور اسکول کی زندگی کا طلبا کے گھر اور معاشرتی زندگی سے کوئی رابطہ یا سروکار ہی نہیں ہے۔ اسکول اور سماج کے اس دوہرے رویے سے طلبا اپنی شخصیت کو نہیں نکھار پاتے نتیجتاً اسکول اسے جیسا سماج دکھانا چاہتا ہے وہی دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی تعلیم طلبا کو فراہم کرائی جاتی ہے جو انھیں سماج سے آسانی سے جوڑ دیتی ہے۔ بچے کے لیے چلائی جانے والی تعلیمی سرگرمیاں صرف اس لیے حرکت میں ہیں کہ بچہ کو اس طرح تیار کیا جارہا ہے کہ وہ ایک مشین کا پرزہ ہے جو مشین میں نصب (Fit) کیا جائے گا۔ بچہ جتنی جلدی اس معاشرتی مشین سے جڑ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ جبکہ NCF-2005 کے مطابق بچہ اسکول کے باہر کی زندگی یعنی گھر اور اس کے آس پاس کی چیزوں کو دیکھے اور محسوس کرے اور اسکول سے اس کو جوڑے وہ تمام باتیں جو معاشرے یا سماج میں چل رہی ہیں۔ یہ استاد اور بچے دونوں کے لیے جاننا ضروری ہے۔ بچے کو یہ محسوس ہو کہ جو باہر دیکھا گیا ہے یا سنا گیا ہے درجہ میں بھی اسی طرح کی بات ہو۔ یہیں سے سیکھنے کی شروعات ہوتی ہے اور بچہ یہیں علم الحساب، زبان، سائنس اور سماجی علوم سیکھتا ہے۔ ہماری جلد بازی ہی بچے کے اندر کمی کو ظاہر کردیتی ہے اور وہ سیکھنے سے گھبرانے لگتا ہے، اس کے اندر ایسا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ وہ سیکھ نہیں پائے گا۔ اسے لگتا ہے کہ وہ کچھ غلط نہ پوچھ بیٹھے، اور وہ سوال پوچھنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔

طلبا کا سیکھنا محض اس لیے ہرگز نہیں کہ وہ کچھ ضروری عقائد اور جانکاریاں حاصل کرلے اور سال کے اواخر میں امتحانات میں ان سب کے رٹے رٹائے جواب دے دے بلکہ سیکھنے کا مقصد یہاں وہی ہونا چاہیے کہ اس میں تجسس اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ اپنے سیکھے ہوئے علم سے معاشرتی طور پر ادراک درپیش مسائل کا ازالہ اس میں پاسکے۔ تعلیم کے کئی مقاصد درپیش ہیں، کئی محققین نے اس کے الگ الگ مفہوم تحریر کیے ہیں۔ حالانکہ ہر طالب علم جس کو مفید پاتا ہے وہی اس کے لیے نظیر بن جاتی ہے۔ حالانکہ تعلیم کا مقصد الگ الگ لوگوں کے لیے الگ الگ معنیٰ رکھتے ہیں۔ طالب علم جہاں مستفیض ہوتا ہے وہی اس کا مقصد بن جاتا ہے۔ والدین کا اپنا پیرامیٹر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اس کے خوابوں کی تکمیل کرے گا۔ ملک کے لیے بھی نوجوان اتنا ہی ضروری ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں سب سے زیادہ آبادی نوجوانوں کی ہے ایسے میں ان کی ذمے داریاں بھی زیادہ ہوجاتی ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی آئین میں تعلیم کی ضرورتوں اور ذمے داریوں کا جس حسن اسلوبی سے ذکر ملتا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ ہندوستانی آئین میں ملک کی ترقی جمہوری نظام کے ساتھ مختلف طریقۂ کار سے حل ہونے کی اور ان سب کا مقصد یا نچوڑ کہہ لیں تو طلبا کو اس لائق بناتا ہے کہ وہ ایک بہتر شہری بن سکیں اور حقوق کی پامالی یا حق تلفی پر سوال اٹھا سکیں۔ وہ آزاد ہندوستان میں آئین کی تکمیل کا بنیادی پر تو کو سمجھ سکیں۔ اس کے عمومی اور خصوصی مقاصد کو سمجھ سکیں۔

تعلیم کے ایک محقق اور دانشور جناب Professor Krishna Kumar نے بھی اپنی کتاب Education and Knowledge (1999) میں اس مدعے کو زیر بحث رکھا ہے کہ استاد کا رسوخ درجہ کے طلبا کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی طلبا میں مہارتی خصوصیات سے محرومی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ طلبا میں بیک وقت کئی طرح کے سوالات چلتے رہتے ہیں کبھی وہ اپنی تعلیمی سرگرمی کا محاسبہ کرتا ہے کبھی نگراں کے تفویض کردہ کام پر خود کو مصروف رکھتا ہے کبھی درسی کتابوں پر اس کی پریشانیاں حائل رہتی ہیں جہاں اس کی سمجھ میں کوئی نکتہ نہیں آتا، وہ متعلق نصاب سے اپنی جانکاری کو پختہ کرنے کے لیے استاد سے رائے لینا چاہتا ہے چند سوالات کرنا چاہتا ہے مگر وہ نہیں پوچھتا۔ اس کے پیچھے کئی وجوہات ہوسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ استاد کی ذمے داری ہے کہ خواہ کتنا بھی بہتر درس وتدریس کا عمل رہا ہو اس کے بعد متعلق مضمون سے سوالات پوچھنا لازم ہے جس سے طلبا کی لیاقت اور صلاحیت کے علاوہ اس کی تعلیم سے ربط وجستجو بڑھے گی اور وہ زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ طلبا کے ذریعے سوال پوچھنا یہاں اس لیے بھی ضروری قرار دیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے طلبا کو اپنی حیثیت اور وجود کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا رہے۔

طلبا میں حصولِ تعلیم کے دوران سوالات پوچھنے کی اہمیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان میں تنقیدی نظریہ فروغ پائے۔ طلبا میں جب یہ ہنر ترقی پائے گا تو اس کا نصاب کی طرف رجحان بڑھے گا اور تنقید اسے تحقیق کے لیے متحرک کرے گی۔ طلبا میں ایسے سوالات کا رجحان پیدا کرنا ضروری ہے جو سماجی پس منظر پر مبنی ہو اور ایسے سیکڑوں سوالات لے کر وہ روزانہ اپنی زندگی کو آگے لے جاتے ہیں جس کا کوئی معقول جواب انھیں نہیں ملتا اور نہ ہی کسی کو اس جانب کوئی فکر ہوتی ہے۔

■

طلبا میں حصول تعلیم کے دوران سوالات پوچھنے کی اہمیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان میں تنقیدی نظریہ فروغ پائے۔ طلبا میں جب یہ ہنرترقی پائے گا تو اس کا نصاب کی طرف رجحان بڑھے گا اور تنقید اسے تحقیق کے لیے متحرک کرے گی۔ طلبا میں ایسے سوالات کا رجحان پیدا کرنا ضروری ہے جو سماجی پس منظر پر مبنی ہو اور ایسے سیکڑوں سوالات لے کر وہ روزانہ اپنی زندگی کو آگے لے جاتے ہیں جس کا کوئی معقول جواب انہیں نہیں ملتا اور نہ ہی کسی کو اس جانب کوئی فکر ہوتی ہے۔

Vijayata Perwez
Asst. Prof., College of Teacher Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032 (Telangana)

اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

انجم پروین

دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کی طرح اردو بھی ایک ہمہ جہت زبان ہے۔ یہ نہ صرف ہندوستانی تہذیب کی سب سے پرکشش علامت اور ادبی اظہار کا عظیم الشان حوالہ ہے بلکہ ایک موثر ذریعۂ تعلیم بھی ہے۔اس پہ کسی ایک مذہب اور قوم وملت یا کسی ایک خطے کی اجارہ داری نہیں، بلکہ یہ ایک بین الاقوامی ترسیل کا ذریعہ اور سیکولر مزاج کی حامل زبان ہے۔اس کی شیرینی کے باعث اس کی مقبولیت کا درجہ و دائرہ روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اس نے نہ صرف برصغیر ہند و پاک کی زبانوں کے درمیان بلکہ عالمی زبانوں میں ایک ممتاز ومنفرد حیثیت حاصل کر لی ہے،جس کے سبب اس کی حیثیت عالمی نوعیت اختیار کر گئی ہے۔ بنگلہ دیش، نیپال، افغانستان، ماریشس، افریقہ، یوروپ، آسٹریلیا، امریکہ، کناڈا اور خلیجی ممالک وغیرہ میں یہ ادبی، علمی اور ترسیلی زبان کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ ایک اور خوبی اس کے ساتھ مختص ہے کہ اس میں ایسی لوچ اور نرمی ہے جو اسے ہر رنگ میں ڈھال دیتی ہے۔اردو زبان کی نشو ونما کے پس منظر کے طور پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پر محیط علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی اور تاریخی سرمایہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو نے مختلف نہ صرف یہ کہ انداز اختیار کیے بلکہ کثرت میں وحدت کے تصور کی نمائندہ علامت بھی بنی۔ اس زبان کے تعلق سے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند، نظر نہیں چرا سکتا، اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی، ایک اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں بنایا اور سنوارا ہے اور شکل دی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔''

ملک وقوم کی تعمیر وترقی اور اقبال مندی میں زبان اور تعلیم کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔خود اردو زبان نے ملک کے تعلیمی مشن کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے اور آزادی کے بعد ہندوستان کی تقریباً 70 سالہ تاریخ میں ملک کے تانے بانے کو اس نے جس طرح متحد و منظم رکھا وہ صد آفریں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی سیکولر روایات کی نہ صرف ایک تابندہ علامت تسلیم کی جاتی ہے، بلکہ اسے صدیوں کی تہذیبی کمائی اور ثقافتی شناخت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ متعدد دانشوروں کا کہنا ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور ثروت مندی کا راز اس کی درس و تدریس میں مضمر ہے۔ یعنی جب تک اردو زبان کو تعلیم و تدریس اور روزگار سے وابستہ نہیں کیا جائے گا تب تک اس کی ترقی کے امکانات نہ روشن ہوں گے نہ ہی وسیع۔ عصر رواں میں اس زبان کو متعدد مسائل اور چیلینجز کا سامنا ہے۔ آج اردو کی تدریس کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہندوستان کے بیشتر اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تدریس مادری زبان، ثانوی زبان یا تیسری زبان کی حیثیت سے مندرج ہے، لیکن عمل ندارد ہے۔ملک کی وہ ریاستیں جن کا شمار اردو زبان کے مراکز کے طور پر کیا جاتا ہے، وہاں اردو میڈیم اسکولوں کا وجود یا تو خطرے میں ہے یا پھر قریب المرگ ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کا منظر نامہ بھی خوش کن معلوم نہیں ہوتا۔ تکنیکی و پیشہ وارانہ تعلیم کے میدان میں بھی اردو ذریعہ تعلیم کے ادارے کافی جدو جہد سے دوچار نظر آتے ہیں۔اردو میڈیم اسکول و کالجوں کی تعداد، ان میں اساتذہ کی صورت حال، عمارتوں اور دیگر سہولیات کی کمی نیز طلبا کے امتحانات میں کارکردگی وغیرہ کے جائزے سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ حالات بہتر نہیں ہیں۔اس قسم کے متعدد ومختلف شکوے اکثر اردو طبقے کی جانب سے کیے جاتے رہتے ہیں۔کیا اس قسم کی مایوسی و افسردگی حالات کو بہتر بنانے اور مسائل کے حل تلاش کرنے میں معاونت کر سکتی ہے؟ یا اس کے لیے کسی عملی اقدام کی ضرورت ہے؟

مذکورہ نکات و مسائل سے قطع نظر ہمیں خود متحرک اور فعال ہونے کی زیادہ ضرورت ہے۔ محض یہ کہ اردو کے حالات سازگار نہیں ہیں، اس کا رونا رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔تاہم جہاں اسی طرح کے دیگر مسائل زیر بحث ہیں، وہیں اردو کے بہتر مستقبل اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے پیش نظر

قومی وصوبائی سطح پر متعدد تعلیمی ادارے سرگرم عمل ہیں۔ جن میں کچھ سرکاری ہیں، کچھ نیم سرکاری اور متعدد غیر سرکاری اقلیتی تنظیمیں ہیں۔ مثلاً: ایس سی ای آر ٹی، این سی ای آر ٹی، این سی پی یو ایل، این آئی او ایس، سی آئی آئی ایل میسور، اگنو، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، مولانا آزاد فاؤنڈیشن، پی ٹی آئی، یو این آئی کے علاوہ سینٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف ٹیچرس جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد میں قائم ہیں، سرسید فاؤنڈیشن نئی دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، غالب اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، جامعہ اردو علی گڑھ اور اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر وغیرہ اردو کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بات پر عمل پیرا ہونے کی سخت ضرورت ہے کہ ان نجی اور سرکاری اداروں کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات سے نہ صرف واقف ہونا چاہیے بلکہ ان سے حتی المقدور مستفیض ہونے کی صورتیں بھی نکالنی چاہیے۔ نیز عوام وخواص سبھی طبقوں کو ان مواقع سے باخبر کرنے اور ان سے وابستہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

اردو زبان کے فروغ اور اشاعت کے تناظر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے بعد مانو کو ہندوستان کی ایسی یونیورسٹی ہونے کا امتیاز حاصل ہے جس کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ حالانکہ اس سے قبل 1917 میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس میں سب سے پہلے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا تجربہ کیا گیا، جو خاصا کامیاب بھی رہا۔ 1936 تک اس یونیورسٹی میں تقریباً تمام سائنسی موضوعات طبعیات، کیمیا، حیوانیات، معالجات، انجینئرنگ میں گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ کورسس نیز ریسرچ کی سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ شعبۂ قانون اور تعلیمی وتدریسی تربیت کے واسطے کورسس شروع کیے گئے تھے۔ غرض کہ جامعہ عثمانیہ 1948 تک گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر مکمل درجے تک پہنچ چکی تھی۔ اس یونیورسٹی نے مادری زبان میں اعلی تعلیم کے حصول کے لیے راہیں ہموار کردی تھیں، لیکن آزادی کے بعد کے سیاسی وسماجی حالات نے کچھ اس طرح رخ بدلا کہ یونیورسٹی سے اردو ذریعۂ تعلیم کو خارج کرنا پڑا۔ 1920 میں قائم جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بھی ذریعۂ تعلیم ایک لمبی مدت تک مادری زبان یعنی اردو ہی رہی لیکن وہاں بھی ہر آن متغیر ہوتے حالات اور انگریزی زبان کی افادیت واہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کی جگہ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا گیا۔ اردو کے فروغ کے لحاظ

جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعۂ تعلیم کی برخواستگی کے تقریباً 81سال کی طویل زمانی مدت کے بعد 1998 میں پارلیمنٹ ایکٹ کے مطابق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام نہ صرف عمل میں آیا۔ بلکہ اس کو سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ بھی دیا گیا۔ اس کے قیام کے وقت تعلیمی مقاصد سے متعلق متعدد تجاویز اور سفارشات پیش کی گئیں جن میں سے کچھ بنیادی مقاصد کا ہی تعین ہو سکا۔ مثلاً اردو زبان کا فروغ، اردو کے ذریعہ سے پیشہ ورانہ، فنی اور تکنیکی تعلیم اور تربیت فراہم کرنا، باقاعدہ اور فاصلاتی دونوں طرز تعلیم کا اہتمام بذریعۂ اردو زبان، تعلیم نسواں کی جانب خاص توجہ دینا وغیرہ شامل ہے۔

سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام خوش آئند اور مسرت خیز ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعۂ تعلیم کی برخواستگی کے تقریباً 81 سال کی طویل زمانی مدت کے بعد 1998 میں پارلیمنٹ ایکٹ کے مطابق مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام نہ صرف عمل میں آیا۔ بلکہ اس کو سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ بھی دیا گیا۔ اس کے قیام کے وقت تعلیمی مقاصد سے متعلق متعدد تجاویز اور سفارشات پیش کی گئیں جن میں سے کچھ بنیادی مقاصد کا ہی تعین ہو سکا۔ مثلاً اردو زبان کا فروغ، اردو کے ذریعہ سے پیشہ ورانہ، فنی اور تکنیکی تعلیم اور تربیت فراہم کرنا، باقاعدہ اور فاصلاتی دونوں طرز تعلیم کا اہتمام بذریعۂ اردو زبان، تعلیم نسواں کی جانب خاص توجہ دینا وغیرہ شامل ہے۔ نیز بیرونی ممالک میں اس یونیورسٹی کو اپنے مراکز قائم کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ ان مقاصد کے نفاذ کے لیے مانو نے اپنا کیمپس اساس طرز تعلیم تقریباً سات اسکولوں پر قائم کیا ہے:

1۔ اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات
2۔ اسکول برائے کامرس وبزنس مینجمنٹ
3۔ اسکول برائے صحافت وترسیل عامہ (ابلاغیات)
4۔ اسکول برائے آرٹس وسماجیات
5۔ اسکول برائے سائنس
6۔ اسکول برائے تعلیم وتربیت
7۔ اسکول برائے کمپیوٹر سائنس وانفارمیشن ٹیکنالوجی

مذکورہ بالا سات اسکولوں میں تقریباً 24 مختلف شعبہ جات شامل ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے: شعبۂ اردو، انگریزی، ہندی، ترجمہ، عربی، فارسی، مینجمنٹ، کامرس، ترسیل عامہ وصحافت، سیاسیات، نظم ونسق عامہ، سوشل ورک، تعلیمات نسواں، اسلامی مطالعات، تاریخ، معاشیات، سماجیات، ریاضی، نباتات، حیوانیات، طبیعیات، کیمیا، تعلیم وتربیت، کمپیوٹر سائنس واطلاعاتی ٹکنالوجی۔ ان میں متعدد پیشہ ورانہ پروگرامس کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ماسٹر پروگرامس کے ساتھ ساتھ اعلی تعلیم کے لیے ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح تک کی ریسرچ بھی شامل ہیں نیز سچر کمیٹی سفارشات کے تحت یونیورسٹی نے قومی سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کے فروغ کے ضمن میں تین آئی ٹی آئی اور پولی ٹیکنیک کالج حیدرآباد، بنگلور اور دربھنگہ میں قائم کیے ہیں۔ ان کالجوں میں جو کورس مہیا کیے گئے ہیں ان کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ اس طرح مولانا آزاد یونیورسٹی اردو زبان کے ذریعہ تکنیکی تعلیم کا نفاذ کرکے اپنے مقصد کی تکمیل کرنا چاہتی ہے۔ ان کالجوں کے قیام کا مقصد غالباً یہ ہے کہ بڑی تعداد میں باصلاحیت ماہرین تکنیک پیدا کیے جائیں، جو ہندوستان کے نظام ٹکنالوجی کو لامتناہی اوج وبلندی عطا کرسکیں۔ علاوہ اس کے یونیورسٹی کے ذریعہ اساتذہ کی تربیت کے پیش نظر تین ٹیچرس ٹریننگ کالجوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ ٹریننگ کالج سری نگر، دربھنگہ، اور بھوپال میں قائم کیے گئے ہیں، جن میں زیر تربیت اساتذہ کی شخصی وذہنی نشوونما کے تحت مختلف پروگرامس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

عوام میں اردو کی شہرت اور جن افراد تک اردو کی رسائی ممکن نہیں ہو پاتی تھی، ان تک اردو زبان کو پہنچانے کی غرض سے نظامت فاصلاتی تعلیم کا انعقاد کیا گیا۔ ناخواندہ لوگوں کے لیے تعلیم وتدریس کا بہتر اور معقول انتظام کرنا نظامت فاصلاتی تعلیم کا بنیادی مقصد ہے۔ تاکہ ایک بڑی تعداد میں اردو آبادی ان تعلیمی سہولیات سے فیض حاصل کرتے ہوئے تعلیم یافتہ ہو سکے۔ ملکی سطح پر اردو زبان کو فروغ دینے کی غرض سے نظامت فاصلاتی تعلیم کے زیر اہتمام یونیورسٹی نے نو علاقائی مراکز بطور معاونت دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، بنگلورو، بھوپال، رانچی، دربھنگہ اور سری نگر میں قائم کیے ہیں، جبکہ چھ ذیلی مراکز کا قیام حیدرآباد، سنبھل، لکھنؤ، نوح (میوات)، جموں اور امراوتی میں کیا گیا ہے۔ قومی سطح پر پھیلے ہوئے یونیورسٹی ان مذکورہ تمام علاقائی مراکز کے تحت 161 اسٹڈی سینٹرس 17 صوبوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں قائم ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی یونیورسٹی کے ایک امتحان کا مرکز جدہ میں قائم کیا گیا ہے۔ موجودہ وقت میں یونیورسٹی میں

پانچ پوسٹ گریجویٹ، آٹھ پی جی ڈپلومہ/سرٹیفکیٹ پروگرام فاصلاتی طرز پر جاری ہیں۔ان پروگراموں میں بی اے، بی کام،بی ایس سی (لائف سائنس و فیزیکل سائنس)، ایم اے (اردو، تاریخ، انگریزی، اسلامیات)، تعلیم،عجائبات، سیاحت،صحافت وترسیل عامہ، انگریزی تدریس میں ڈپلوما اور اردو اور انگریزی میں زبان دانی کے سرٹیفکٹ کورس وغیرہ شامل ہیں۔ان مذکورہ کورسیز میں فی الحال 40,000 طلبا فاصلاتی نظامت تعلیم کے زیرنگرانی مندرج ہیں۔یہ پروگرامس ڈی ای سی اور بی ایڈ پروگرام این سی ای ٹی سے منظورشدہ ہیں۔مانو نے اگنو کے اشتراک سے دو سالہ بی ایڈ اور ڈی ایڈ پروفیشنل کورسیز بھی شروع کر رکھے ہیں۔جو مذکورہ چھ شہروں میں فاصلاتی نظامت تعلیم کے تحت ہی کرائے جارہے ہیں۔ تاکہ اسکول میں ملازمت کرنے والے اساتذہ ان کورسیز میں داخلہ لے کر اپنی ذہنی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرسکیں اور ساتھ ہی بچوں کی شخصی و ذہنی تربیت اور نشوونما کرنے کی قابلیت پیدا کرسکیں۔فی الحال ایک لاکھ سے زائد طلبہ مختلف کورسوں کے تحت یونیورسٹی کے فاصلاتی نظامت تعلیم کے مراکز میں مندرج ہیں۔مولانا آزاد یونیورسٹی کے ذریعے اردو زبان کو دوبارہ علمی زبان کے منصب پر فائز کرنے کا مشن اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ اردو زبان کے زیادہ سے زیادہ فروغ اوراس کی ترویج و ترقی کے پیش نظر نئے نئے منصوبے اور لائحۂ عمل تیار کرنے میں مصروف عمل ہے۔

علاوہ ازیں نئی نسل کو اردو سے آشنا کرانے، ان میں اردو زبان سے جذباتی وابستگی پیدا کرنے کی غرض سے یونیورسٹی نے ماڈل اسکولس بھی قائم کیے ہیں۔جو حیدرآباد، دربھنگہ اور نوح (میوات) میں قائم کیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی، یو جی سی کی منظوری سے کئی اہم پروگرام چلا رہی ہے۔جیسے: اکیڈمک اسٹاف کالج (جو تربیتی،بازتربیتی اور پیشہ ورانہ فروغ پر مشتمل پروگرومز کراتا ہے)،مرکز برائے سیول سروس کوچنگ، اتچ کے شیروانی مرکز برائے مطالعات دکن، مرکز برائے پیشہ ورانہ فروغ اردو میڈیم اساتذہ، البیرونی مرکز برائے مطالعہ سماجی اخراج وشمولیاتی پالیسی،مرکز برائے اردو زبان،ادب وثقافت،مرکز برائے مطالعات نسواں وغیرہ اس کے دیگر اہم مراکز ہیں۔اس کے علاوہ یونیورسٹی نے یو جی سی کے منصوبہ جات کے ذریعہ تین کوچنگ سینٹر بھی کھولے ہیں۔ (1) نیٹ کوچنگ سینٹر (2) ریمیڈیل کوچنگ سینٹر برائے اقلیت (3) کوچنگ برائے سرویسز۔ان شعبوں کے قیام کی غایت یہ ہے کہ طلبا کوچنگ کے ذریعہ اعلی مقابلہ جاتی امتحانوں میں کامیابی حاصل کر کے اپنا مستقبل روشن بناسکتے ہیں۔

مولانا آزاد یونیورسٹی کسی ایک خطے یا علاقے تک محدود نہ ہو کر ملک کے دور دراز علاقوں میں کیمپس، سٹیلائٹ کیمپس اور متعدد مطالعاتی مراکز کے توسط سے اردو کے ذریعہ ہر ایک طبقے کی علمی وثقافتی ضرورتوں کی تکمیل میں بہتر کارکردگی انجام دے رہی ہے۔مثلاً یونیورسٹی کے سٹیلائٹ کیمپس کا قیام لکھنؤ میں عمل میں آیا۔یہ مرکز دوردراز کے علاقوں میں مقیم افراد کے علمی وتعلیمی تقاضوں کو پورا کرنے کی جانب گامزن ہے۔یونیورسٹی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تراجم کے ذریعے نئے علوم،تصورات، ٹیکنالوجی، نئی لفظیات اور اصطلاحات سے اردو کا دامن مزید وسیع کرنا اور ثروت مند بنانا ہے۔تاکہ لوگوں کے ذہن سے یہ مفروضہ رفع ہو سکے کہ اردو صرف شعروادب کی زبان ہے۔گوکہ اردو کی تاریخ وتہذیب سے واقفیت اور دلچسپی رکھنے والے افراد بخوبی واقف ہیں کہ اردو میں بے شمار شعری ونثری سرمایہ تو موجود ہے ہی،علاوہ ازیں تقریباً ہر موضوع اور علم پر بھی اردو میں کتابیں دستیاب ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں علمی کتابوں کی قلت ہے۔

اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اساتذہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ طلبا کی شخصیت کی ہمہ جہت اور ہمہ رخی تربیت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے استفادہ کرنے کے دوران شعوری یا غیرشعوری طور پر اردو کی تہذیب وثقافت کا درس بھی حاصل کرتے ہیں۔اور جب انھیں درس وتدریس کا موقع میسر آتا ہے تو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔بیس برس کی قلیل مدت میں مانو نے جس تیزی سے قومی و بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت قائم کی ہے اور جس طرح اردو طبقے کی ضروریات کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے،وہ یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔زمینی سطح پر اردو کے لیے کی جانے والی ان کوششوں کے نتائج بھی سامنے آتے نظر آنے لگے ہیں۔

مذکورہ کاوشوں کے ساتھ ساتھ اردو طبقے کو یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ موجودہ دور اطلاعاتی ٹیکنالوجی، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ ہر شخص اس اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے کسی نہ کسی سطح پر استفادہ کر رہا ہے۔اس صارفی کلچر نے ہر شے کو نہ صرف برانڈ میں تبدیل کردیا ہے بلکہ ضرورت مندوں کو ضرورت سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچائی ہیں۔مارکیٹنگ کی حکمت عملی چیزوں کو گھر گھر مہیا کرنے پر گامزن ہے جن افراد یا جن اداروں نے بھی وقت کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھ

کران ٹیکنالوجیز کو اپنایا ہے اس کے انھیں حوصلہ افزا نتائج فراہم ہوئے ہیں۔ان امور کو دیکھتے ہوئے عالمی سطح پر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نظام تعلیم اور درس و تدریس کے معیار، طریقۂ کار اور کورسیز میں بھی بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔طلبا کو تکنیکی اور عملی بلکہ تعاملاتی کورسیز سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔بیشتر تدریسی اور آموزشی مواد آن لائن مہیا کرانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ایسی صورت حال میں کچھ ایسے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو کے ذریعہ سے اسکولوں اور کالجوں میں بھی ٹیکنکل اور ووکیشنل کورسیز کا نفاذ کیا جائے۔اردو کے دامن کو بھی بدلتے حالات اور ٹیکنالوجی کے مطابق مسلسل وسعت دیتے رہنے کی ضرورت ہے۔اردو میڈیم اسکولوں میں زیر تعلیم طلبا کو کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرایا جائے تاکہ وہ سرکاری اداروں کے ذریعہ چلائی جانے والی اسکیموں سے واقفیت حاصل کرسکیں اور روزگار میں اردو میڈیم سے تعلیم یافتہ طلبا بہ آسانی روزگار کے مواقع حاصل کرسکیں۔اس تناظر میں مولانا آزاد یونیورسٹی اردو کے فروغ میں مزید تکنیکی، فنی، پیشہ ورانہ اور اسکل بیسڈ کورسیز کا آغاز کرے۔اردو نصاب اور نصاب سے متعلقہ کتب، درسی مواد کا آن لائن انتظام کرے۔اس ضمن میں سب سے پہلے این سی پی یو ایل نے قدم اٹھایا ہے۔قومی کونسل کی ویب کی اپنی دنیا ہے جہاں مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں موجود ہیں، انھیں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی میسر ہے۔پورے ملک میں کتابوں کی فروخت اور فراہمی کے لیے موبائل وین کا تجربہ بھی غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے۔مانو کو این سی ای آر ٹی، این ٹی ایم (سی آئی آئی ایل) اور این سی پی یو ایل جیسے اداروں سے اشتراک کی ضرورت بھی ہے۔

اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے تشکیل کردہ اسکولی نصابات کے مواد کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے۔اس طرف پیش قدمی کے لیے یونیورسٹی کا ایک باقاعدہ ادارہ تشکیل دینا چاہیے۔کمپیوٹر کے ذریعے اردو زبان سکھانے کے لیے Online Learning Urdu Course، Urdu Digital Learning اور Urdu Digital Library کورس شروع کرنا بھی مفید ہوگا۔سائبر اسپیس کے استعمال کے ذریعہ اور آڈیو، وڈیو اور ڈیجٹل تکنیک کی مدد سے اردو زبان کے مختلف مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔اس وسیلے کے استعمال سے اردو سیکھنے کے خواہشمند افراد گھر بیٹھے بھی اردو زبان سیکھ سکتے ہیں۔اردو زبان کی ترویج میں یہ بھی ایک اہم اقدام ثابت ہوگا۔علاوہ ازیں نصابی، درسی، معلوماتی اور مقابلہ جاتی کتابوں کی ترتیب و تشکیل کا مسئلہ حل کرنے کی بھی ضروت ہیں۔یہ اس وقت ممکن ہوگا جب یونیورسٹی شعبۂ تصنیف و تالیف کا ایک باقاعدہ ادارہ کا قیام عمل میں لائے۔نیز اس میں بہتر کارکردگی کے لیے مختلف علوم اور ماہرین لسانیات کا تقرر کرے جو معیاری مواد کی مدد سے خود اپنے نصاب اور درسی کتابیں تیار کرسکیں۔دوسرے علوم کی اردو میں منتقلی یقیناً ایک دقت طلب اور سنجیدہ کام ہے۔تاہم اس کے بغیر اردو میں فاصلاتی تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں۔اس لیے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ زبانوں سے مختلف علوم کی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کرانے پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس کے لیے گو کہ ایک باقاعدہ دارالترجمہ قائم کیا گیا ہے، لیکن اس کے دائرۂ کار کو وسعت دینے اور اسے فعال بنانے کی ضرورت ہے۔

زبان کے فروغ میں چونکہ تعلیم اور تعلیمی نظام میں زبان کی شرکت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔اگر تعلیمی نظام منظم و مستحکم ہوگا تو زبان کے فروغ کے امکانات بھی اسی درجہ وسیع اور روشن ہوں گے۔لہذا مانو کو اس طرف بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ ہندی اور انگریزی کے طرز پر اردو کو بھی ملک کے مین اسٹریم تعلیمی نظام کا حصہ بنانے پر توجہ مرکوز کرے۔ان تمام امور اور نکات سے قطع نظر اردو طبقے کو یہ بھی دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کس حد تک اردو کے فروغ اور طلبا کے مستقبل کے لیے کارآمد ہے، اور ہو سکتا ہے؟ اس حقیقت سے اغماض ممکن نہیں کہ کوئی بھی زبان روزگار سے وابستہ ہوئے بغیر تا دیر قائم و دائم اور اہمیت کی حامل نہیں رہ سکتی۔زبان کی معاشی حیثیت اور معنویت ہی عوام کو زیادہ سے زیادہ اس کی جانب مائل کرسکتی ہے۔اس لیے کہ اگر زبان ذریعۂ معاش اور روزگار کے طور پر سودمند، منفعت کی حامل اور روشن مستقبل سازی کے نقطۂ نظر سے پرکشش و کارآمد نہیں، تو طلبا اس کی جانب محض شوق کی غرض سے بڑی تعداد میں راغب نہیں ہو سکتے۔اس لیے زبان کو روزگار سے جوڑنے اور منفعت بخش بنانے کی ازحد ضرورت ہے۔سرکاری سطح پر ملازمتوں میں اردو سے واقفیت اور اس کی تعلیمی اسناد کو نہ صرف قبولیت کی سند دی جائے بلکہ اسے لازمی قرار دیا جائے۔آج خواہ کتنے ہی اردو میڈیم اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کردی جائیں، خواہ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر کتنا بھی زور صرف کیا جائے، وہ تب تک کارآمد ذریعہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ تہذیب کاری کے سوا روزگار مہیا کرانے کا وسیلہ نہیں بنتا۔عصر حاضر کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا آزاد یونیورسٹی کو اپنا ذریعۂ تعلیم محض اردو زبان تک ہی محدود نہ کرتے ہوئے اسے ذولسانی (Bilingual) طریقۂ تعلیم نافذ کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔جب تک اس پہلو پر توجہ نہیں دی جائے گی ہمیں اردو اداروں اور ان میں ذریعۂ تعلیم ہونے سے وہ خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔اس امر کو اس لحاظ سے کیوں نہیں دیکھا جانا چاہے کہ کہیں اس میں کوئی ایسی سازش تو نہیں جس کو سرسید نے انیسویں صدی میں محسوس کر لیا تھا۔اس مسئلے پر شدت سے توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ کیا وجہ ہے کہ جو اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کو ایسے ادارے نہیں دیے جاتے جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو اور ثقافتی حوالوں نیز تہذیب کاری کے لیے اردو کا نفاذ لازم ہو۔اگر آئندہ ایسا ہوتا ہے تو اس قسم کا کوئی بھی اقدام یقیناً اردو زبان اور اہل زبان کے حق میں سودمند ثابت ہوگا۔

■

Anjum Parveen
Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Email: anjumparveen1491@gmail.com

پی پی سریواستو رند

لاوارث اشعار کا خالق

لالہ مادھو رام جوہر

(1810-1880م)

اُردو ایک زندہ و پائندہ زبان ہے جو باوجود مخالفت کے ہمیشہ پروان چڑھتی رہی ہے۔ بعض اوقات کچھ ایسے فنکار یا شاعر پیدا ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنے پچھلوں کی بہ نسبت زیادہ وقیع اور ممتاز ہوجاتے ہیں اور آئندہ صدیوں تک لوگوں کے لیے مشعل راہ بن جاتے ہیں۔ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ تہذیب اور تمدن کا ہر شعبہ اپنے وقت کا آئینہ دار اور ترجمان ہوتا ہے۔ اردو زبان کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ایسے ادیب اور شاعر اپنی غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت سے ادب کی روح میں نئی زندگی پھونک دیتے ہیں۔ ایسا شاعر یا ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے دَور کے اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ ہر دَور کا ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس دَور کی ادبی فضا کو سامنے رکھ کر ہی ہم اس شاعر کے کارناموں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

اُردو دنیا کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس ممتاز شاعر کے اشعار ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کے ذہن میں زندہ ہیں اور سینہ بہ سینہ چلتے آرہے ہیں، وہ لاوارث طور پر 'نامعلوم' صیغے میں درج ہیں۔ میں پہلے کچھ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر شاعر پر بات ہوگی۔

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی
بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
اب عطر بھی مَلو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دِن ہَوا ہوئے جو پسینہ گلاب تھا
مَوت آئے گی جو لینے کو تو مرجائیں گے
بن بلائے تو خدا کے بھی نہ گھر جائیں گے
نیند آنکھ میں بھری ہے کہاں رات بھر رہے
کس کے نصیب تم نے جگائے کدھر رہے

ان اشعار کے مصرعۂ ثانی آج بھی لوگوں کے ذہن میں درج ہیں اور اکثر تو روز مَرّہ زبان کا بھی حصہ بن گئے ہیں۔ ان بے مثل اشعار کے خالق ہیں لالہ مادھورام جوہر، جن کی ولادت شہر فرخ آباد، اتر پردیش میں ان کی آبائی کوٹھی محلہ رستوگیان میں 1810 میں ہوئی۔ ان کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے مزاج اور ذہن کے متعلق لکھا گیا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ شخصیت تھے۔ ان کی تربیت نہایت پاکیزہ ماحول میں ہوئی۔ وہ بہت ہی مخلص، خلیق اور مہمان نواز انسان تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹ ان کی کوٹھی پر لگا رہتا تھا۔ انھوں نے سید اسماعیل حسن، منیر شکوہ آبادی کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔

شہر فرخ آباد کسی زمانے میں ایک فصیل بند شہر تھا جس کو مغل تاجدار شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے اس کے جانباز سپہ سالار محمد خاں بنگش نے آباد کیا۔ اس فصیل بند شہر نے مغلیہ دَور کی شان و شوکت بھی دیکھی ہے اور اس کا زوال بھی۔ پہلی جنگ آزادی یعنی 1857 میں یہ شہر نواب تجمل حسین خاں کی امان میں تھا۔ مرزا غالب نے جب کلکتہ کا سفر کیا تو ان کا قیام کچھ عرصہ فرخ آباد میں رہا اور وہ نواب تجمل حسین خاں کے مہمان ہوئے۔ نواب صاحب کی مہمان نوازی سے مرزا غالب اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے نواب صاحب کو اپنے ایک شعر میں زندہ جاوید بنا دیا۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش 'تجمل حسین خان' کے لیے

(غالب)

کہتے ہیں کہ میر تقی میر نے جب دہلی سے ہجرت کی اور لکھنؤ کا رخ کیا تو ان کا قیام بھی کچھ عرصہ فرخ آباد میں رہا۔ اس طرح شہر فرخ آباد بھی شعر و شاعری اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی شہر میں اور اسی دَور میں لالہ مادھو رام جوہر بھی اپنے طور پر ادبی محفل سجائے ہوئے تھے۔ 1857 کے اس دور میں جس کو انگریزوں نے 'غدر' کہا اور نواب تجمل حسین خاں کو شکست دے کر اس شہر پر قبضہ کرلیا۔ انگریز دشمنی کی پاداشت میں نواب کی تمام ملکیت ضبط کرلی گئی۔ یہی حشر لالہ مادھو رام جوہر کا بھی ہوا۔ ان کی زمینداری بھی ضبط ہوئی اور ان کو بھی قید کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ بہادر شاہ ظفر کے آخری دورِ حکومت میں جوہر کو مختار شاہی کے معزز عہدے سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ مگر انھوں نے کسمپرسی کے عالم میں 1880 میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اس طرح انہوں نے 70 سال کی عمر پائی۔ ان کا کلام کم یاب ہے مگر جو کچھ بھی بچا ہے، اس دَور کی شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے۔

کیا یاد کر کے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا ہوا تھی، کہانی تھی، خواب تھا

(جوہر)

اس شعر سے دورِ حاضر کے شعرا نے چراغ سے چراغ جلائے اور کچھ حد تک استفادہ بھی کیا۔ مثلاً کیف بھوپالی کا شعر۔

انداز ہو بہو تری آواز پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہَوا کا تھا

(کیف بھوپالی)

جوہر صاحب کی اسی غزل کے کچھ اور اشعار دیکھیں۔

تیرا قصوروار، خدا کا گناہ گار
جو کچھ کہ تھا، یہی دلِ خانہ خراب تھا
ذرّہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں
اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا
اب عطر بھی مَلو تو تکلف کی بُو کہاں
وہ دن ہَوا ہوئے جو پسینہ گلاب تھا

جوہر صاحب کے یہاں وارفتگی، بے ساختگی اور حسن و عشق کی

معاملہ بندی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ جذبات اور احساسات کی عکاسی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اب یہ اشعار دیکھیں:

رات دن چین، ہم اے رشکِ قمر رکھتے ہیں
شام اودھ کی تو بنارس کی سَحر رکھتے ہیں
دل تو کیا چیز ہے، پتھر ہو تو پانی ہو جائے
میرے نالے ابھی اتنا تو اثر رکھتے ہیں
حالِ دل یار کو، محفل میں سناؤں کیوں کر
مدعی کان اِدھر اور اُدھر رکھتے ہیں
بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

جوہر صاحب نے سہل ممتنع میں بھی طبع آزمائی کی اور خوب کی۔ ان کے یہ اشعار بھی دیکھیں۔

آؤ بیٹھو، ہنسو، مزا ہو — کچھ تو فرماؤ کیوں خفا ہو
دل کا دُکھنا اُسی سے کہیے — جو دَرد کی قدر جانتا ہو
اُجلی اُجلی سی چاندنی میں — گورا گورا بدن کھلا ہو
شیشہ تلووں میں چبھ نہ جائے — ٹھکراتے ہو دل کو کج کلا ہو

———

کب سے روتا ہوں اک نظر دیکھو
آنکھ اٹھا کر ذرا اِدھر دیکھو
دل دیا تم کو، غور کر دیکھو
منہ نہ دیکھو مرا جگر دیکھو
رات جاتی ہے، اب تو رحم کرو
دیکھو نزدیک ہے سحر دیکھو
مجھ کو یہ کہہ کے وہ نکالتے ہیں
جاؤ اب اور کوئی گھر دیکھو

———

کس قدر ہے مزاج میں گرمی
شعلہ ہے، آگ ہے، بھبھوکا ہے
اے بتو! کعبہ کا کرو کچھ پاس
دل نہ توڑو یہ گھر خدا کا ہے
چپ رہو، کیوں مزاج پوچھتے ہو
ہم جئیں، یا مریں، تمھیں کیا ہے
اس گلِ تر کے آنے سے جوہر
خانۂ دل تمام مہکا ہے

جوہر صاحب کے یہاں فرقت، رقابت کے مختلف پہلوؤں کا اظہار اور اس کی ادائیگی سرِ فہرست ہے، عشق کی رنگینی اور لطافت سے لبریز ہے جس میں دل کی دھڑکن صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ زبان کی سلاست، طرزِ بیان کی شوخی، فکر اور بے باکی سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔

نیند آنکھ میں بھری ہے کہاں رات بھر رہے
کس کے نصیب تم نے جگائے کدھر رہے

پھر سَر اٹھا کے دیکھ لیا غیر کی طرف
آنکھوں میں کچھ حیا ہو تو، نیچی نظر رہے
کعبہ میں بھی وہی ہے، شوالے میں بھی وہی
دونوں مکان اس کے ہیں چاہے جدھر رہے
سَر دے دیا، مگر نہ ہٹے کوئے یار سے
جو کہہ دیا زباں سے اسی بات پر رہے

———

غیروں سے تو فرصت تمھیں دن رات نہیں ہے
ہاں میرے لیے وقت ملاقات نہیں ہے
جب کہتے ہیں ہم، کرتے ہو کیوں، وعدہ خلافی
فرماتے ہیں ہنس کر، یہ نئی بات نہیں ہے
عاشق کے لیے موت سے بہتر نہیں تدبیر
وہ شوق سے کوسیں، یہ بُری بات نہیں ہے

———

نوبت گریۂ و بے تابی و زاری آئی
بڑے ہنگامے سے گل یاد تمہاری آئی
کس طرف آئے، کدھر بھول پڑے، خیر تو ہے
آج کیا تھا جو تمھیں یاد ہماری آئی
نزع میں بھی وہ یہاں تک نہیں آنے دیتا
اے خدا غیر کو آجائے، ہماری آئی
نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھ مری باری آئی

اگر غزلوں کا انتخاب پیش کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے، اس لیے کچھ متفرق اشعار درج کر رہا ہوں۔

اپنی اپنی ہے یہ تقدیر، سبھی تھے سائل
ایک کو شیشہ ملا، ایک نے پتھر پایا
خدا سمجھے یہ کیا صیاد و گلچیں ظلم کرتے ہیں
گلوں کو توڑتے ہیں بُلبلوں کے پَر کترتے ہیں
ذرا رہنے دو اپنے در پہ، ہم خانہ بدوشوں کو
مسافر جس جگہ آرام پاتے ہیں ٹھہرتے ہیں
رونے پہ اگر آؤں تو، دریا کو ڈبو دوں
قطرہ کوئی سمجھے نہ مرے دیدۂ نم کو
کہا مانو، محبت میں ضرر ہے
طبیعت کو سنبھالو، دل کدھر ہے
عجب منزل پہ مجھ کو عشق لایا
نہ رستا ہے، نہ کوئی راہبر ہے
نہ آؤ اس طرح اے حضرت 'عشق'
چلے جاؤ غریبوں کا یہ گھر ہے
تصوّر زلف کا ہے اور میں ہوں
بَلا کا سامنا ہے اور میں ہوں

لکھی ہے آپ کی تصویر دل پر
یہی نقش وفا ہے اور میں ہوں
یہی باتیں تو یاد آتی ہیں
ہائے وہ گفتگو اشاروں میں
دیکھیے کیا دکھاتی ہے تقدیر
جب کھڑا ہوں گناہ گاروں میں
بوئے گل سونگھ کر بگڑتے ہیں
یہ پری رو ہوا سے لڑتے ہیں
کیوں جوانی کے پیچھے پڑتے ہیں
بھاگتے کو نہیں پکڑتے ہیں

جناب جوہر کی شاعری کا وہ امتیازی پہلو جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام بخشتا ہے، وہ ہے ان کی سادہ اور شستہ روز مرّہ زبان، دلکش اندازِ بیان اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار وردِ خاص و عام ہوئے۔ معاملات راز و نیاز، ناز و انداز اور رقابت کے موضوعات نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔

''خمِ خانۂ جاوید، میں لالہ سری رام لکھتے ہیں:

''اشعار کیف آمیز ہوتے ہیں جن کو پڑھنے سے قارئین اور سامعین دونوں لطف لیتے ہیں اور دونوں کے دلوں پر برابر اثر پڑتا ہے۔ ان کی طرز خاص معاملہ گوئی ہے۔ زبان صاف، شستہ اور بے تکلف ہے۔ بہرحال ان کے مستند ہونے میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا ہے۔''

''اُردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعراء میں منشی گنپت سہائے فرماتے ہیں:

''آبائی تمول اور فضیلت علمی کے ساتھ جوہر شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ عروض وقافیہ کے بخوبی ماہر ہیں۔ منیر شکوہ آبادی کے تلامذہ میں فرد تھے اور خود بھی استادانہ قابلیت رکھتے تھے۔ حضرت جوہر کو شعر و شاعری سے طبعی مناسبت تھی، عشقیہ مضامین کو لطافت اور رنگینی کے ساتھ سادہ اور سلیس زبان میں ادا کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

ان مستند آرا کی روشنی میں جنابِ مادھو رام جوہر کے کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ از حد ضروری ہے اور ان کے وہ اشعار جو لاوارث قرار دیے گئے ہیں، ان کو اب ان کے نام سے نہ صرف جوڑا جائے بلکہ ان کی حق بجانب تشہیر بھی کی جائے اور اگر کسی طرح ممکن ہو تو ان کا کلام یکجا کیا جائے۔ چونکہ میرا تعلق بھی شہر فرخ آباد سے ہے، اس لیے میں نے اس مضمون میں ان اشعار کا سہارا لیا ہے، وہ مختلف ذرائع سے فراہم ہوئے ہیں۔ اردو اکادمیاں یا این سی پی یو ایل یہ کام بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔

■

P.P. Sriwastav Rind
R-16, Sector 11
NOIDA - 201301
Mob.:0971142018

نقد و نگاہ

ذولسانی ہندو شعرا پر ایک نظر

محمد یحییٰ جمیل

ترکوں کے استحکامِ حکومت کے بعد، طویل عرصے تک، ہندوستانی، فارسی سے بیگانہ رہے، لیکن جب راجا ٹوڈرمل نے اسے ملازمت سے جوڑ دیا تو وہ باقاعدہ فارسی سیکھنے لگے۔ خصوصاً کایستھ ہندوؤں نے فارسی میں بہت جلد مہارت حاصل کرلی اور اس زبان میں ادب بھی تخلیق کرنے لگے۔ اردو کا رواج بڑھنے کے بعد انھوں نے اردو میں بھی دادِ سخن دی۔ مغلوں کے آخری زمانے میں بیشتر شعراء ذولسانی ہوا کرتے تھے۔ ہندو شعرا اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد فارسی کا چلن کم ہوا اور ہندو تعلیم یافتہ طبقے کا رجحان انگریزی کی طرف ہوگیا۔ اٹھارویں، انیسویں صدی میں ہندو شعرا نے جو ادبی معرکے سر کیے وہ ناقابل فراموش ہیں اور اس کا مطالعہ ادب کے طالب کے لیے ناگزیر ہے۔

عہدِ وسطیٰ بھارت کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔ اس زمانہ میں دو عظیم تہذیبیں ملیں اور کئی شاہکار وجود میں آئے۔ ان سب میں ایک بڑی اور شاندار یادگار، زبانِ اردو ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں بھارت پر ترکوں کی حکومت قائم ہوئی اور یہاں فارسی کو باقاعدہ رواج حاصل ہوا۔ ابتدا میں سرکاری کام فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں میں بھی انجام دیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ فارسی کا حلقۂ اثر بڑھتا گیا۔ سکندر لودھی نے ہندوؤں کی فارسی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ محکمۂ مال گزاری ابتدا ہی سے ہندوؤں کے لیے مخصوص رہا تھا۔ سوریوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں کو دوسرے محکموں میں بھی بلند عہدے ملے۔ عہد اکبری میں ٹوڈرمل نے فارسی کو دفتری زبان بنادیا لہٰذا تعلیم یافتہ ہندو ملازمت کے لیے بڑے پیمانے پر فارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اکبر کے زمانے سے مشترکہ مکاتب کا دستور قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں میں فارسی کا رواج اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے فارسی میں ادب کی تخلیق بھی شروع کردی۔ ہندوؤں میں کایستھ برہمن اور کشمیری پنڈت، فارسی میں دادِ سخن دینے والوں میں سب سے آگے رہے ہیں۔ سید عبداللہ نے اپنی کتاب، ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' میں ہندوؤں کے فارسی ادب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور عہد اکبری سے شروع ہوتا ہے جس میں تصانیف کی ابتدا ہوئی۔ اس زمانے میں تصنیفی قابلیت کی کمی کی وجہ سے بہت کم کتابیں لکھی گئیں۔ دوسرا دور جہانگیر کے سن جلوس سے لے کر شاہجہانی عہد کے اوائل بلکہ وسط تک ممتد ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہندو اپنی مذہبی کتابوں کو فارسی میں منتقل کرتے ہیں۔ تیسرا دور عالمگیر کے زمانے سے لے کر مغلوں کے انحطاط پر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ بہترین زمانہ ہے۔ اس میں تاریخ، انشاء، شاعری، اور دیگر علوم وفنون پر بے شمار اعلا کتابیں ہندو اہل قلم نے لکھیں۔ اعلا لغت نویس، فارسی کے ماہر اور قابل سیاق داں پیدا ہوئے۔ چوتھا دور مغلوں کے انحطاط سے لے کر آج تک ہے۔[1]

یہ کتاب پہلی مرتبہ 1943 میں شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم چوتھے دور کو آزادیٔ ہند تک محدود کرسکتے ہیں۔

جب اردو میں تخلیقی ادب کی ابتدا ہوئی تو مسلم شعرا کی بہ نسبت ہندو شعرا نے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور زیادہ تر فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔[2] مثلاً مرزا غالب کے دوست، منشی ہرگوپال تفتہ نے اردو کی بجائے صرف فارسی میں شعر کہے۔ لیکن بعد میں ہندو شعرا اردو کی طرف راغب ہوئے اور انھوں نے اردو میں بھی اعلا ادب تخلیق کیا۔ فطری طور پر اس دور میں بیشتر شعرا ذولسانی تھے۔ وہ بیک وقت فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ ایسے ہی باکمال ہندو ذولسانی شعرا کا تذکرہ، مقصودِ مقالہ ہے۔

ابتدائی ہندو ذولسانی شعرا:

☆ منشی ولی رام ولی:

اردو کا پہلا ہندو شاعر، شاہجہاں کے زمانے کا، منشی ولی رام متخلص بہ ولی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ کایستھ برہمن داراشکوہ کا مشیر خاص تھا اور شاہجہان آباد کا باشندہ تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ لہٰذا تینوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ یعنی سہ لسانی شاعر تھا۔ دیبی پرشاد بشاش نے اپنی کتاب میں ولی کی غزل کے تین شعر پیش کیے ہیں۔ یہ شعر ملمع کی خوبصورت مثال ہے۔ اس کا پہلا مصرع فارسی اور دوسرا اردو میں ہے۔[3]

تو مہمان آمدی اینجا شدی خود خانۂ خاوند
تو اپنے آپ سے بھولا کسی کو نہ پچھانا ہے
شراب سرخ می نوشی اجل کردی فراموشی
مردن کو دور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے

یعنی اے انسان تو بطور مہمان دنیا میں آیا اور خود کو اس کا مالک سمجھ بیٹھا۔ تیری خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ اب تو کسی کو نہیں پہچانتا۔ موت کو بھول کر سرخ شراب پیتا ہے۔ سرخ شراب عیش وعشرت کے ساتھ غریبوں کے استحصال کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تو ان کا خون پی رہا ہے۔ موت کو دور نہ سمجھ اسے محض ایک بہانہ چاہیے۔

☆ رائے آنند رام مخلص:

رائے آنند رام مخلص، سودھرہ (ضلع سیالکوٹ) کا کھتری تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں وزیر اعتماد الدولہ کا وکیل تھا۔ بعد میں سیف الدولہ عبدالصمد خاں صوبۂ لاہور وملتان کے وکیل کی حیثیت سے بھی مصروف کار رہا۔ اس

کی خدمات کی بدولت اسے رائے رایان کا خطاب عطا ہوا تھا۔ 1164ھ میں انتقال کیا۔ شاعری میں پہلے مرزا بیدل سے اصلاح لی۔ پھر خان آرزو سے مشورۂ سخن کرتا رہا۔ مخلص وہ پہلا ہندو فارسی شاعر ہے جو فارسی زباندانوں کے اشعار پر تنقید کیا کرتا تھا۔ فارسی کلام کی مثال:

حقوق صحبت گل بر تو بسیار است ای بلبل
مبادا از چمن غافل درا یام خزاں باشی [4]

یعنی اے بلبل تجھ پر پھول کی صحبت کے بہت حق ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو موسم خزاں میں چمن سے غافل ہو جائے۔

مخلص کا اردو کلام ملاحظہ ہو:

آتا ہے ہر سحر اٹھ تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو [5]

☆ مہاراجہ رام نرائن موزوں:

مہاراجہ رام نرائن موزوں عظیم آباد (متوفی 1177ھ) گرامی امیر اور پٹنہ کا حاکم تھا۔ شعر کا قدردان تھا۔ فارسی شاعری میں شیخ علی حزیں سے اصلاح لیتا تھا۔ موزوں خاص فارسی کا شاعر تھا۔

محروم ماند از تو لب تشنۂ حسین
اے آب خاک شو کہ ترا آبرو نماند [6]

تجھ سے امام حسینؑ کے پیاسے ہونٹ محروم رہ گئے۔ اے پانی، برباد ہو جا کہ تو بے آبرو ہو گیا۔ پانی کو خاک شو کہنے کی داد دیجیے۔

اردو کلام سے ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ابر ہو گا تو خجالت ستی پانی پانی
مت مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ [7]

☆ رائے سرب سنگھ دیوانہ (متوفی 1214ھ)

مہاراجہ رام نرائن موزوں کا بھانجہ تھا اور فارسی اور اردو میں مہارت کے ساتھ شعر کہتا تھا۔ فارسی سے زیادہ رغبت تھی لہٰذا فارسی کے چار دیوان ہیں۔ فارسی کے کلام سے ایک شعر بطور مثال:

از جفایت تا بکی از دیدہ خوں بارد کسی
آخر اے جان کسی رحمی کہ جاں دارد کسی [8]

یعنی تیری جفا پر کوئی کب تک خون کے آنسو بہائے۔ اے کسی کی جان! رحم کر، آخر اس کی بھی جان ہے۔

رائے سرب سنگھ دیوانہ نے اردو شاعری کو بلند معیار عطا کیا۔ بلکہ استاد کا مرتبہ حاصل کیا۔ موزوں کے کئی شاگرد ہوئے۔ ایک شاگرد جعفر علی حسرت تھے جن کے معروف شاگرد جرأت ہوئے ہیں۔ [9]

جان پر آ بنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

دل سدا تڑپے ہے میرا مرغ بسمل کی طرح
یا کہ سیکھی مرغ بسمل نے مرے دل کی طرح [10]

ان ابتدائی شعرا کے بعد ملک کے مختلف خطوں سے چند با کمال ہندو ذولسانی شعرا پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

دھلی:

☆ پنڈت امر ناتھ ھالو آشفتہ:

پنڈت امر ناتھ ہالو ملقب بہ ملک الشعرا بلند مرتبہ شاعر گذرے ہیں۔ ان کا وطن دہلی تھا۔ ملتان میں قاضی کے عہدے پر فائز رہے۔ خدا بخش خان تنویر دہلوی کے شاگرد تھے۔ فارسی میں دیوان مرتب کیا لیکن وہ شائع نہ ہو سکا۔ حافظ کی غزل پر ان کی ایک تضمین ہے اس سے بطور نمونہ ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

رفت در خواہش دل عمر گرانمایہ تمام
کامیابی نہ کسی یافت ز دور ناکام
با ہمیں وصف ندارند نظر بر انجام
ہمہ کس روز بہی می طلبد از ایام
مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینم

دلی خواہشات میں عمر گراں مایہ تمام ہو گئی۔ اس ناکام زمانے میں کسی کو کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس کے باوجود لوگ انجام پر نظر نہیں رکھتے۔ ہر شخص زمانے سے اچھے دن طلب کرتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ میں ہر نئے دن کو، پچھلے سے بدتر دیکھتا ہوں۔

صاحب تذکرۂ شعرائے پنجاب کے مطابق آشفتہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن تذکرے میں اردو کا کوئی شعر نقل نہیں کیا گیا۔ [11]

کشمیر:

کشمیر میں صاحب علم اور اہل علم کے قدردان سلطان زین العابدین نے خصوصی طور پر کشمیری برہمنوں کی دلجوئی کی اور ان میں فارسی کو رائج کر کے انھیں اعلا مناصب عطا کیے۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ بہتر تعلقات استوار ہو سکیں۔ کایستھ برہمنوں کے بعد فارسی میں غیر معمولی استعداد حاصل کرنے والے کشمیری برہمن ہیں۔ انھوں نے فارسی کے ساتھ اردو میں بھی اعلیٰ تخلیقی ادب تخلیق کیا۔ چند کشمیری ذولسانی ہندو شعرا کا تعارف پیش ہے۔

☆ پنڈت ھری ھر ناتھ مٹو عاصی

رائے بہادر پنڈت ہری ہر ناتھ مٹو عاصی 19 اکتوبر 1874 کو پیدا ہوا۔ کشمیر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے اجداد نواب شجاع الدولہ بہادر کے زمانے میں لکھنؤ آ کر آباد ہوئے۔ تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ 1893 میں کیننگ کالج سے بی اے کیا۔ بعد ازاں ملازمت شروع ہوئی۔ اولاً سر رشتہ کورٹ آف وارڈس بریلی میں رہا۔ 1901 میں ڈپٹی کلکٹر اور 1923 میں عہدۂ کمشنری پر فائز ہوا۔ گورنمنٹ عالیہ ہند کی جانب سے رائے بہادر کا خطاب ملا۔ 1927 میں پنشن پائی۔ دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ [12]

ہم کو صورت نہ دکھاتے نہ دکھاتے لیکن
غیر سے بھی تو نہ در پردہ اشارے ہوتے
جذبہ اتنا تو اثر تونے دکھایا ہوتا
ہم تو ان کے تھے مگر وہ بھی ہمارے ہوتے

اے ابر رحمت بر من نگاہے
پیہم نہ داری باشد کہ گاہے
تو شاہ شاہاں من مور بے پر
عاجز و خستہ چون پرِ کاہے

یعنی اے ابر رحمت مجھ پر ایک نظر کر، لگاتار نہیں، کبھی کبھار ہی سہی۔ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور میں بے پر چیونٹی ہوں۔

☆ رائے سیتا رام عمدہ:

زندہ رام موبد کا تیسرا فرزند رائے پنڈت سیتا رام عمدہ کشمیری الاصل تھا۔ والد کے ساتھ الہ آباد آ کر آباد ہوا۔ محض 25 سال کی عمر میں وفات پائی۔ عمدہ کے فارسی دیوان میں دس ہزار شعر موجود ہیں۔ دیوان ان کی وفات کے بعد اس کے والد نے مرتب کیا۔ اور بیٹے کے غم میں چھ ماہ بعد ہی وفات پائی۔ عمدہ کے دونوں زبانوں میں شعر موجود ہیں۔ [13]

مرے تابوت پر حاجت نہیں پھولوں کی چادر کی
کہ میری نعش پر وہ سرو گل اندام پہنچے گا
خراب مجھ کو نہ کر جان آشنا کہہ کر
برا کرے ہے کسو سے کوئی بھلا کہہ کر

ز فیض اشک بالا در دل شب کشت اعمالم
شود اے عمدہ سیراب این زمین از شبنمی دیگر

یعنی میرے اعمال کی کھیتی، آدھی رات میں آنسوؤں کے فیض سے بڑھتی ہے۔ اے عمدہ یہ زمیں کسی اور ہی شبنم سے سیراب ہوتی ہے۔

لکھنؤ:

☆ پنڈت دیا شنکر تکو فگار لکھنوی

پنڈت تلوک چند صاحب تکو کا فرزند تھا۔ فارسی میں مرزا ناطق مکرانی کے اور اردو میں خواجہ آتش کی شاگردی اختیار کی۔ ضلع گونڈہ کی سر رشتہ داری پر تقرر رہا۔ بلرام پور کے مہاراجہ نے اسے اپنی ریاست میں لے کر افسر منشی

خانہ مقرر کیا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد مہارانی نے مشیر خاص کا عہدہ دے دیا تھا۔ کلام میں دشوار پسندی نہیں۔ سلاست اور لطافت زبان سے لگاؤ ملتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر تھا۔14

سودا ہے اپنی آنکھ کو چشم سیاہ کا
خار مژہ میں الجھا ہے دامن نگاہ کا
جب شب فرقت میں دھوکے سے چلی آتی ہے نیند
آنکھوں کے ڈھیلوں سے کیا کیا ٹھوکریں کھاتی ہے نیند

ماند بآسماں دل پر اضطراب ما
داغ فراق یار بود آفتاب ما

یعنی ہمارا پر اضطراب دل آسمان ہوگیا اور دوست کے فراق کا داغ ہمارا سورج بن گیا۔

پنجاب:

☆ پنڈت سروپ نرائن ایمن

پنڈت سروپ نرائن رینہ پنڈت بشن نارائن رینہ رئیس امرتسر کا بیٹا تھا۔ 1899 میں فارغ التحصیل ہوکر 1901 میں اعلا تعلیم کے لیے لندن پہنچا۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔15 فرخی کے مشہور قصیدۂ بہاریہ کی زمین میں غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

خوشا دلی کہ داشتم بہ صحبت نگار ہا
سرور ہا سرود ہا ہوای جویبار ہا
برای تو دمیدہ گل زبہر تو رمیدہ بو
بیک بہار حسن تو نثار صد بہار ہا

یعنی میرا دل کتنا اچھا ہے کہ اسے حسینوں کی صحبت، خوشیاں، نغمے اور جویبار کی ہوائیں حاصل ہیں۔ اے محبوب! تیرے لیے پھول کھلے، تیرے لیے خوشبو پھیلی، تیرے حسن کی ایک بہار پر سیکڑوں بہاریں قربان ہیں۔

حیدر آباد:

☆ راجہ گردھاری پرشاد باقی حیدرآبادی

راجہ گردھاری پرشاد کا وطن چھپرا مئو ہے۔ آصف جاہ کے زمانے میں ان کے اجداد حیدر آباد دکن منتقل ہوگئے تھے۔ اور ریاست کے اعلا مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ باقی کی پیدائش حیدر آباد ہی میں ہوئی۔ اعلا تعلیم کے بعد سرکاری عہدے پر فائز ہوگئے۔ ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت شستہ اور پاکیزہ اشعار کہے ہیں۔ حضرت شمس الدین فیض کی شاگردی اختیار کی۔ کلام کا موضوع تصوف ہے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں میں تغزل بھی موجود ہے۔ قصائد بھی خوب ہیں۔ رباعیوں میں اخلاقی مضامین بیان ہوئے ہیں۔ 1309ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔16

بہ بستاں نرگس شہلا بہ شوخی دیدہ می بازد
تو نیز از خواب شو بیدار و چشم سرمہ سا بکشا
بس اے صیاد رحمی کن بہار آمد رہایی دہ
چنین باب قفس را بند داری تا کجا بکشا

باغ میں نرگس شہلا نے بڑی شوخی سے آنکھیں کھول لی ہیں۔ تو بھی نیند سے بیدار ہوجا، اور اپنی چشم سرمہ سا کھول دے۔ اے صیاد! بہت ہوا، رحم کر، بہار آگئی اب رہا کردے۔ تو اس طرح قفس کا دروازہ کب تک بند رکھے گا، اسے کھول دے۔

آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے
حق ہمسایہ ادا کرتا ہوں

☆ مہاراجا کرم وجود:

مہاراجا کرم وجود علم دوست تھے۔ شعرا و علماء کی قدر دانی کرتے اور ان کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ نہ صرف ہندستان بلکہ ایرانی شعرا بھی ان کے دربار میں موجود تھے۔ اونچی اونچی تنخواہیں پاتے تھے۔ تقریباً 300 شاعر تھے۔ کسی کی تنخواہ 200 سے کم اور 1000 سے زائد نہ ہوتی تھی۔ سخن فہم اور سخن سنج کامل تھے۔ کلام سنجیدہ اور مضامین شگفتہ ہیں۔ آپ کے تین دیوان ہیں۔ ایک فارسی میں اور دو اردو میں۔ علمی و ادبی اور مذہبی محفلیں منعقد کرتے اور اسرار و رموز سمجھتے اور ان پر اظہار خیال کرتے۔ علم نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ 7 ربیع الآخر 1261ھ کو 82 سال کی عمر میں انتقال کیا۔

50 برس پیشکاری کے عہدے پر فائز رہے۔ عشرت کدۂ آفاق کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ اس میں اپنے خاندان کے حالات تحریر کیے۔ چند حکایتیں بھی بیان کیں اور ہر حکایت کے آخر میں ایک شعر لکھا جس سے حکایت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ سر ہنری رسل نے 1224ھ سے 1234ھ کے زمانے میں اپنے قیام کے دوران، مہاراجہ کے حالات زندگی لکھے ہیں۔17

دست تو نازک است و دلم جوش می زند
بہر نگار دست حنا می فرستمت

ترجمہ: تیرا ہاتھ نازک ہے اور میرا دل جوش مارتا ہے۔ تیرے ہاتھوں کی تزئین کے لیے میں مہندی بھیجتا ہوں۔

صوفی کو عطا جس نے کیا مذہب صافی
نخوت کوفف اسی نے سر رنداں سے نکالا
دل کو جب تک نہ کچھ علاقہ ہو
کوئی لکھتا ہے بے سبب کاغذ
دل کو سمجھ رہا ہوں میں دلدار کی متاع
اپنی جو ہے متاع وہ ہے یار کی متاع

نتیجہ:

ہندو شعرا نے وقت کے تقاضے کو لبیک کہتے ہوئے، ایک غیر ملکی زبان فارسی سیکھی اور محض ملازمت کی ضروریات تک محدود نہ رہتے ہوئے، اس میں اہل زبان کی طرح مہارت حاصل کی، نیز کشمیری، پنجابی، بنگالی زبان دان ہونے کے باوجود اردو میں بھی غیر معمولی استعداد کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اردو میں ان کی قادر الکلامی، پختگی اور روانیِ طبع مسلم ہے۔ افسوس کہ انگریزوں کی آمد نے اس سلسلے کو منقطع کر دیا۔ بہرکیف عہد وسطیٰ کے اواخر کی اس شاندار ادبی تاریخ کا ہمارے مطالعے میں رہنا، اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے ہمارے ملک کے بہتر حال اور روشن مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مآخذ:

1۔ سید عبداللہ (1992 اشاعت سوم) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ص: 83-282
2۔ منشی دیبی پرشاد بشاش (ستمبر 1885)، تذکرۃ الشعرائے ہنود، حصہ دوم، بھوپال،، ص1
3۔ منشی دیبی پرشاد بشاش، ص141
4۔ سید عبداللہ، ص58-150
5۔ منشی دیبی پرشاد بشاش، ص119
6۔ سید عبداللہ، ص206
7۔ منشی دیبی پرشاد بشاش، ص125
8۔ سید عبداللہ، 213
9۔ منشی دیبی پرشاد بشاش، ص1
10۔ ایضاً، ص55
11۔ سرہنگ خواجہ عبدالرشید (اکتوبر 1967) تذکرہ شعرائے پنجاب، اقبال اکادمی، کراچی، ص33
12۔ پنڈت برج کشن کول بے خبر، پنڈت جگموہن ناتھ شوق (1932) تذکرہ شعرائے کشمیری پنڈتاں المعروف بہار گلشن کشمیر، انڈین پریس لمیٹیڈ، الہ آباد، ص38
13۔ ایضاً، ص553
14۔ ایضاً، ص104
15۔ سرہنگ خواجہ عبدالرشید، ص65
16۔ صوفی عبدالجبار ملکاپوری، ص312 تا 315
17۔ ایضاً، ص54
18۔ منشی دیبی پرشاد بشاش، ص148-1

■

Dr. Mohammad Yahya Jamil
Head, Department of Persian, Smt. Kesharbai Lahoti Mahavidyalaya,
Post: Shivaji Nagar,
At: Amravati- 444603
Mob.:07350404313

جاں نثار اختر کی طویل نظمیں

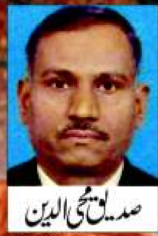

صدیق محی الدین

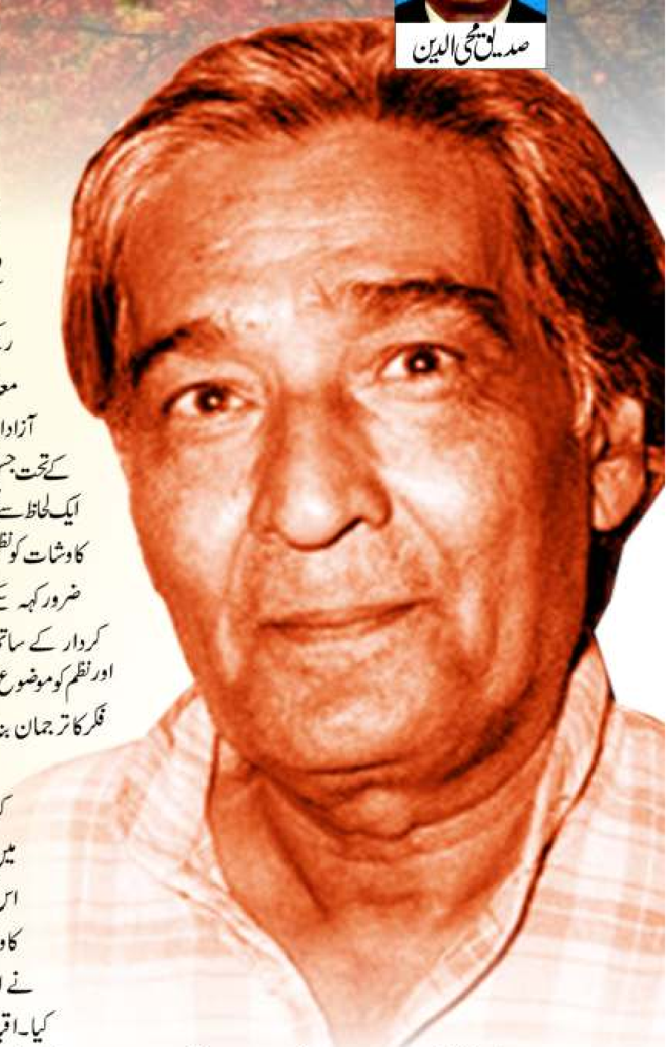

اُردو کی شعری روایت میں مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ یوں تو طوالت کی حامل شعری اصناف ہیں لیکن موضوعات اور تخلیقی محرکات و مقاصد کے پیشِ نظر اُن کی مخصوص صنفی شناخت قائم ہے۔ یہ قدیم اصناف جدید نظم کے صنفی تصور سے یقیناً مختلف شعری حیثیت کی حامل ہیں۔ اُردو شاعری میں نظم کی روایت یوں تو دکنی عہد میں قلی قطب شاہ، ولی و سراج اور میر و سودا کے عہد میں بھی مثنویات کی صورت میں موجود رہی ہے۔ مثنوی کی ہئیت میں لکھی ہوئی میر کی مختلف شعری کاوشات کو نظم کے تحت شامل کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی نظم کے جدید صنفی تصور کے حوالے سے انھیں نظم نہیں کہا جاسکتا۔ لگ بھگ اسی عہد میں نظیرا کبر آبادی نے بھی اپنی پیش رو اور معاصر شعری روایت سے انحراف کرتے ہوئے نظم نگاری کی منفرد روایت قائم کی، اپنی تمام تر معاشرتی سماجی، تہذیبی وابستگی کے باوجود نظیر کے ذہن میں بھی نظم کا صنفی تصور واضح نہیں تھا۔ وہ مخمس، مسدس یا غزل کی ہیئت میں کسی موضوع پر اپنی شعری کاوش کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا یہ اجتہاد اپنے معاصر شعری روایت سے یقیناً مختلف ہے۔

آزاد اور حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعروں کے تحت جس نظم جدید کو فروغ دینے کی کوشش کی وہ بھی ایک لحاظ سے تجربہ پسندی کا ہی رجحان تھا، لیکن ان کی کاوشات کو نظم کے صنفی تعین کی جانب ایک اہم قدم ضرور کہہ سکتے ہیں۔ نظم کو اپنے تعمیری اور تشکیلی کردار کے ساتھ اقبال نے نئی جہات سے آشنا کیا، اور نظم کو موضوع و ہئیت کی جدت کے ساتھ اپنی مخصوص فکر کا ترجمان بنایا۔ اقبال کا یہ کارنامہ اُردو نظم کے تخلیقی ارتقا میں انھیں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اقبال نے شعوری طور پر اُردو میں طویل نظم کی ہئیت کو اختیار کیا، اگرچہ اس کی ابتدا حالی کر چکے تھے، لیکن حالی کی کاوشات ابتدائی نوعیت کی تھیں۔ اقبال نے اسے نئی وسعتوں اور بلندیوں سے آشنا کیا۔ اقبال کی طویل نظم نگاری کی کامیابی کا اہم راز یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی ہئیت سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اُن کے مخصوص نظامِ فکر کے اظہار کے لیے جس وسعتِ بیانی کی ضرورت تھی انھوں نے غزل کی ہئیت میں ہی اس کی تشکیل کی۔ اُن کی بیشتر طویل نظمیں اسی ہئیتی جدت کا مظہر ہیں۔ طویل نظم ایک مخصوص تخلیقی منصوبہ بندی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں بیانیہ کا تخلیقی ارتکاز بھی ناگُریز ہے۔ اس کے تخلیقی امکانات بھی بے شمار ہیں۔ کہانی، بیانیہ ڈرامائی مکالمہ نگاری، خود کلامی، تاریخی واقعات اور اسی نوع کے متعدد تخلیقی اظہارات سے طویل نظم نگار کام لے سکتا ہے اور حسبِ ضرورت اپنی نظم میں تسلسلِ بیان اور تخلیقی وحدت بھی قائم کرسکتا ہے۔ طویل نظم کے تخلیقی جواز کا تجزیہ کرتے ہوئے قمر رئیس اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''طویل نظم کے شاعر کے لیے اجتماعی شعور اور تاریخی بصیرت لازمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ کٹھن وہ مرحلہ یا عمل ہے جو فکر و شعور کے اس حاصل کو نظم کا تخلیقی فارم دیتا ہے۔ ان گنت تجربات اور تصورات کو سیّال بنا کر جذبہ و احساس کی زبان یعنی شاعری کے پیکر میں ڈھالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے انسانی زندگی اور معاشرے سے گہری وابستگی اور دلچسپی ہی نہیں تخلیقی فکر کا ایک خاص استقراء اور نظم وضبط بھی درکار ہوگا۔''

مذکورہ اقتباس سے طویل نظم کے صنفی تقاضوں کی بڑی حد تک وضاحت ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ طویل نظم کی ہئیت کو شاعر اسی وقت اختیار کرتا ہے جب اس کے موضوع اور بیانیہ کے لیے مختصر ہئیت ناکافی لگتی ہے۔ لہٰذا فطری طور پر شاعری کی تخلیقی رَو وسعت و طوالت اختیار کرتی ہے۔ یہاں شاعر پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ نظم میں تسلسل کے ساتھ تخلیقی وحدت ارتکاز کو بھی پیشِ نظر رکھے۔ بہر حال طویل نظم کی شعریات میں ایسے کوئی متعین قواعد وضوابط کی تدوین نہیں ہوسکی ہے کہ جس سے مطلق طور پر یہ معلوم ہوسکے کہ نظم کی عمومی حدوں سے تجاوز کے بعد طوالت کی تعریف میں آتی ہے۔

جاں نثار اختر کو شعر و ادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ نیز علی گڑھ کے علمی و ادبی ماحول نے اس کو مزید حسن آفریں بنایا۔ اُن کے ادبی مذاق کی تشکیل و تعمیر میں جہاں پر کلاسیکی شعریات کا اہم حصّہ ہے۔ وہیں پر رومانوی رجحان کے اثرات بھی شدت سے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اُن کے رومانی مزاج پر کلاسیکیت کی سخت گیری بے اثر ثابت ہوئی۔ وہ بہت جلد اشترا کی حقیقت نگاری کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر آگئے۔ اس عہد میں ترقی پسندوں نے آزادی کے حصول اور معاشی عدم مساوات کو اپنے منشور میں نمایاں اہمیت دی اور موضوعاتی اور بیانیہ شاعری کو رواج دیا۔ جاں نثار اختر نے بھی اپنے عہد کے سماجی و معاشی مسائل کو نظموں کا موضوع بنایا۔ جاں نثار اختر نے بھی کچھ طویل نظمیں لکھی ہیں۔ اگرچہ یہ نظمیں بہت زیادہ طویل نہیں ہیں، لیکن موضوعاتی وسعت اور شعری بیانیہ کے سبب ان میں کسی حد تک طوالت آگئی ہے اس قبیل کی نظموں میں مورخ سے، ریاست، دانائے

راز، پانچ تصویریں اور امن نامہ شامل ہیں۔ یہ نظمیں اُن کی تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی شعور کی ترجمان ہیں۔ نظم 'مورخ سے' شاعر کے سماجی تاریخی اور سیاسی شعور کی آئینہ دار ہے۔ شاعر اس نظم میں مورخ سے مخاطب ہے کیونکہ مورخ انسانی تاریخ کے تمام ادوار سے واقف ہے۔ اور وہ ہر دور کی حکومت اور حکمرانی سے واقف ہے۔ ملک گیری کی ہوس اور مذہبی منافرت کے سبب لاکھوں انسانوں کا خون بہایا گیا۔ لیکن شاعر مورخ سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا تاریخ محض اسمائے رجال اور تقویم پارینہ کا نام ہے؟ شاعر کے پیش نظر تاریخ جامد تصور نہیں بلکہ یہ فطرت کے قانون تغیر سے عبارت ہے۔ اسی سے انسانی زندگی میں انقلاب آتے ہیں۔ جس کے سبب پیداوار کے طریقے بدل جاتے ہیں۔ یہی تبدیلیاں مختلف سماجی طبقوں میں کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اور سرمایہ دار صنعت کار اور محنت کش عوام کے طبقات وجود میں آئے۔ بقول شاعر

مختلف فرقوں کے سادہ ابتدائی دور سے
کس طرح پیدا ہوئی تمیز آقا و غلام
کیوں ہوا دنیا میں سائنسی تمدن کا ظہور
کس لیے قائم ہوا سرمایہ داری کا نظام
کس طرح سرمایہ داری اپنی قوت کے لیے
خون سے مزدور کے پیتی رہی گل رنگ جام

شاعر کے پیش نظر انسانی تاریخ یہ بھی ہے کو دنیا میں ہر طرح کے استحصال کی شکار اور محکوم قومیں بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ صدیوں کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالتی ہیں۔ شاعر انسانی تاریخ کے اسی دور میں اشتراکیت کے ظہور کا ذکر کرتا ہے۔ جس نظام نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا۔

زندگی کی ظلمتوں میں کس طرح مشعل لیے
سینۂ گیتی سے اُبھرا آفتاب لالہ فام
یہ تجسس، یہ تفکر، یہ بصیرت، یہ نظر
ذہن میں کرتی ہے وا تاریخ کے عقدے تمام
اخذ کر سکتی ہے دنیا ان سے وہ محکم اصول
نشوِ آدم کے لیے رکھتے ہوں جو حکم دوام

غرض اس طرح تاریخ حیات انسانی میں تغیرات اور تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ انسانی افکار اور نظریات انسانی سماج کو بدلتے ہیں اور خوش آئینہ اور روشن مستقبل کا پیام بھی سناتے ہیں۔ اس نظم کا یہ اختتام ملاحظہ کیجیے

ختم ہوئے نسل آدم کی فنا کے تذکرے
ثبت ہوتی زیست کے قرطاس پر مہر دوام
یہ بشارت ایک زریں عہدِ استقبال کی
کیا ہے خود تاریخِ انسانی کا اک روشن پیام

اُن کی دوسری طویل نظم 'ریاست' بھی ایک لحاظ سے نظم 'مورخ سے' کی توسیع کہنا چاہیے۔ اس نظم میں بھی ابتداء میں رومانوی انداز میں حیاتِ انسانی کی فطری افتاد اور خوش گوار کیفیات کا شعری بیانیہ خلق کیا گیا ہے۔ لیکن جب انسان نے فطری ارتقا کے بعد شعور کی اگلی منزلوں میں قدم رکھا تو ریاست وجود میں آئی۔ دور شہنشاہی نے طبقاتی سماج کو جنم دیا۔ اور سرمایہ و مزدور کی آویزش شروع ہوئی۔ آمریت اور ملوکیت نے سارے عالم میں انسانی قتل و غارت گری کو عام کیا ہے۔

آخر کار محنت کش عوام کے اتحاد نے آمریت اور شخصی حکومتوں کے خلاف اپنی بغاوت کو شدید کیا۔ یوں یہ نظم اشتراکیت کے ظہور اور سماجی مساوات کے تصور پر منتج ہوتی ہے۔ بقول شاعر

متحد ہو چکے ہیں وہ طبقے
جن کی محنت پہ راحتوں کا مدار
جن کے بڑھتے ہوئے قدم لینے
خود بخود دوڑتی ہے راہ گزار
سامنے جن کے دست و بازو کے
ایک جھٹکے کی تھی حکومت زار
جن کے آوازہ بغاوت سے
اصل جمہوریت ہوئی بیدار

نظم 'دانائے راز' جاں نثار اختر نے مکالماتی تکنیک میں لکھی ہے۔ یہ نظم اقبال کی 'خضر راہ' اور 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کی یاد دلاتی ہے۔ نظم میں دانائے راز، اجتماعی زندگی کا اصول، انسانی فکر و عمل، مادی نشو و نما، پیداوار کے آئین اور انسانی زندگی کے مختلف ادوار اور عصر حاضر کے بارے میں سوالات کرتا ہے۔ دانائے راز ان سوالات کے جوابات اسی تاریخی جدلیات اور اشتراکی فکر کے حوالے سے دیتا ہے اور آخر کار اشتراکیت کو تصور کرتا ہے۔ اس نظم پر اقبال کی ایک اور نظم 'ساقی نامہ' کے اثرات بھی واضح ہوتے ہیں۔ لیکن اقبال کی نظموں کو جو شعری کمال اور جاودانی حاصل ہوئی، جاں نثار اختر کی نظم اس سے محروم ہے۔ بیشتر ترقی پسند شعری سرمایے کی طرح جاں نثار اختر کی یہ نظمیں بھی اپنے عہد کی پیداوار تھیں۔ اقبال اپنے عہد میں اشتراکیت سے متاثر ضرور ہوئے تھے لیکن آخر کار انھوں نے اس نظریے کو رد کیا تھا۔ انھوں نے کارل مارکس کو یہودی فتنہ گر کہا ہے۔ اپنے معاصر ترقی پسند شعرا کی طرح جاں نثار اختر بھی اشتراکی نظریے کو نجات دہندہ اور تمام انسانی مسائل کا حل تصور کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو جاں نثار اختر نے نظم کے آخر میں اس نظریے کی کامیابی و کامرانی ظاہر کرنے میں اپنا زورِ قلم کسی طرح صرف کیا ہے ظاہر ہے کہ یہ شعری اظہار اپنے وقت میں بھی اتنا ہی غیر متعلق اور بے معنی تھا جیسا تھا کہ آج ہے۔

زندگی نے آج با جاہ و چشم — ایک دورِ نو میں رکھا ہے قدم
کھل گیا پیشانیِ عالم کا رنگ — جیت لی محنت نے سرمایے سے جنگ
اب نہیں وہ خون سے مے کی کشید — کوڑیوں میں زورِ بازوں کی خرید
رشتۂ افراد ہے یا آب و تاب — پیداور قوتوں کے ہم کاب
رنگِ پیداوار اب کچھ اور ہے — وقت کی رفتار اب کچھ اور ہے
کوہ و معدن، دشت و دریا، کوہسار — آلہ و اوزار و کشت و رد و بار
اجتماعی ملکیت ہے یہ زمیں — آج یہ تیری نہیں میری نہیں
آدمی کا آدمی سے اتحاد — آدمی کا آدمی پر اعتماد

ساز میں یہ نغمۂ جمہور ہے
زندگی آزاد ہے مسرور ہے

نظم 'پانچ تصویریں' مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس نظم پر اقبال کے 'ساقی نامہ' کے اثرات واضح ہیں لیکن فکری لحاظ سے یہ نظم بھی ترقی پسند تحریک کے نظریات کی ترجمان ہے۔ حیات انسانی کے مختلف ادوار کا سفر تاریخی جدلیات کے تحت پیش کرتے ہوئے اس کے اختتام اور انتہا سرخ انقلاب یعنی اشتراکیت پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک محدود زاویہ نگاہ ہے اور ایک مخصوص نظریہ کا پابند اقبال کے 'ساقی نامہ' کو جو دوامی اور جاوداں حیثیت حاصل ہے یہ نظم اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔ یہ ضرور ہے کہ جاں نثار اختر میں تخلیقی صلاحتیں غیر معمولی ہیں اور شعری بیانیہ پر بھی انھیں قدرت حاصل ہے لیکن ایک مخصوص نظریے سے وابستگی نے آزادی فکر کو ختم کیا ہے اُن کی نظر صرف مزدور محنت کش عوام پیداوار کے ذرائع استحصال، آمریت بادشاہت، طریقہ اور پھر ان سب کے نجات دہندہ اشتراکی انقلاب تک ہی دیکھتی ہے۔ مزدور اور محنت کش طبقے کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زمینوں کے ہمراہ بکتے غلام
وہ اُٹھتے ہوئے آدمیت کے دام
وہ ذوق ہوسِ ملکیت آفریں
وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی زمیں
گراں بار طبقے ابھرتے ہوئے
زمیں پر وہ صدمے گزرتے ہوئے
زمانے کے دامن میں پلتے تضاد
وہ سوتے میں کروٹ بدلتے فساد
فضا زہر آمیز ہوتی ہوئی
زمیں فتنہ انگیز ہوتی ہوئی

یہ سب گویا فضول اور مصرف ہے۔ یہ سب گویا مزدور کسان اور محنت کش طبقے کے استحصال کے ذریعے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھتے ہوئے مزید کہتے ہیں:

تفخر سے دیتے وہ مونچھوں پہ بل
وہ کھاتے کسانوں کی محنت کا پھل
وہ بھاری لگانوں پہ اٹھتی زمیں
زمیندار اُلٹے ہوئے آستین
بقایا چکاتے وہ مفلس کسان
وہ بکتے ہوئے ہل، مویشی مکان
وہ فاقوں سے مرتے ہوئے کاشتکار
کلیجوں میں جدتی ہوئی ہل کی دھار
وہ جاگے ہوئے ملکیت کے فساد
جماہی سی لیتے وہ ذاتی مفاد

استحصالی نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

ذرائع پہ قابض وہ سرمایہ دار
غریبوں کی محنت کا کرتے شکار
مظالم وہ حد سے گزرتے ہوئے
تصادم کے امکاں ابھرتے ہوئے
وہ ہر لمحہ تیور بدلتے فساد
وہ سرمایہ داری کے اپنے تضاد
وہ زائد ذخیرے جلاتی ہوئی
وہ خود آگ گھر میں لگاتی ہوئی

آخر کار محنت کش مزدور وعوام اس استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور اشتراکی سرخ انقلاب کے ذریعہ اس فرسودہ نظام کو بدل دیتے ہیں اور گویا اس نظام کا قیام تمام انسانیت کے لیے ذریعہ نجات ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فکر کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔ جاں نثار آگے مزید کہتے ہیں۔

وہ نشہ بغاوت کا چڑھتا ہوا
وہ اک سرخ طوفان بڑھتا ہوا
زمیں گل بدن، آسماں لالہ تاب
ابھرتا ہوا سرخ رو آفتاب

نظم کے آخر میں کہتے ہیں۔

عزائم کی زد پر وہ مریخ و ماہ
زمیں پر قدم، آسماں پر نگاہ
وہ پیہم نقابیں اُلٹتی حیات
وہ تسخیر ہوتی ہوئی کائنات
جھلکتا ہوا باہزاراں غرور
وہ فطرت کے ماتھے پہ انساں کا نور

ڈاکٹر قمر رئیس اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نظم میں ابتدا سے آخر تک روانی ہی نہیں حسن تناسب اور حسن تعمیر کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس بہاؤ اور زیر و بم میں نغمہ کی سی کیفیت ہے۔ اس کا موضوع بھی انسانی سماج کا ارتقا ہے۔ ابتدائی کمیونزم سے عصر حاضر کے اشتراکی سماج تک انسانی زندگی جن پانچ اہم ارتقائی مراحل سے گزری ہے۔ نظم میں خیال انگیز اشاروں کے ساتھ اُن کی الگ الگ تصویریں پیش کی گئی ہیں۔''

مذکورہ اقتباس سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اشتراکی نظریہ ہی گویا ساری انسانیت کے لیے نجات دہندہ ہے۔ بحیثیت مجموعی جاں نثار اختر کی یہ نظم اسی نظریہ کی ترجمان ہے اور انسانی زندگی کی تعبیر و تشریح اسی زاویہ سے کرتی ہے۔ جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے نظم میں حیات انسانی کا تاریخی، سماجی، معاشی اور تہذیبی و تمدنی ارتقا پانچ مختلف ادوار کے حوالے سے دکھایا گیا ہے اور ترقی پسند نظریے کے حوالے سے زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسی لیے یہ نظم ایک مخصوص نظریے کی ترجمان بن گئی ہے اور یہ نظم اسی تاریخی حیثیت کی حامل بن گئی ہے۔ شاعری میں جو لازمانی کیفیت ہونی چاہیے اس سے یہ نظم محروم ہے۔

نظم 'امن نامہ' مثنوی کی ہئیت میں لکھی گئی ایک دلچسپ شعری تخلیق ہے۔ اس نظم میں اقبال کے 'ساقی نامہ' کی طرح ساقی سے خطاب ہے۔ اور عصری، سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ساقی سے گفتگو ہے۔ دراصل یہ نظم عالمی طور پر انسانی اخوت اور اتحاد و اتفاق کی بے مثل شعری تخلیق ہے۔ نظم کے عنوان 'امن نامہ' سے ہی ظاہر ہے کہ عالمی طور پر امن و امان اور انسانی اخوت کا خواہشمند ہے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے نصف اول میں دنیا نے دو عالمگیر جنگوں کی ہولناکیوں کی تباہ کاریوں دیکھا ہیں۔ بقول شاعر

جہاں میں غلامی کا عنواں ہے جنگ
لیے برق و فولاد و آہن کا زور
دہکتا یہ شعلہ دہکتی یہ آگ
لگاتی ہے اس گلستاں میں یہ آگ
سراسر ہلاکت کا ساماں ہے جنگ
مچاتی ہوئی قتل و غارت کا شور
جلا جس میں دنیا کا برسوں سہاگ
لگائی ہے اس نے بیاباں میں آگ

ظاہر ہے کہ جنگ کا یہ بازار اور کاروبار دنیا کی بڑی طاقتیں اپنے مفادات کے تحفظات کے لیے جاری رکھتی ہیں۔ برطانوی سامراج نے دنیا کے بڑے حصے پر اپنی نو آبادیات قائم کر کے حکومت کی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ نے جاپان پر ایٹمی بم گرا کر انسانیت کا ہلاکت خیز نظارہ دیکھا۔ لیکن شاعر ان سب انسانیت سوز واقعات کو بھلا کر اب عالمی امن کا خواہش مند ہے۔

بھلا دیں کہو ہیرو شیما کی بات
ہر اک شور و شر آج بے سود ہے
رہے امن ہر آدمی کے لیے
نہ دھونا پڑے اپنی جانوں سے ہات
کہ اب امن دنیا کا مقصود ہے
رہے امن محنت کشی کے لیے

نظم کے اگلے حصے میں شاعر نے ہندوستان اور اس کی عظیم روایات سے اپنی غیر معمولی محبت کا اظہار کیا ہے۔ عہد قدیم سے لے کر مختلف تاریخی ادوار میں ہندستان کی سماجی، تہذیبی، معاشی، ثقافتی اور علمی و ادبی روایات کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔ اُردو شاعری میں حُبِّ وطن کے موضوع پر جاں نثار اختر کی نظم شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ بیانیہ شاعری کا یہ دلچسپ اظہار ہے۔ اس سلسلے کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

پلا ساقیا خانۂ بادہ ساز
محبت ہے خاک وطن سے ہمیں
ہمیں اپنی صبحوں سے شاموں سے پیار
ہمیں پیار اپنے ہر اک گاؤں سے
ہمیں پیار اپنی عمارات سے
کہ ہندوستاں پر رہے ہم کو ناز
محبت ہے اپنے وطن سے ہمیں
ہمیں اپنے شہروں کے ناموں سے پیار
گھنے برگدوں کی گھنی چھاؤں سے
ہمیں پیار اپنی روایات سے
اُٹھا جام، ہاں دور ساقی رہے
جہاں میں صدا امن باقی رہے

اسی طرح مختلف مظاہرات کا بیان کرتے ہوئے آخر میں دنیا میں امن کے قیام کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

خوشا میکدے کی بہاریں رہیں
صراحی سے ساغر رہے متصل
سلامت ترا جام و مینا رہے
مچلتی یہ مئے کی پھواریں رہیں
نہ ٹوٹے کبھی تیرے شیشوں کا دل
بڑے لطف کے ساتھ پینا رہے

غرض جاں نثار کی یہ نظم امن عالم اور قومی یکجہتی کے لحاظ سے ایک شاہ کار تخلیق کہی جا سکتی ہے۔ اُن کو بیانیہ شاعری پر بے مثل قدرت حاصل ہے۔ طویل نظم کے امکانات کو شاعر نے برتنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مخصوص نظریے سے وابستگی کے سبب اُن کے پاس اظہاری پابندیاں یقیناً تھیں، اگر چہ اُن کے شعری مزاج میں رومانویت کے عنصر کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

■

Dr. Siddiq Mohiuddin, Dept of Urdu
Dr. Babasaheb Ambedkar Marathwada University, Aurangabad 431004 (MS)
Cell. No: 90961557937

صفی لکھنوی
اپنے دور کا ایک ممتاز شاعر

حکیم عبدالناصر فاروقی

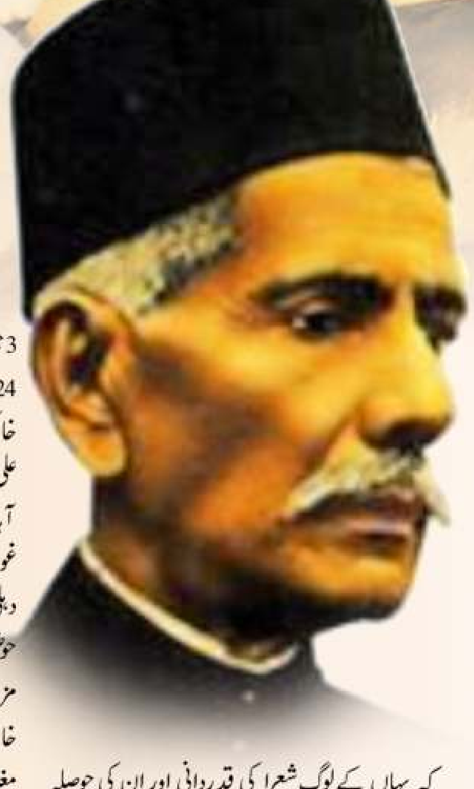

دہلی اور دکن کی طرح لکھنؤ بھی کسی زمانے میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا عظیم مرکز سمجھا جاتا تھا۔ دہلی کا دبستان شاعری جب زوال پذیر ہوا تو یہاں کے نابغۂ روزگار ادبا و شعرا نے لکھنؤ کے خوشگوار ماحول کی طرف رخ کیا اور وہ یہاں جوق در جوق آکر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اس طرح دہلی اور لکھنؤ میں علم و ادب کی محفلوں کو فروغ حاصل ہوا۔ یہاں شاعری کا ایک عام ماحول پیدا ہوا اور مشاعروں کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ نوابین اودھ اور عوام الناس کی خوش حالی اور فارغ البالی کے سبب یہاں اردو تہذیب و تمدن اور تاریخی ثقافت کو محفوظ رکھنے کے خوب مواقع میسر آئے۔ لکھنؤ کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ یہاں کے ماحول کے مطابق زبان کی ادائگی، سلاست، نزاکت، الفاظ کی نوک پلک کو سنوارنے اور ان میں سوز و گداز پیدا کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی جس کی وجہ سے لکھنؤ کی شاعری کو ایک عظیم مرتبہ حاصل ہوا۔ یہاں شاعروں، ادیبوں اور نثر نگاروں کی ایک کھیپ ہمیشہ موجود رہی ہے جنھوں نے اپنے کمال فن سے لکھنؤ اور ملک کی فضا میں حب الوطنی، اخوت اور محبت کا ایسا رَس گھولا جس کی مٹھاس آج بھی محسوس کی جارہی ہے۔ ان سب عوامل نے عوامی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے لوگ شعرا کی قدردانی اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹے جس کی وجہ سے شعر و شاعری اور اردو ادب کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

لکھنؤ کے دبستان شاعری میں صفی لکھنوی کا نام ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی شاعری میں جو شیرینی، تنوع، لطافت، شگفتگی، برمحل لفظوں کا استعمال اور سادگی دیکھنے کو ملتی ہے اس سے لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے۔ صفی کی یہی خوبیاں انھیں لکھنؤ سے وابستہ دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو اپنے عہد کا ایک عظیم شاعر تصور کیا جاتا ہے۔

صفی لکھنوی جن کا اصل نام سید علی نقی زیدی تھا۔ 3 جنوری 1862 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں ہی 24 جون 1950 کو ان کی وفات ہوئی اور ان کے جسد خاکی کو غفراں مآب کے امام باڑے کے قریب راجہ نواب علی کے مقبرے کے صحن میں سپرد خاک کیا گیا۔[1] ان کے آبا و اجداد غزنی کے رہنے والے تھے جو شہاب الدین غوری (1160-1206) کے ساتھ ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی۔ نظام الدین اولیا کے قریب حوض شمسی کے گرد و نواح میں ان کے بزرگوں کے مزارات اب بھی موجود ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد یہ خاندان دہلی کے مضافاتی علاقہ پنگوڑ منتقل ہوگیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد صفی کے پردادا سید احسان علی نے جاٹوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر پنگوڑ کو چھوڑا اور فیض آباد آگئے لیکن شجاع الدولہ (1732-1775) کی وفات کے بعد آصف الدولہ (1748-1797) نے جب لکھنؤ کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو صفی کے دادا سید سلطان حسین (وفات 1317ھ/ 1899ء) بھی لکھنؤ چلے آئے اور یہاں نواب امجد علی شاہ (1801-1847) کے شاہزادہ ولی عہد مرزا سلیمان قدر کے اتالیق کی خدمت پر مامور ہوئے۔[2]

صفی کی ابتدائی تعلیم 5 برس کی عمر میں بسم اللہ سے ہوئی۔ ابتدا میں فارسی اور عربی درسیات مولوی احمد علی اور

چچا سید حسین سے جو ایک نامور حکیم تھے، حاصل کیں۔ کاکوری کے مولوی شمس الدین سے بھی استفادہ کیا۔ اپنے چچا سے اصول طب سیکھا لیکن اسے ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ کیننگ کالیجیٹ لکھنؤ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1879 میں لال اسکول اور پھر کیننگ کالج کی برانچ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہوئے، پھر 1871 میں اترپردیش گورنمنٹ کے محکمہ دیوانی میں سرشتہ دار کے عہدہ پر ملازم ہوئے اور اس سلسلے میں رائے بریلی، سلطانپور اور پرتاپ گڑھ وغیرہ میں قیام کرنا پڑا مگر ملازمت کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ میں ہی گزرا اور یہیں سے 1917 میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد عرصے تک آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ مئی 1940 میں سو روپے ماہوار کا وظیفہ نواب رامپور نے مقرر کیا جو تا عمر جاری رہا۔[3]

صفی نے 13 سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے اس فن میں اتنی ترقی کی کہ تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل کرلی۔ صفی کی شاعری 1877 سے 1950 تک آٹھ دور سے گزری اور انھوں نے 1877 سے لے کر اپنی آخری عمر تک لکھنؤ کی بزم ادب کو اپنے فن اور وجود سے رونق بخشی۔

ڈاکٹر عبدالوحید 'جدید شعرا اردو' میں صفی کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:[4]

''صفی کی ذات ان مبارک ہستیوں میں سے تھی

صفی کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ بہت زیادہ موجزن تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو قومی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں اس کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ان کی یہ نظمیں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دردناک بھی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں قابل ذکر ہیں جن میں شہروں کے تاریخی مقامات کا بیان اور معروف عمارتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں الہ آباد، بمبئی اور جونپور وغیرہ پر ان کی نظمیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ 'تتلی' پر بھی ان کی ایک نظم بہت مقبول ہوئی۔ مذکورہ مقامات کا ذکر کرتے وقت ان میں اتنی لطافت اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی ہوبہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔

جنھوں نے لکھنؤ کی اردو شاعری کا رخ بدلا اور غزل کے لیے نئی عمارت تیار کی۔ انھیں شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا لیکن کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انھوں نے اپنے ہی وجدان و ذوق شعر کی رہنمائی میں اس فن کی ترقی کی اور ترقی بھی ایسی کہ بہت جلد صفی کا شمار لکھنؤ کے ممتاز شعرا میں ہونے لگا۔''

صفی کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ایک عام آدمی کی فہم اور لیاقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے بہت ہی سادہ اور شیریں الفاظ میں اشعار کو پیش کیا اور اس کی خوبصورتی کو کسی بھی طرح سے کم نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کے یہاں ان کی شاعری کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس سلسلے میں کسی استاد سے مدد نہیں لی۔ اس بات کا تحریری ثبوت کہیں سے نہیں ملتا کہ وہ کسی کے شاگرد تھے۔ شوکت تھانوی (1904-1963) نے بھی انھیں تلمیذ الرحمٰن کہا ہے لیکن مرزا جعفر حسین ادیب کا کہنا ہے کہ صفی لکھنوی نے علی میاں کامل کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا لیکن شہرت حاصل کرنے کے بعد ان کی شاگردی سے انکار کردیا۔[5] اس زمانے میں شعرا اپنے کلام کی اصلاح کسی نہ کسی سے ضرور کرایا کرتے تھے۔ صفی کی شاعری میں ایک خاص قسم کی ندرت اور اصلاحی لب و لہجہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں قومی درد پایا جاتا ہے۔ صفی کو اردو اور فارسی زبانوں پر مکمل طور پر عبور حاصل تھا اور اردو محاوروں کا وہ برمحل استعمال کرتے تھے۔ شاعری کا کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں صفی نے طبع آزمائی نہ کی ہو لیکن افسوس ہے کہ خانوادہ صفی میں کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو میدانِ شاعری میں ان کی جانشینی کا فخر حاصل کرسکے۔

صفی لکھنوی نے لکھنؤ کے شعری مزاج سے ہٹ کر شاعری کی اور ان کا یہی انفرادی پہلو ان کی شخصیت کا ایک دلکش سبب بنا۔ مولانا حسرت موہانی (1875-19515) انھیں مصلح طرز لکھنؤ کہا کرتے تھے۔[6] صفی تحت اللفظ اور ترنم دونوں لہجوں میں اشعار پڑھتے تھے۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انجمن بہار ادب کا انھیں صدر بھی نامزد کیا گیا تھا۔ ان کی مثنوی 'تنظیم الحیات' شاعری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی جس پر ہندوستانی اکادمی الہ آباد نے 500 روپے کا انعام بھی عطا کیا تھا۔ انھیں کئی بار طلائی تمغے بھی پیش کیے گئے۔ قومی نظموں کے اعتراف میں انھیں 'لسان القوم' کا لقب دیا گیا۔ صفی کی شاعری روایتی شاعری سے بالکل الگ تھی۔ انھوں نے روایتی غزلوں کے بجائے نظم لکھنے کو زیادہ ترجیح دی۔ حب الوطنی سے متعلق ان کی نظمیں آج

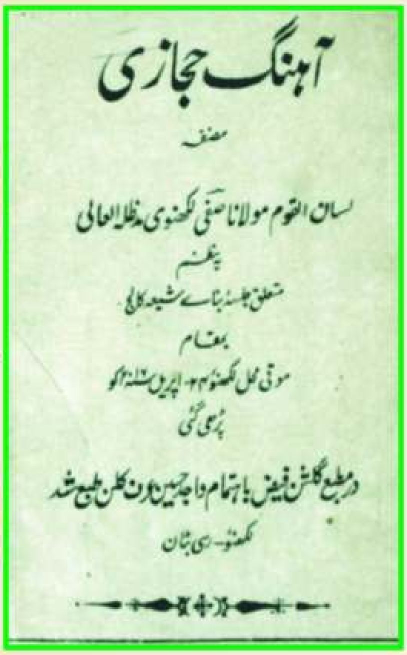
آہنگ حجازی
مصنفہ
لسان القوم مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی
یہ نظم
متعلق جلسہ ہائے شیعہ کالج
بمقام
موتی محل لکھنؤ [illegible]
پڑھی گئی
درمطبع گلشن فیض باہتمام [illegible] طبع شد
لکھنؤ [illegible]

بھی بہت مقبول ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے اس زمانہ کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظموں کے علاوہ انھوں نے قصیدے، سلام، نوحہ، مثنوی اور رباعی بھی لکھیں۔ صفی کی شاعری کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کی شاعری میں ایک نمایاں تبدیلی لانے کے خواہش مند تھے۔

ڈاکٹر عبدالوحید صدیقی صفی کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوّل غزلیات، دوم: منظومات۔ ان کے الفاظ میں:[7]

''جہاں تک غزل کا تعلق ہے صفی نے لکھنؤ کے بجائے شعرا دہلی کی اتباع کی۔ بڑی صفائی اور پرزور انداز میں نظم کرنے کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بیان کی سادگی وہ جوہر ہے جس نے صفی کی غزل کو امتیازی شان عطا کی۔ انھیں اہل زبان ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ سادہ و سلیس زبان میں روزمرہ کی چاشنی دے کر انھوں نے اپنی شاعری میں چار چاند لگا دیے۔ وہ محاورات وتشبیہات کو برمحل اور خوبصورت تراکیب کے ساتھ پیش کرتے تھے اور ترکیبوں کو مصرعوں کے سانچے میں ڈھالنے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے کے بعد کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ شعر میں قصداً لائی گئی ہیں۔ صفی نے مغربی خیالات کو اردو زبان میں پیش کرکے نہ صرف ندرت سے کام لیا بلکہ اردو ادب میں خیالات کا اضافہ بھی کیا۔ وہ عصر حاضر کے مختلف مسائل کو اپنی غزلوں میں اس خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں کہ ان میں اجنبیت کا احساس باقی نہیں رہتا اور نہ ہی وہ غزل کی

زبان و بیان پر بار محسوس ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے رقیبوں کا ذکر اپنے اشعار میں نہیں کرتے اور نہ ہی شیخ و برہمن پر طنز کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی غزل میں عصر حاضر کے مذاق سے بڑی حد تک مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ غزلیات کی تمام خصوصیات سے متصف ہونے کے باوجود صفی کا طبعی رجحان نظموں پر ہی تھا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں دلکشی کو برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ان کی نظمیں پڑھنے والوں پر بار محسوس نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شگفتگی بیان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔''

صفی کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ بہت زیادہ موجزن تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو قومی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں اس کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ ان کی یہ نظمیں سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دردناک بھی ہیں۔ ان میں وہ نظمیں قابل ذکر ہیں جن میں شہروں کے تاریخی مقامات کا بیان اور معروف عمارتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں الہ آباد، بمبئی اور جونپور وغیرہ پر ان کی نظمیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ 'تتلی' پر بھی ان کی ایک نظم بہت مقبول ہوئی۔ مذکورہ مقامات کا ذکر کرتے وقت ان میں اتنی لطافت اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے کہ ان کی ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالوحید مزید لکھتے ہیں:

''ان طولانی نظموں کی بدمزگی دور کرنے کے لیے جہاں کہیں تغزل کا رنگ پیدا کیا ہے وہاں پڑھنے یا سننے والے کی زبان سے بے ساختہ تحسین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ بعض جگہ انھوں نے ایسے مواقع پر مزاح سے بھی کام لیا ہے اس طرح کہ نظموں کی متانت و سنجیدگی کو ٹھیس نہیں لگنے پائی اور شگفتگی میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔''

صفی چونکہ طبِ یونانی سے بھی شُد بُد رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ایک طویل نظم میں طب یونانی کے ماضی کی داستان پر پراثر انداز میں روشنی ڈالی ہے اور طب ویدک سے اسے ہم آہنگ بتایا ہے۔ یہ نظم ویدک اور یونانی کانفرنس میں پڑھی گئی تھی۔ [9] صفی کو قطعات تاریخ پر بھی مہارت حاصل تھی۔ کس حروف کے عدد لینے ہیں اور کس کے نہیں اس کے بارے میں اکثر ان سے سوالات پوچھے جاتے تھے۔ اس کے بارے میں اپنے خطوط میں انھوں نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس طرح علم موسیقی پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ اس کا اظہار بھی انھوں نے اپنے بعض خطوط میں کیا ہے۔ [10] لکھنؤ کے مشہور شاعر عزیز لکھنوی (1882-1935) کے استاد ہونے کا شرف

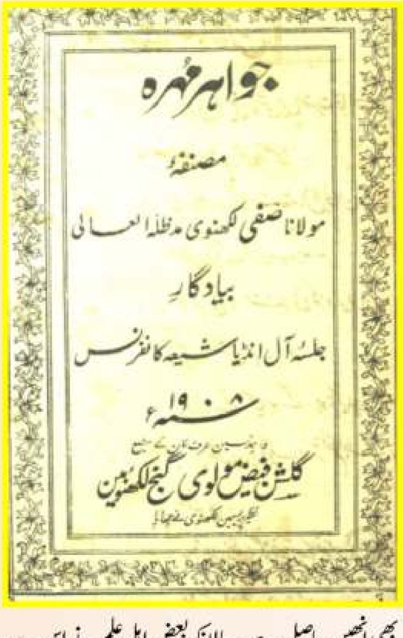
جواہر مہرہ
مصنفہ
مولانا صفی لکھنوی مدظلہ العالی
بیادگار
جلسہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس
۱۹۰۸ء
گلشن فیض مولوی گنج لکھنؤ میں

بھی انھیں حاصل ہے۔ حالانکہ بعض اہل علم نے اس سے اختلاف ظاہر کیا ہے لیکن صفی نے نظم اور نثر دونوں میں واضح طور پر لکھا ہے کہ عزیز ان کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی نے اپنی کتاب میں بعض دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عزیز کا صفی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ [11]

پروفیسر ولی الحق انصاری (وفات 29 جنوری 2013) صفی لکھنوی اور ان کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: [12]

''عہد ملا کے ابتدائی دور کے معاصرین میں صفی لکھنوی اور چکبست لکھنوی وہ حضرات ہیں جنھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور سے حالی کا نظریہ شعر قبول کیا یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حالات بھی کچھ ایسے ہو چکے تھے کہ تنگنائے غزل سے باہر آکر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کرنے کے لیے نظموں کا سہارا لینا پڑا۔ چکبست وطنی شاعر تھے اور صفی ملی.... چکبست، صفی، عزیز اور مرزا ہادی رسوا وغیرہ نے غزل کے مضامین میں وسعت اور تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی بلکہ میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ یہی حضرات تھے جنھوں نے حسرت، فانی اور اصغر سے بھی پہلے غزل کو معنوی آہنگ بخشا اور لطافت زبان کے ساتھ ساتھ روشن خیالی اور ندرت اظہار کو بھی غزل کا لازمی جز بنا دیا۔ چکبست کی شاعری اگر جذبہ وطنیت کی آئینہ دار ہے تو ان کے معاصر صفی کی شاعری پاکیزہ عشق کی کیفیتوں اور ملی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔''

تصانیف اور علمی آثار

صفی لکھنوی صاحب تصنیف و تالیف شاعر تھے۔ انھوں نے شعر و ادب پر بڑا وقیع سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ زائر حسین کاظمی نے اتر پردیش اردو اکادمی کی خواہش پر کلام صفی کا ایک مختصر مگر جامع انتخاب مرتب کیا ہے۔ صفی نے باقاعدہ ملی نظمیں 1917 میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کہنا شروع کیں۔ ان نظموں میں قومی عناصر کے ساتھ ساتھ ملکی اور سیاسی عناصر بھی شامل ہیں۔ نظموں کا ایک حصہ 'لخت جگر' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ صفی کی ایک مثنوی 'تنظیم الحیات' ہے جو اکانومی آف ہیومن لائف کی جانب سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے فارسی کلام کا مجموعہ اور کافی تعداد میں متفرق نظمیں اور ایک دیوان بھی طبع ہو چکا ہے۔ عظیم شاعرہ بلبل ہند سروجنی نائیڈو (1879-1949) کی نظم 'شب شہادت عظمیٰ' کا ترجمہ بھی صفی کے قلم کا رہین ہے۔ [13] عمر خیام (1048-1131) کی 1236 فارسی رباعیوں کا منظوم ترجمہ بھی صفی نے کیا تھا جس کا مسودہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ [14]

(1) انتخاب کلام صفی: 128 صفحات پر مشتمل یہ صفی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جسے سید زائر حسین کاظمی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں حروف تہجی کے اعتبار سے غزلوں کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1983 میں اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع ہوئی ہے۔

(2) آہنگ حجازی: 10 صفحات پر مشتمل یہ ایک نظم ہے جسے جلسہ بنائے شیعہ کالج میں 24 اپریل 1916 میں پڑھا گیا۔ یہ مطبع گلشن فیض بہ اہتمام واجد حسین عرف کلن سے شائع ہو چکا ہے۔

(3) جواہر مہرہ: یہ 34 صفحات پر مشتمل صفی کی ایک نظم ہے جو جلسہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس 1908 میں پڑھی گئی اور گلشن فیض مولوی گنج لکھنؤ کے نظیر پریس سے شائع ہوئی۔

(4) دیوانِ صفی مع خلاصہ مقدمات: 204 صفحات پر مشتمل یہ کتاب ممتاز حسین جونپوری کی ادارت میں 1952 میں شائع ہوئی جس میں صفی کی شاعری اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔ اس میں ممتاز حسین جونپوری کے علاوہ مرزا جعفر علی خاں، سید کلب، عباس نقوی، علامہ اختر تلہری، سید احتشام حسین اور سید شہنشاہ حسین کے مقدمات شامل ہیں۔

(5) دیوانچی: یہ 624 صفحات پر مشتمل ظریف لکھنوی کا کلیات ہے جسے صفی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب 1949 میں صفدر پریس کیننگ اسٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوچکی ہے۔ اس کے حصہ اوّل میں غزلیات، حصہ دوم میں

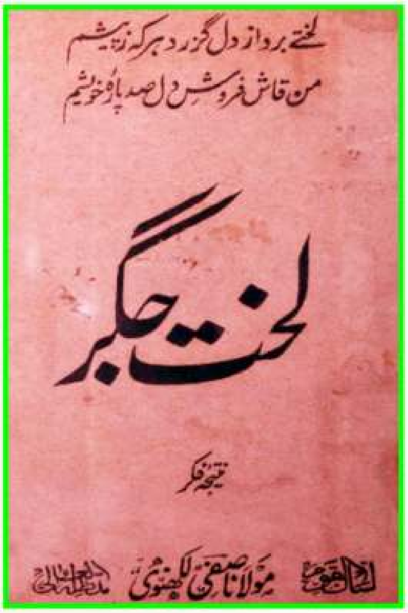

متفرق اشعار اور حصہ سوم میں منظومات شامل ہیں۔

(6) صحیفۃ القوم: 208 صفحات پر مشتمل یہ صفی کی نظموں کا مجموعہ ہے جو 1907 سے اپریل 1916 تک شیعہ کانفرنس اور شیعہ کالج سے متعلق ہے جسے خود صفی نے مرتب کیا ہے۔ یہ مطبع میتھوڈسٹ پرنٹنگ ہاؤس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

(7) صحیفہ: یہ 186 صفحات پر مشتمل صفی کی یاد میں سید زائر حسین کاظمی کا مرتب کردہ تنقیدی مضامین و نظموں کا مجموعہ ہے جو سرفراز پریس لکھنؤ سے دسمبر 1974 میں شائع ہو چکا ہے۔

(8) لختِ جگر: یہ 367 صفحات پر مشتمل نظموں کا مجموعہ ہے جو آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور اس کی ادارت سے متعلق ہے۔ اسے صفی لکھنوی نے مرتب کیا ہے اور نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔

(9) مکاتیب صفی: یہ 177 صفحات پر مشتمل صفی کے خطوط کا مجموعہ ہے جسے سید زائر حسین کاظمی نے مرتب کیا ہے اور یہ سرفراز پریس لکھنؤ سے 1988 میں شائع ہو چکا ہے۔

(10) منظومات صفی (حصہ اوّل): یہ 162 صفحات پر مشتمل صفی کی نظموں کا مجموعہ ہے جسے سید زائر حسین نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب اتر پردیش اردو اکادمی سے مارچ 1977 میں شائع ہو چکی ہے۔

نمونہ کلام: ذیل کے سطور میں صفی کے اشعار کو بطور نمونہ نقل کیا جا رہا ہے جو صفی کی قادرالکلامی اور الفاظ کے بہترین استعمال کی مہارت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

ہم نشینی غیر کی اس بزم میں کام آ گئی
ہم تک بھی ایک جام شراب آ ہی گیا

——

کل ہم آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروان عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

——

میری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

——

کوئی زہر پی بھی لیتا تو وہ دل لگی سمجھتے
کوئی جان دے بھی دیتا تو نہ اعتبار ہوتا

——

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
یہ شکوے دل کی بے تابیوں سے
ہر انجام میں رنگ آغاز دینا

——

دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ
رخ ادھر بھی کبھی اے عمر گریزاں کرنا
دم تعبیر صد افسوس نہ سمجھے یہ صفی
گھر کا آباد ہی کرنا تو ہے ویراں کرنا

——

الٰہی زندگی کیا، موت کیا، بیمار ہجراں کی
پریشاں خواب وہ، تعبیر یہ خواب پریشاں کی

——

وہ کیوں در پردہ میرے چاک پیراہن پہ ہنستے ہیں
ذرا آئینہ لانا دیکھ لوں صورت گریباں کی
صفی حکم رہائی مل چکا پھر کیوں توقف ہے
مگر زنداں سے کنجی کھو گئی ہے قفل زنداں کی

——

پیغام زندگی نے دیا موت کا مجھے
مرنے کے انتظار میں جینا پڑا مجھے

——

بناوٹ ہو تو ایسی ہو کہ جس سے سادگی ٹپکے
زیادہ ہو تو اصلی حسن چھپ جاتا ہے زیور سے

——

دیکھے بغیر حال یہ ہے اضطراب کا
کیا جانے کیا ہو پردہ جو اٹھے نقاب کا

——

غم نقد حیات لوٹنے کو ہے
یہ رشتۂ عمر ٹوٹنے کو ہے
پیری میں کمر جھکی تو کیا دم کا قیام
اب تیر کماں سے چھوٹنے کو ہے

مولانا ماہرالقادری (1978-1907) نے ماہنامہ 'فاران' کراچی اپریل 1951 کے شمارے میں صفی لکھنوی کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ سے اپنی تعزیت کا اظہار کیا تھا:15

''حضرت صفی لکھنوی نغز گو شاعر ہی نہیں مستند استاد بھی تھے۔ ان کے شعر زبان کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صفی کے دم سے سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ کی عزت قائم تھی — اور یہ میں نے 'قائم تھی' کیا کہا اب بھی قائم ہے کہ صفی دنیا سے چلے گئے مگر ان کا کلام زندہ ہے۔''

حواشی

1. دیباچہ انتخاب کلام صفی، ص 9
2. جدید شعراء اردو، ص 257
3. دیباچہ انتخاب کلام صفی، ص 1 تا 9
4. جدید شعراء اردو، ص 257
5. دیباچہ انتخاب کلام صفی، ص 7
6. https.//www.rekhta.org.
7. جدید شعراء اردو، ص 257
8. ایضاً، ص 258
9. ایضاً، ص 263 تا 265
10. نقوش خطوط نمبر جلد سوم ص 338
11. عزیز لکھنوی، حیات اور کارنامے، ص 88
12. http/libbazmeurdu.net
13. بوستان عقیدت۔ کربلا اور غیر مسلم شعراء، ص 112
14. دیباچہ انتخاب کلام صفی، ص 8
15. یادرفتگاں، حصہ اوّل، ص 373

کتابیات

(1) انتخاب کلام صفی، مرتبہ: سید زائر حسین کاظمی، اتر پردیش اردو اکادمی، 1983
(2) بوستان عقیدت (کربلا اور غیر مسلم شعرا)، مرتبہ: نور احمد میرٹھی، بزم اردو لائبریری، ادارہ فکر نو، کراچی 2007
(3) جدید شعراء اردو، چیف اڈیٹر، ڈاکٹر عبدالوحید، فیروز سنز پرنٹر پبلشر سیلرز اینڈ اسٹیشنر
(4) عزیز لکھنوی - حیات اور کارنامے، طبع اوّل، ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ردولوی، نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ، 1984
(5) مکاتیب صفی، مرتبہ: سید زائر حسین کاظمی، سرفراز پریس لکھنؤ، 1988
(6) یادرفتگاں، جلد اوّل، ماہرالقادری، مکتبہ نشان راہ، نئی دہلی، 1985

Hakeem Abdun Nasir Farooqui
Sadar Shobaye Jarrahat
Ayurvedic and Unani Tibbia College
Ajmal Khan Road, Block 5
Karol Bagh, New Delhi - 110055

ڈپٹی نذیر احمد کے مکتب میں سائنس کی تعلیم

شاداب تبسم

دنیائے اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد کو ناول نگار کی حیثیت سے اولیت حاصل ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے نثر نگار، ماہر زبان داں، مترجم، مقرر اور عالم تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سعادت علی سے حاصل کی لیکن دلی کالج کی تعلیم نے انھیں مولوی نذیر احمد سے ڈپٹی نذیر احمد اور صحیح معنوں میں جدید افکار سے روشناس کرایا۔ دہلی کالج میں ان کی تعلیم کا زمانہ 1845 سے 1854 تک تھا۔ یہاں انھوں نے عربی، فلسفہ، سائنس وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ دوران ملازمت الہ آباد میں انگریزی بھی سیکھ لی۔

ڈپٹی نذیر احمد ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ معاشرتی اصلاح بالخصوص عورتوں کی اخلاقی تربیت میں گہری دلچسپی تھی۔ جدید تعلیم کی تبلیغ اور اصلاح نسواں ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ راست پندو نصائح کا طریقہ مؤثر نہیں ہوسکتا اس لیے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے مذہبی اور اخلاقی کتابیں تحریر کیں۔ ایک ماہر نفسیات کی طرح قصے اور کہانیوں کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ بنات النعش، مراۃ العروس، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، ابن الوقت، رویائے صادقہ اور ایامیٰ جیسے ناول لکھے۔ ان تمام ناولوں کا مقصد مجموعی طور پر فرسودہ خیالات کو رفع کرنا اور نئے تقاضوں کے تحت داخلی رویوں میں تبدیلی پیدا کرنا تھا۔ ناول 'ابن الوقت' اور 'رویائے صادقہ' میں نذیر احمد انگریزی تعلیم اور تہذیب کے زیر اثر فروغ پانے والے جدید تہذیبی رویوں کے غلبے کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف ناول 'بنات النعش' میں لڑکیوں کے لیے مکتب کھول کر اس میں امور خانہ داری اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ مغربی علوم اور سائنسی ادراک سے ہندستانی سماج بالخصوص مسلم خواتین کو روشناس کرانے میں دیگر افراد کے ساتھ نذیر احمد بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جس دور میں اسکول کے نظام کی کوئی صورت گری نہیں ہوئی تھی اور لڑکیوں کے لیے اسکول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نذیر احمد نے ناول 'بنات النعش' میں لڑکیوں کے لیے مکتب کھول کر تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ اختیار کیا۔

جدید تعلیمی تحریک کی مرکزی حیثیت تو سرسید احمد خاں کی تھی مگر ان کے رفقا میں نذیر احمد کا حصہ سرسید کے بعد سب سے زیادہ نظر آتا ہے۔ سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ دونوں قدیم تعلیم سے بیزار اور جدید تعلیم کے حامی تھے۔ 1862 میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام بھی مغربی علوم کو ورنا کیولر میں منتقل کرنے کے مقصد سے عمل میں آیا تھا۔ اس سوسائٹی کو سرسید تحریک کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ اس کے تحت انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام شروع ہوا تو مندرجہ ذیل مضامین کا انتخاب کیا گیا۔

حرکیات (Mechanics) برقیات (Electronics)، ریاضی (Mathematics)، فلسفۂ قدرت (Natural Philosophy) اور جدید زراعت (Agriculture) وغیرہ۔

سائنس لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی علم کے ہیں یعنی تجربات و مشاہدات کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کو سائنس کہتے ہیں۔ یوروپ میں انیسویں صدی سے سائنس کا زریں دور شروع ہوتا ہے اس لیے اخلاق اور امور خانہ داری کے ساتھ سائنس کی تعلیم کے پیش نظر ناول 'مراۃ العروس' میں ڈپٹی نذیر احمد ناول کے کردار اصغری کے ذریعہ لڑکیوں کے لیے ایک مکتب قائم کراتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی پاسبانی، ان کی فلاح و بہبود اور اس سے زیادہ ان کی تعلیم و تربیت کے جذبات نذیر احمد کے قلب میں موجزن تھے۔ اگرچہ اس کا نقطۂ آغاز ان کی اپنی بیٹیوں کی تعلیم تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے مقصد کو اس طرح پھیلایا کہ اس کے فوائد نے اجتماعی صورت اختیار کرلی اور اصغری کے مکتب کی تصویر کشی کرکے اس کی عملی شکل ہمارے سامنے پیش کی ہے۔

ناول 'بنات النعش' کا کردار معلمہ اصغری میں علم کے اعتبار سے اتنا وزن اور وقار ہے کہ وہ ابتدائی درجات کے بچوں کو مذہب اور اخلاق جیسے علوم کے ساتھ ابتدائی سائنس، حساب، جغرافیہ اور تاریخ جیسے علوم کو اعتماد کے ساتھ پڑھا سکتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد چاہتے تھے کہ گھر کے

اخراجات، لین دین، آمد و خرچ وغیرہ کے حساب کتاب میں خواتین کو کسی کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ اس لیے مکتب میں معلّمہ ریاضی جیسے خشک مضمون کی ایک شاخ حساب (Arithmatics) کی تعلیم دلچسپ انداز میں دیتی ہے۔ جس سے لڑکیاں ریاضی کی طرف راغب ہوں۔ ناول 'بنات النعش' کے ایک باب 'حساب کی دلچسپ باتیں' سے چند مثالیں پیش ہیں:

محمودہ: کیوں کلثوم تین اور سات اور نو مل کر کے ہوتے ہیں؟

کلثوم: انیس

محمودہ: اور بھلا آٹھ اور چھ اور دو۔

کلثوم: سولہ''[1]

محمودہ: اچھا زبیدہ تم کلثوم سے زیادہ بڑی ہو۔ بھلا بتاؤ بارہ لڑکیاں اگر ہنڈکلھیا میں تین تین پیسے کا ساجھا ملائیں تو سب کے آنے ہوں گے

زبیدہ: نو آنے

محمودہ: ڈیڑھ سیر میں اگر چھ لڑکیوں کے برابر حصے لگائے جائیں تو ہر ایک لڑکی کو کتنا کتنا پہنچے گا۔

زبیدہ: پاؤ پاؤ بھر''۔[2]

مکتب میں نہ صرف جوڑنا، باقی نکالنا، ضرب، تقسیم ہی نہیں بلکہ رقبہ (Area)، حجم (Volume) اور اربعہ متناسبہ (Property of ratio and proportion) کا قاعدہ بھی سکھایا جاتا ہے۔ مثلاً

محمودہ: بھلا یہ بتاؤ کہ یہ دالان جس میں ہم سب بیٹھے ہیں چھ گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا ہے، چاندنی میں کتنا مارکین خرچ ہوگا؟

رابعہ: اور مارکین کا عرض

محمودہ: یہی معمولی گز بھر۔

زبیدہ: پورے پندرہ گز۔

محمودہ: ایک سوال بتاؤ تو تم کو بڑی شاباشی دیں۔ یہ بڑی مسجد کا حوض چھ گز مربع ہے یعنی لمبان چوڑان برابر۔ اور دو گز گہرا اور ایک گز مربع میں تین مشک پانی آتا ہے اور ایک مشک میں پچیس لوٹے اور ایک لوٹے میں پندرہ گلاس اور ایک گلاس میں آدھ پاؤ پانی تو سارے حوض میں کتنا پانی ہوا''۔[3]

معلّمہ محمودہ جامع مسجد کی مینار کو بغیر گز، بغیر رسی اور مینار کے اوپر جائے بغیر ناپنے یعنی سایہ (Shade) کے ذریعے لمبائی ناپنے کی بابت متعدد سوالات قائم کرتی ہے تو ہاجرہ اربعہ متناسبہ کے قاعدے سے قطب صاحب کی لاٹ ناپنے کے تعلق سے کہتی ہے:

''ہاجرہ: ابھی ایک بڑی آسان بات ہے۔ ایک تنکا لے کر اس کو ناپ لیا۔ پھر اس کو دھوپ میں کھڑا کر کے اس کے سایہ کو ناپ لیا، پھر لاٹ کے سایہ کو ناپ ڈالا تو اربعہ متناسبہ کے قاعدے سے جو تم کو معلوم ہے لاٹ کا لمبان نکل آئے گا۔ اس طور پر کہ اپنے لمبے تنکے کا سایہ اس قدر لمبا پڑتا ہے تو لاٹ جس کا سایہ اتنا لمبا ہے کتنی اونچی ہوگی۔''[4]

معلّمہ اصغری کی ساس حرف شناس نہیں تھیں۔ اس لیے ان کو ماما عظمت جیسی عورت تباہ کرتی چلی گئی۔ معقول آمدنی کے باوجود خاندان تنگ دستی میں مبتلا رہا۔ لیکن اصغری کے گھر کا حساب کتاب رکھنے سے اندازہ ہوا کہ موجودہ آمدنی سے گذر بسر آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا خیال تھا کہ خواتین روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والی ضرورتوں کے لیے کسی کی محتاج نہ رہیں۔ ان بنیادی باتوں کے علاوہ انھوں نے خواتین کے لیے اوپری درجے کی تعلیم کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس لیے مکتب میں ان موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جنھیں حقائق اشیاء کا علم کہہ سکتے ہیں۔ سائنسی علوم میں حساب کے علاوہ علم جرثقیل کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً محمودہ کہتی ہے:

محمودہ: علم جرثقیل میں اسی قسم کی ہزاروں باتیں ہیں۔ حکمت بڑی چیز ہے۔ اکیلا آدمی حکمت کے زور سے ہزاروں من کا بوجھ تنکے کی طرح اٹھا کر پھینک دے۔''[5]

ڈپٹی نذیر احمد لڑکیوں کو صرف گھر کی چار دیواری میں محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی خواہش تھی کہ خواتین کو علم کی روشنی حاصل ہو اور ان کے دماغ روشن ہوں۔ اس لیے ناول میں حساب اور علم جرثقیل کے علاوہ زمین کی کشش، وزن مخصوص، ہوا کا دباؤ، کشش، مقناطیس، زمین کی گردش، خوردبین، جغرافیہ، سمندر کے منافع، بجلی، بادل وغیرہ کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں۔

زمین کی کشش یا کشش ثقل (Gravity) یعنی جب کوئی چیز آسمان کی طرف اچھالتے ہیں تو وہ واپس زمین پر آ کر گرتی ہے دراصل ثقل وہ پُر اسرار طاقت ہے جو ہر چیز کو زمین کی طرف کھینچتی ہے۔ سب سے پہلے اسحاق نیوٹن (Issac Newton) نے سترہویں صدی میں ریاضی کے ذریعے اجسام کی کشش کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ان کا یہ نظریہ قانون تجاذب (Law of Gravity) کہلاتا ہے۔ کشش ثقل کے بارے میں محمودہ حسن آرا کو بتاتی ہے:

''جتنی چیزیں ہیں سب کو زمین اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جو چیز اوپر کو پھینکتے ہیں، کچھ دور تک تو پھینکنے والے کے زور اور زبردستی سے اوپر چلی جاتی ہے پھر آخر زمین کی کشش اس کو نیچے کھینچ لاتی ہے۔ پتھر کو اوپر پھینکو اور دیکھتی رہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ جوں جوں اوپر جاتا ہے اس کی چال سست اور دھیمی ہوتی جاتی ہے اور پھر جو الٹتا ہے تو تیر کی طرح زمین کی طرف دوڑتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ چیزیں زمین کی کشش کے مارے اوپر کو نہیں جانا چاہتیں اور جاتی بھی ہیں تو زبردستی اور بڑی مشکل سے۔''[6]

باب 'وزن مخصوص' کے تحت تیرتے مائعات (Liquids) یعنی ایک مائع چیز دوسرے مائع پر کیوں تیرتی ہے۔ یہ قاعدہ آرکمیڈیز (Archimedes) کی دریافت ہے جسے کثافت (Density) کہتے ہیں۔ محمودہ پانی اور تیل کی مثال دے کر حسن آرا کو سمجھاتی ہے کہ تیل کی کثافت کم ہونے کی وجہ سے تیل پانی کے اوپر تیرتا ہے:

''کوئی چیز ہلکی ہے کوئی بھاری۔ جتنی ہلکی چیزیں ہیں خود بخود اوپر آ جاتی ہیں۔ مثلاً گلاس میں اول تیل ڈال دیجیے، اس کے اوپر پانی۔ تو چوں کہ تیل پانی کی نسبت ہلکا ہے خود بخود اوپر آ جائے گا۔''[7]

طالبات کے فہم و بصیرت میں اضافے کے لیے باب 'ہوا کا داب' (Air Pressure) میں استانی محمودہ اور حسن آرا کے درمیان موضوع پر گفتگو مکالمہ اور مذاکرہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ہوا میں وزن ہے تو کیسے، خالی بوتل میں ہوا ہے تو کس طرح۔ غرض اسی نوعیت کے استفسارات کے تسلی بخش جواب دیے جاتے ہیں۔ معلّمہ یہ سمجھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ دھواں بھی ہوا سے ہلکا ہونے کے سبب اوپر کو ہی جاتا ہے۔

'کشش اتصال' (Force of Attraction) باب کے تحت ذکر کیا جاتا ہے کہ کل چیزیں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اس کے ساتھ مقناطیس (magnet) جو میگنیس (Magnes) کی دریافت ہے، پر بھی سیر حاصل گفتگو ہوتی ہے کہ مقناطیس کیا ہے اور کس طرح لوہے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ مقناطیسی کشش کی مناسبت سے زمین کی گولائی اور آفتاب کے گرد گھومنے کا ذکر کرتے ہوئے محمودہ شاگردہ کو اس بات سے آگاہ کرتی ہے کہ کشش کی وجہ سے زمین گیند کی طرح آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہے۔

'خوردبین' (Microscope) یعنی بصری آلہ جس کے ذریعہ انتہائی چھوٹے اجسام جن کو آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ استانی خوردبین کا استعمال کرتی ہیں تو شاگردہ مکتب میں حیرت و استعجاب کے انداز میں کہتی ہے:

''بدن کے رونگٹے رونگٹے میں چھید مکھی تو دیکھو ہزاروں لاکھوں آنکھیں اور پروں میں اتنے رنگ۔ افوہ ہوا میں اتنے بھنگے۔ الہ اکبر پانی میں بلا کے کیڑے شیشہ تو عجب طلسمات کا شیشہ ہے۔''[8]

باب ''رنگ'' میں رنگوں کے بکھراؤ کے تعلق سے

عام معلومات فراہم کرتی ہے۔ اور سمجھاتی ہے کہ آسمان میں نکلنے والی رنگین کمان قوس قزح (Rainbow) کس طرح بنتی ہے۔ رنگوں کے بیان پر مشتمل ایک کتاب الماری سے نکال کر شاگردہ کو پڑھنے کے لیے دیتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو پھٹے ہوئے بادل میں چاند بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن جب بادل نہیں ہوتا تو چاند میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ اس تعلق سے مکتب کی لڑکیوں کے ذہنوں میں پنپنے والے سوالات کا جواب استانی اس طرح وضاحت کے ساتھ دیتی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ متحرک چیزوں میں 'آنکھ کا غلطی کرنا' باب کے تحت نہایت ہی تفصیل کے ساتھ تمام باتوں کو اس انداز سے بیان کرتی ہے کہ عام ذہن رکھنے والی لڑکیاں بھی آسانی سے سمجھ سکتی ہیں۔ کہتی ہے:

محمودہ: ''میں بتادوں یہ بھی آنکھ کی ایک غلطی ہے۔ ہوا بادل کو اڑائے لیے چلی جاتی ہے اور بادل چل رہا ہے، ہم کو ایسا نظر آتا ہے کہ گویا چاند بھاگ رہا ہے۔''9

'زمین گول ہے' اس بات کی دریافت کا سہرا جان سبسٹین (John Sebastian) اور فرڈینینڈ میگلن (Ferdinand Magellan) کے سر باندھا جاتا ہے۔ مکتب کی استانی زمین کی جسامت، ہیئت اور تقسیم پر بات کر کے شاگردہ حسن آرا کو سمجھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ زمین گول ہے۔ انداز بیان اتنا دلکش اور دلچسپ ہے کہ ثقیل کی باتیں بھی ذہن پر بار نہیں معلوم ہوتیں۔

موجودہ دور میں بدلتی ہوئی آب و ہوا ایک سنگین عالمی مسئلہ ہے۔ ماحولیاتی آلودگی سے نجات پانے کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر مختلف اقدامات کیے جارہے ہیں لیکن آلودگی خواہ وہ ہوا کی ہو، پانی کی ہو یا شور کی ہو، بڑھتی آبادی کے سبب خطرناک شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ ناول 'بنات النعش' میں ڈپٹی نذیر احمد نے اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شہر و دیہات کی آب و ہوا کی آلودگی کے اسباب اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ معلّمہ کے ذریعہ جغرافیہ مثلاً کرۂ ارض کا نقشہ دکھا کر لڑکیوں کو اس کی معلومات فراہم کراتے ہیں۔ سمندر کے فائدے بیان کرنے کے ساتھ بارش، روشنی اور رفتار کی معلومات فراہم کی جاتی ہے کہ کس طرح بھاپ سے بادل اور بادل سے بارش ہوتی ہے اور کس طرح ہوا کی نسبت روشنی کی رفتار تیز ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ موسیمات (Climatology) کی بنیادی معلومات مکتب میں دی جاتی ہے۔

اجرام فلکی (Celestial Bodies) کی بناوٹ اور علم ہیئت پر بات کرتے ہوئے استانی کہتی ہیں:

''جن کتابوں میں چاند اور سورج اور ستاروں کا بیان ہوتا ہے وہ علم ہیئت کی کتابیں کہلاتی ہیں۔''10

سورج کے سامنے زمین کی اپنے محور پر گردش کے سبب دن اور رات وجود میں آتے ہیں۔ زمین کی یہ گردش لاکھوں اربوں سالوں سے اسی طرح قائم ہے۔ اس لیے ایسا ممکن نہیں کہ سال کے مختلف دنوں میں دن اور رات کے جو اوقات ہیں ان میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی آسکے۔ حسن آرا استانی سے غروب آفتاب کے بعد دھوپ کے نہ ہونے کا سبب دریافت کرتی ہے تو استانی دن اور رات کے تعلق سے بیان کرتی ہے:

''زمین گول ہے جس طرف سے آفتاب کے سامنے ہوتی ہے وہاں دن ہوا اور دوسری طرف اندھیرا جس کو رات کہتے ہیں''۔11

مکتب میں زمین سے آفتاب اور ستاروں کی دوری، ان کی گردش وغیرہ کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ توہم پرستی کی وجہ سے مدرسے کی شاگردہ سورج گہن (Solar Eclipse) اور چاند گہن (Lunar Eclipse) کو عذاب الٰہی کہتی ہے تو استانی اس کا وہم دور کرنے کی غرض سے رسالہ 'سیر آسمان'' پڑھنے کی تاکید کرتے ہوئے سورج گہن اور چاند گہن کے بارے میں بتاتی ہے:

''جب سورج اور چاند کے بیچ میں زمین آپڑے گی، چاند گہن ہوگا اور جب سورج اور زمین میں چاند حائل ہوگا تو سورج گہن۔''12

ناول 'بنات النعش' میں اصل توجہ سائنس کی عام معلومات یا بنیادی باتوں پر مرکوز کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان موضوعات پر بھی گفتگو کی گئی ہے جن سے اخلاق کی درستی مقصود ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو دہلی کالج میں دوران تعلیم سائنسی علوم میں بہت زیادہ دلچسپی نہ رہی اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ادب کے مطالعے میں صرف کیا۔ کالج میں علوم کیمیا و طبعیات کے اسباق و تجربات مختلف آلات کے ذریعے سکھائے جاتے تھے۔ نت نئے انکشافات، سائنس کے تجربے اور مشاہدے طلبا کے لیے حیرت و مسرت کا باعث ہوتے تھے۔ سائنس سے بے توجہی کے باوجود اساتذہ اور ہم جماعتوں کے مسابقت کے جذبے کی بدولت انھوں نے سائنسی علوم میں کافی دست گاہ بہم پہنچائی۔ ان کے خطبات اور خطوط سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے دقیق مسائل ان کے ذہن میں آخری وقت تک محفوظ رہے۔ ڈپٹی نذیر احمد سائنس کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے لکچر بتاریخ 2 دسمبر 1888 میں کہتے ہیں:

''سائنس نے ایسا سر اٹھا رکھا ہے کہ زور جسمانی اور بہادری اور پہلوانی کسی کی کوئی حقیقت باقی نہ رہی۔''13

ایک خطبے میں ساحل پر موجوں کے زور و شور اور سمندر کے اندرونی سکون کا سبب بیان کیا ہے اور علم طبیعات کے اس مسئلے کو نقشہ بنا کر سمجھایا ہے اور ایک خطبے میں قوم کے عروج و زوال کے ضمن میں بطور مثال پتھر کے اوپر پھینکنے اور نیچے گرنے پر اس کی حرکت صعودی اور حرکت ہبوطی کی رفتار کا فرق بھی سمجھایا ہے۔ سائنس کی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ نذیر احمد کے ذہن میں زندگی اور کائنات کے عام حقائق کا صحیح شعور اور ادراک پیدا ہوا۔ اسی شعور کا پیدا ہونا تعلیم کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ڈپٹی نذیر احمد نے ناول 'بنات النعش' میں سائنس کی عام معلومات کو دلچسپ اور مربوط انداز میں قصے کے پیرائے میں ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی ہے۔ سائنس اور تکنیک کے موجودہ دور میں یہ باتیں ہمارے لیے اہم نہ ہوں لیکن آج سے تقریباً ایک سو پچاس سال پہلے یہ باتیں بالخصوص خواتین کے لیے تعجب خیز تھیں۔ ان سے نہ صرف معلومات میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ بہت سے توہمات بھی دور ہوئے۔ آخر میں حسن آرا استانی سے کہہ اٹھتی ہے:

''جتنی باتیں آپ نے فرمائیں سب مرے دل نے قبول کیں۔ اور علم بڑی دلچسپ چیز ہے اور میں رسالہ 'سیر آسمان' ضرور پڑھوں گی۔''14

مصنف نے ناول کے مختلف کرداروں کے ذریعے نہ صرف علم بلکہ علوم جدیدہ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ مستورات کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے میں آسانی ہو اور ان کا ذہن علوم و فنون کے سیکھنے کی طرف مائل ہو۔ غرض ڈپٹی نذیر احمد نے اصغری کے مکتب کو مثالی مکتب کی شکل میں پیش کیا ہے۔

حواشی:

1: بنات النعش، ڈپٹی نذیر احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2013، ص 52
2: ایضاً، ص 53
3: ایضاً، ص 54
4: ایضاً، ص 55
5: ایضاً، ص 43
6: ایضاً، ص 58
7: ایضاً، ص 59
8: ایضاً، ص 67
9: ایضاً، ص 69
10: ایضاً، ص 139
1: ایضاً، ص 141
12: ایضاً، ص 144
13: لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ: مولوی بشیر الدین احمد، جلد اول، مفید عام پریس آگرہ، ص 54، 1918
14: بنات النعش، ص 143

Shadab Tabassum
PDF, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

نیر مسعود کی افسانہ نگاری

عریشہ تسنیم

اردو ادب میں 1970 کے بعد جن افسانہ نگاروں کی واضح شناخت قائم ہوئی ان میں نیر مسعود (پ: 16 نومبر 1936، و: 24 جولائی 2017) کا نام بھی آتا ہے۔ نیر مسعود اعلیٰ درجہ کے محقق، مترجم اور نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی شہرت کی خاص وجہ ان کے وہ افسانے ہیں جو چار مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مجموعے سیمیا، عطر کافور، طاؤس چمن کی مینا اور 'گنجفہ' کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں روایتی بیانیہ سے الگ ہٹ کر اسے مغربی پیرائے اظہار دے کر پیش کیا ہے۔ نیر مسعود کے بیش تر افسانے ان کے خواب میں نظر آئے زماں اور مکاں سے پرے نقوش، عوامل یا واردات کے عکس ہیں جنھیں لفظی جامہ پہنا کر افسانہ یا قصہ کا روپ دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے کہ خواب اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری کے دل پر بھی ویسے ہی احساسات واثرات مرتب ہوں جو مصنف کے دل پر ہوئے۔ اس کے لیے موقع کے اعتبار سے صحیح الفاظ کا انتخاب کرنا، جملوں کو ایسے ترتیب دینا جس سے نقوش ابھر کر سامنے آئیں اور کم سے کم اور عام فہم الفاظ کا استعمال کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب ان کے اسلوب کی غیر معمولی خصوصیات ہیں۔ نیر مسعود کے افسانے چونکہ ان کے خوابوں سے تراشیدہ ہوتے ہیں اس لیے عموماً ان کے افسانوں کا کوئی موضوع پہلے سے طے نہیں ہوتا۔

ساگری سین گپتا سے انٹرویو کے دوران انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ ''میری کہانیوں میں، بلکہ پوری زندگی میں خوابوں کا بہت بڑا کردار ہے۔ بعض خواب تو اس قدر مربوط، گویہ پورے بنائے افسانے کے طور پر دیکھے۔ بہت لمبے خواب بھی دیکھے..... قسطوں میں کوئی خواب نہیں دیکھ سکا ہوں اب تک بار بار دکھائی دینے والے خواب بھی دیکھے۔ یہ تو سبھی کے ساتھ ہوتا ہے کہ کوئی ایک یا دو خواب بار بار دکھائی دیتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں؟''1

نیر مسعود ہر اعتبار سے ادب کی ایک پروقار شخصیت ہیں لیکن جس چیز نے انھیں عالمی سطح پر شہرت اور مقبولیت دلائی وہ ان کے افسانے ہیں۔ افسانوں میں بھی ان کا وہ خاص اسلوب جس کے لیے نیر مسعود پہنچانے جاتے ہیں۔ اسی خاص اسلوب کی وجہ سے ان کے افسانے اتنے مشہور ہوئے۔ ہندوستان اور بیرون ملک میں بھی ان کے افسانوں کے مداحوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ یہ افسانے انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دور دور تک پھیلے اور انھیں بھرپور داد و تحسین حاصل ہوئی۔ ان کے افسانوں کے منفرد اور متنوع موضوعات اور ان میں پوشیدہ معنی خیزی اور اسرار کے عنصر کی وجہ سے مغربی ممالک کی ادبی دنیا ان سے متاثر ہوئی۔ انگریزی میں ان کے افسانوں کو موضوع بنا کر کئی چھوٹے بڑے مضامین لکھے گئے، ان میں سب سے اہم تحریریں محمد عمر میمن کی ہیں جو University of Wiscosin, Madison کے پروفیسر ہیں۔ ان کے علاوہ ایلی زبیتھ بیل (Elizabeth Bell)، محمد سلیم الرحمٰن، زینو (صفدر میر) اور مظفر علی سید کی تحریریں بھی نیر مسعود کی افسانہ نگاری سے متعلق ہیں۔ ان تحریروں سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ نیر مسعود کو بیرون ملک میں کتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو میں ان کی افسانہ نگاری کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی بیرون ممالک میں دی گئی۔

نیر مسعود کی افسانہ نگاری سے متعلق کچھ نامور دانشوروں کی رائیں مندرجہ ذیل ہیں:

(i) ''نیر مسعود کی ایک اپنی نجی دنیا ہے جسے وہ اپنے نفس (اپنی ہستی) کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ یہ آئینے سے جھانکتے ہوئے عکسوں، ابہامات اور بیک وقت نمایاں اور دھندلی بے خیالوں کی دنیا ہے جو اپنے خلا کے کھنچاؤ سے ہمیں پراسمیاں بھی کرتی ہے۔ ماضی یہاں مسلسل حال پر مسلط رہتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں معنی پیدا کرنے کی ہر کوشش کی تادیب بھی کرتا رہتا ہے۔''

(Elizabath. Bell)[2]

(ii) ''نیر مسعود کی کہانیاں بنیادی طور پر اپنی ہیئت کے لحاظ سے تجدد پسند اور مواد کے لحاظ سے روایت پسند کہی جاسکتی ہیں۔ ان کہانیوں میں صرف ''وقوعے'' ہیں۔ (ان میں) رسمی معنوں میں کہانیاں نہیں ہیں۔''[3]

(زینو: The Fiction of Past as Present)

ان جائزوں اور تاثرات کے ساتھ اگر ان متفرق رایوں کو بھی شامل کرلیا جائے جن کا اظہار ان کی کہانیوں کے انگریزی تراجم کی اشاعت کے بعد کیا گیا تو ایک دلچسپ اور الجھی ہوئی تصویر رونما ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مارکس (Globe Correspondant) نے کہا کہ یہ کہانیاں (عطر کافور) ماورائی اشاروں اور نفسیاتی حرارتوں کے ایک چابکدست آمیزی کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ نیر مسعود کی (قاری کے احساسات کو) گرفت میں لے لینے والی مافوقیت (Supernaturalism) کی دور افتادگی اپنے حقیقی (اور صداقت پر مبنی) ہونے کا اثر پیدا کرتی ہے، جسے برآمد (Export) کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔

Elle Mazazine کے مطابق:

''یہ کہانیاں ایک جادوئی قالین کے گنجان دھاگوں سے بنی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ گویا کہ مجموعی اعتبار سے یہ کہانیاں ایک اجنبی، نادیدہ مگر پرکشش حقیقت اور ایک ایسی دنیا کی تشکیل کرتی ہیں جو ہمارے لیے ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔''[4]

افسانوی مجموعہ عطر کافور کا پہلا افسانہ 'مراسلہ' ہے۔ اس میں پلاٹ بظاہر سیدھا سادہ معلوم ہوتا ہے لیکن افسانے کو آخر تک پڑھنے پر بھی قاری کہانی کی مختلف کڑیاں جوڑ کر اسے قصے کی شکل دینے میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ نیر مسعود کے فن کی ایک بڑی خصوصیت ہے کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا پلاٹ بھی کئی معنوی جہات کا حامل ہوتا ہے۔ افسانہ 'سلطان مظفر کا واقعہ نویس' میں پلاٹ کافی الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں صحرا جس میں سلطان مظفر کا بغیر چھت کا مقبرہ ہے، قلعہ جس میں ہیولائی قسم کے کردار رہتے ہیں اور صحرائی مہم وغیرہ کا بیان ہے۔ واقعہ نویس کا بیان بڑے پر اثر انداز میں ہوا ہے جس سے قاری عجب طرح سے اس میں جکڑا رہتا ہے۔

اس میں کئی کردار ہیں۔ مثلاً سلطان مظفر، واقعہ نویس، صحرائی عورت وغیرہ کا ذکر ہے۔ نیر مسعود کے یہاں پلاٹ کا باضابطہ التزام نہیں ملتا۔ بہ الفاظ دیگر انھوں نے وحدت تاثر اور مربوط پلاٹ پر استوار یک رخے افسانے لکھنے سے احتراز کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ ابھرے نہیں ہوتے بلکہ اصلی پلاٹ سے ذیلی پلاٹ نکلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ذیلی پلاٹ ان کے اصلی پلاٹ پر حاوی ہوجاتے ہیں، لیکن ان کا یہ فنی کمال ہے کہ اختتام کے وقت اس کا اصلی پلاٹ پھر کسی نہ کسی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور تمام ذیلی پلاٹ کے نقوش دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ذیلی قصوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے افسانوں میں بھول بھلیاں کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، جس سے پڑھنے والے کا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے اور کہانی کی اصل روح تک پہنچنے کے لیے بڑی ژرف بینی درکار ہوتی ہے۔

نیر مسعود کے زیادہ تر افسانوں میں محض کسی ایک قصے کا بیان نہیں ملتا بلکہ اس سے جڑے اور قصوں کا بیان بھی شامل رہتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ 'اوجھل' میں نو عمر واحد متکلم کے جنسی تجربات کے بیان کے علاوہ مکان کے معائنوں کا ذکر، ایک نا معلوم تیمار دار اور غرقاب دوشیزہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ 'نصرت' میں مرکزی کردار کی کہانی کے علاوہ بدکار عورت اور بوڑھے جراح کا بیان ہے۔ 'سلطان مظفر کا واقعہ نویس' میں سلطان کی صحرائی مہم، مقبرہ کی تعمیر کا حال، ایک دوشیزہ سے سلطان کے تعلقات اور پھر ایک زہریلے درخت کا ذکر ہے۔ 'عطر کافوز' میں کافوری چڑیا، عطر سازی کے مختلف مراحل اور پھر ماہ رخ سلطان اور اس کی نامعلوم بیماری کا بیان ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ذیلی قصوں کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے پیچیدگی اور مبہم سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ البتہ یہ کیفیت پیدا کرنے کا شعوری مقصد شاید یہ ظاہر کرنا ہے کہ دنیا اصل میں مترادفات کا مجموعہ ہے۔ اسی فلسفے کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اپنے افسانے تحیر خیزی، بے مرکزیت، بھول بھولیوں والے پلاٹ اور فضا اور کردار کے عجوبے پن سے خلق کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو محض بیان سے بھول بھلیاں کا تاثر پیدا کردیتے ہیں مثلاً:

''پھر میں پھاٹک کے اندر داخل ہوگیا۔ مجھے ہر طرف دیواریں ہی دیواریں نظر آئیں۔ آگے پیچھے بنی ہوئی اونچی دیواریں مختلف زاویوں سے ایک دوسرے کے قریب آتیں، پھر دور ہوجاتیں۔ سب سے اونچی دیواریں سب سے پیچھے تھیں۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں اٹھائی گئی تھیں اور یہی دور سے چھت کا فریب دیتی تھیں۔''[5]

بورخیس کی طرح نیر مسعود نے بھی بھول بھلیاں کی تمثیل اپنے افسانوں میں کثرت سے استعمال کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ معاشرتی وسماجی تصورات کی مضحکہ خیزی کو اجاگر کرنے کے لیے بھی انھوں نے متعدد ذیلی قصوں کو بیک وقت بیان کیا ہے تاکہ اس میں چھپے ہوئے عناصر کی نشاندہی کی جاسکے۔ سہیل وحید سے ایک انٹرویو میں نیر مسعود اپنی کہانیوں کے موضوع کے متعلق فرماتے ہیں:

''میں موضوع کے بارے میں سوچتا نہیں ہوں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کہانیاں مبہم ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہانی میں آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ ضمنی موضوعات بہت سے ہوتے ہیں لیکن بنیادی موضوع کوئی ایک نہیں ہوتا۔ بعض کہانیوں میں ہے لیکن عام طور پر کہانیوں کا کوئی موضوع نہیں ہے۔ ضمناً تمام موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کو چاہے میری کمزوری سمجھ لیجیے کہ موضوع بنا کر کہانی نہیں لکھ پاتا ہوں۔''[6]

دو مختلف افسانوں کے درمیان ارتباط قائم کرنے کا ہنر، وہ ہنر ہے جس میں نیر مسعود کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ایک افسانے کی تفصیلات/واقعات کو دوسرے افسانے میں ہنرمندی سے اس طرح شامل کرتے ہیں کہ افسانہ خود اپنے آپ میں مکمل ہونے کے باوجود ایک دوسرے متن کی تشکیل میں بھی شریک ہوتا ہے۔ مثلاً 'جانوس' میں ایک شخص افسانے کے راوی کو کہتا ہے کہ وہ یہیں لکھنؤ کا رہنے والا ہے اور یہاں نواب سہراب کی حویلی اس کے خاندان کی تھی جواب اس کی نہیں ہے۔ 'جانوس' میں اس مفلوک الحال شخص کی صرف ایک شناخت بتائی گئی ہے کہ اس کا رنگ بہت کالا تھا۔ اب اس مجموعے کے دوسرے افسانے 'جرگہ' میں ایک منظور صاحب نامی شخص نے ایک پرانی حویلی خرید کر اسے پھر سے بازتعمیر کے بعد اس میں پہلی دعوت کی ہے۔ کوٹھی کے سامنے محمد میاں کی چائے کی دکان میں موجود ایک شخص ہے جس کا رنگ سیاہ ہے اس کوٹھی کی بازتعمیر کا حال بیان کررہا ہے۔ اس گفتگو میں سیاہ رنگ والا شخص بتاتا ہے اس کوٹھی کا سامنا ایسا نہیں جیسا کہ اصل عمارت میں تھا۔ پھر مکالمے کے دوران محمد میاں اس سے پوچھتا ہے۔

''تو تمھیں پتہ ہے حویلی کا سامنا کیسا تھا؟''

''مجھے پتہ نہیں ہوگا'' دوسرے آدمی نے دھیرے سے کہا اور محمد میاں اچانک افسردہ نظر آنے لگا۔ ''سچ کہا خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہیں رہنے کا ٹھکانہ ہوا''؟ میری مانو تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔''[7]

سیاہ رنگ والا یہ شخص جسے چائے والا 'نواب' کہہ کر مخاطب کرتا ہے 'جانوس' کا وہی اجنبی ہے جو کانپور سے واپس لکھنؤ آ گیا ہے اور جس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا تھا کہ اس کی آبائی کوٹھی وہی ہے جسے منظور صاحب نے خرید لی۔

افسانوی مجموعہ 'عطر کافوز' کی اشاعت (1990) کے بعد چوتھے مجموعے 'گنجفہ' اشاعت (2008) میں 'پاک ناموں والا پتھر' کے عنوان سے ایک افسانہ شامل ہے۔ اس میں پاک ناموں والے پتھر کو راوی کا خاندانی نشان بتایا گیا ہے ''جس کی خاطر خون بہا ہے۔'' اس افسانے میں وہ استاد بھی موجود ہے جس نے 'وقفہ' میں راوی کو پڑھایا تھا اور 'طاہرہ بی بی' بھی جنھوں نے 'وقفہ' میں راوی کو ایک لڑکی کے ذریعہ استاد کے مرنے کی خبر اور ایک سرخ رومال میں رکھی کنجیاں بھجوائی تھی۔ اس خاندانی نشان کا ذکر نیر مسعود نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے کے پہلے افسانے 'اوجھل' میں بھی کیا ہے۔ مثال:

''میری روانگی سے کئی دن پہلے جب میرے گلے میں پاک ناموں والا پتھر ڈالا گیا، جو میرے خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آرہا تھا، تو میری بیزاری اور بڑھ گئی۔''[8]

نیر مسعود کے افسانوں کا فنی جائزہ لینے پر پتا چلتا ہے کہ نیر مسعود نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے افسانوں میں وقوعہ کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے لسانی اظہار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں بیانیہ معروضی ہونے کے ساتھ اس میں ممکنہ تمام امکانات کی گنجائش، قول محال کا استعمال، ایک کہانی میں کئی ذیلی قصوں کی موجودگی جس کے نتیجے میں بھول بھلیاں جیسی کیفیت اور ریاضیاتی توازن یعنی ایک ایک جزو کا باریکی سے تذکرہ وغیرہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تکنیک کے سلسلے میں نیر مسعود بورخیس سے متاثر ہیں اور اسی لیے اپنے افسانے ''جانوس'' کے سرنامہ کے طور پر انھوں نے بورخیس کا ایک قول "The world, unfortunately is real" تحریر کیا ہے۔

نیر مسعود کے افسانوں میں جابجا میجکل ریلزم کی جھلک بھی ملتی ہے اور قاری جب ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی عجوبے، کسی جادوئی دنیا میں پہنچ گیا ہے یا خوابوں کی دنیا میں سیر کررہا ہے جہاں کشش بھی ہے، خوف کا عنصر بھی ہے اور زندگی اور مناظر کے کئی معنی دیتے اشارے بھی۔ میجکل ریلزم کی کارفرمائی نیر مسعود کے افسانوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات میں دیکھے جاسکتے ہیں:

1۔ ''دھوپ میں تیزی آگئی تھی اور اب کچی سڑک کے آثار بھی ختم ہوگئے تھے، البتہ گرد آلود پتیوں والے درختوں کی دو رویہ مگر ٹیڑھی میڑھی قطاروں کے درمیان

اس کا تصور کیا جا سکتا تھا، لیکن اچانک یہ قطاریں اس طرح منتشر ہوئیں کہ سڑک ہاتھ کے پھیلے ہوئے پنجے کی طرح پانچ طرف اشارہ کرکے رہ گئی۔ یہاں پہنچ کر میں تذبذب میں پڑ گیا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے بہت دیر نہیں ہوئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے محلے سے بہت دور نہیں ہوں، پھر بھی میں نے وہاں پر ٹھہر کر واپسی کا راستہ یاد کرنے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گرد آلود پتیوں والے درخت اونچی نیچی زمین پر ہر طرف تھے۔ میں نے ان کی قطاروں کے درمیان سڑک کا تصور کیا تھا لیکن وہ قطاریں بھی شاید میرے تصور کی پیداوار تھیں، اس لیے کہ اب ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔''9

2۔ ''اس کی نظر اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھی لیکن یقیناً میں اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا''۔10

3۔ ''اگلے موڑ پر اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی اس کے بعد درختوں اور ٹیلوں کے درمیان وہ بار بار نظر آتا اور غائب ہوتا رہا اور اب ہر جھلک کے ساتھ اس کی شائستگی نمایاں ہو رہی تھی اور ہر جھلک کے ساتھ اس کی کہنگی دور ہو رہی تھی۔''11

نیر مسعود کے افسانوں میں میجکل ریلزم کے عناصر پر گفتگو کرتے ہوئے کچھ ادیبوں نے اپنی رائیں اس طرح ظاہر کی ہیں۔

عتیق اللہ اپنے مضمون میں فرماتے ہیں:

''نیر مسعود کے ذہن کی پرداخت بھی ہماری کلاسیکی داستانوں اور مثنویوں کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اسی باعث قدیم سے رشتہ جوڑ کر جدید کی مانوسیت کو انھوں نے نامانوسیت میں بدلنے کی سعی کی ہے۔ جس ماحول اور باغ کو انھوں نے پیش کیا ہے وہ کتاب سے حاصل کردہ تجربے کے طور پر ان کے ذہن کے اندر اور بہت اندر تہہ نشست ہے۔ جس نے اب محض ایک اسرار اور ایک گم شدہ خزانے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیر مسعود کے اکثر افسانوں میں ایک گم شدہ تہذیبی اور طلسمی سیاق وسباق، ایک ڈراونے خواب میں بدل جاتا ہے۔''12

مہدی جعفر نے نیر مسعود کے علامتی بیانیہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

''ان کے افسانے 'کافکا' اور 'پو' جیسے فن کاروں سے قریب مگر ''جوائس'' وغیرہ کی فن کاری سے فاصلے پر ہیں۔ ان کے چند افسانوں میں میجک ریلزم کی کارفرمائی ہے۔ دیوندر اسر کی حقیقت پر مبنی Magic Realism کے برخلاف نیر مسعود کی میجک ریلزم خواب ناک علامتوں پر استوار ہے۔ جب کہ سریت دونوں کے یہاں موجود ہے۔ نیر مسعود کا فن اتنا محدود نہیں ہے کہ وہ محض لکھنؤ کے زوال کا المیہ رقم کریں۔ دراصل وہ فنا کا افسانہ لکھتے ہیں۔ صاف اور لطیف زبان کے باوجود نیر مسعود کے افسانے قارئین کے لیے پیچیدہ ہوتے ہیں۔''13

ان اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نیر مسعود کے افسانوں کے کینوس پر میجکل ریلزم کی جابہ جا کارفرمائی ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کے افسانے مبہم، خواب ناک اور خوف کی فضا لیے معلوم ہوتے ہیں۔

نیر مسعود کے افسانوی مجموعہ 'عطر کافور' کے سارے افسانے علامتی قسم کے ہیں۔ ان میں مرکزی افسانہ 'عطر کافور' علامتی قسم کے افسانے کی بہترین مثال ہے۔ اس میں کافور اور عطر کافور مختلف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

(i)۔ کافور کا مفہوم انسان کا وجود اور اس کی شخصیت سے متعلق ہے۔ افسانے میں چوکور مرتبان جس میں کافور رکھا ہے انسان کا جسم، مرتبان میں رکھا کافور انسان کا وجود اور اس کی خوشبو روح ہے جو دوسروں کو متاثر کرتی رہتی ہے۔ انسان کا وجود رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ جس طرح کافور خوشبو کے ساتھ دھیرے دھیرے اڑتا رہتا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد کافور کی طرح انسان کا وجود عدم میں گم ہو جاتا ہے۔

(ii)۔ عطر کافور دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(الف) عطر کافور سے مراد نیر مسعود کے افسانے ہیں جو بظاہر سادہ، جذبات سے خالی اور ویرانی جیسی کیفیت لیے ہوتے ہیں۔ جس طرح عطر کافور میں کوئی رنگ نہیں ہوتا اور اس کی خوشبو سے موت، بیزاری اور عدم کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ لیکن افسانوں کا جب بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان میں فنا پذیری اور نظام قدرت سے متعلق فلسفے چھپے ہوتے ہیں۔

(ب) عطر کافور جو بے رنگ اور اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی ہے افسانے کی ہیروئن ماہ رخ سلطان کا تلازمہ ہے کیونکہ ماہ رخ بھی جذبات سے خالی ایک کردار ہے جو رفتہ رفتہ مرض کے سبب موت کے قریب ہوتی جاتی ہے اور اخیر میں اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

نیر مسعود کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ کیا جاتا ہے تو افسانوں میں موضوعاتی وحدت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر موضوعاتی وحدت سے افسانوں کو بچایا گیا ہوتا تو ان کی ادبی اہمیت اور زیادہ ہوتی ساتھ ہی وسعت پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں موجود کرداروں کے اعمال وکیفیات میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کے تمام افسانوں پر نگاہ ڈالنے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر کردار کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے علالت، معالج اور تیماردار کے ذکر سے خالی نہیں ہیں۔ بہت سے کردار سحر کے اثر میں مبتلا لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ کرداروں پر اکثر کسی نہ کسی مرحلہ میں غنودگی ضرور طاری ہوتی ہے۔ افسانوی مجموعہ 'سیمیا' میں شامل افسانے 'اوجھل' اور 'مسکن' میں مرکزی کردار بولنا اور سوچنا چھوڑ دیتے ہیں۔ 'سیمیا' کے بیشتر کردار سحر گزیدہ معلوم ہوتے ہیں، ان کے اعمال وافعال سے وہ کسی قدیم داستان کے مافوق الفطری کردار لگتے ہیں۔۔ دوسری بات جو شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں رمز واشارات کثرت سے پائے جاتے ہیں، نتیجتاً افسانوں کے معنوی اور موضوعاتی پہلو بآسانی سامنے نہیں آتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے افسانے معنی سے خالی ہیں بلکہ ان میں معنی کا ایک جہاں آباد ہے جہاں تک رسائی کے لیے ژرف بینی درکار ہوتی ہے۔

حوالہ جات:

1۔ رسالہ آج، 1998
2۔ سہ ماہی اردو ادب، 2002، ص، 66
3۔ سہ ماہی اردو ادب، 2002، ص 67
4۔ سہ ماہی اردو ادب، 2002، ص 67
5۔ عطر کافور، ص، 62
6۔ رسالہ آجکل، 2008
7۔ جرگہ، ص، 8
8۔ اوجھل، ص، 19
9۔ مراسلہ، ص 16
10۔ سیمیا، ص، 174
11۔ سیمیا، ص، 174
12۔ نیر مسعود کی افسانوی واہمہ سازی، ص، 283
13۔ افسانہ بیسوی صدی کی روشنی میں، ص، 56,57

■

Arisha Tasneem
Ph. D Research Scholar
Maulana Azad National Urdu University
Urdu University Road, Near LNT Towers,
Telecom Nagar, Gachibowli
Hyderabad -500032 Telangana

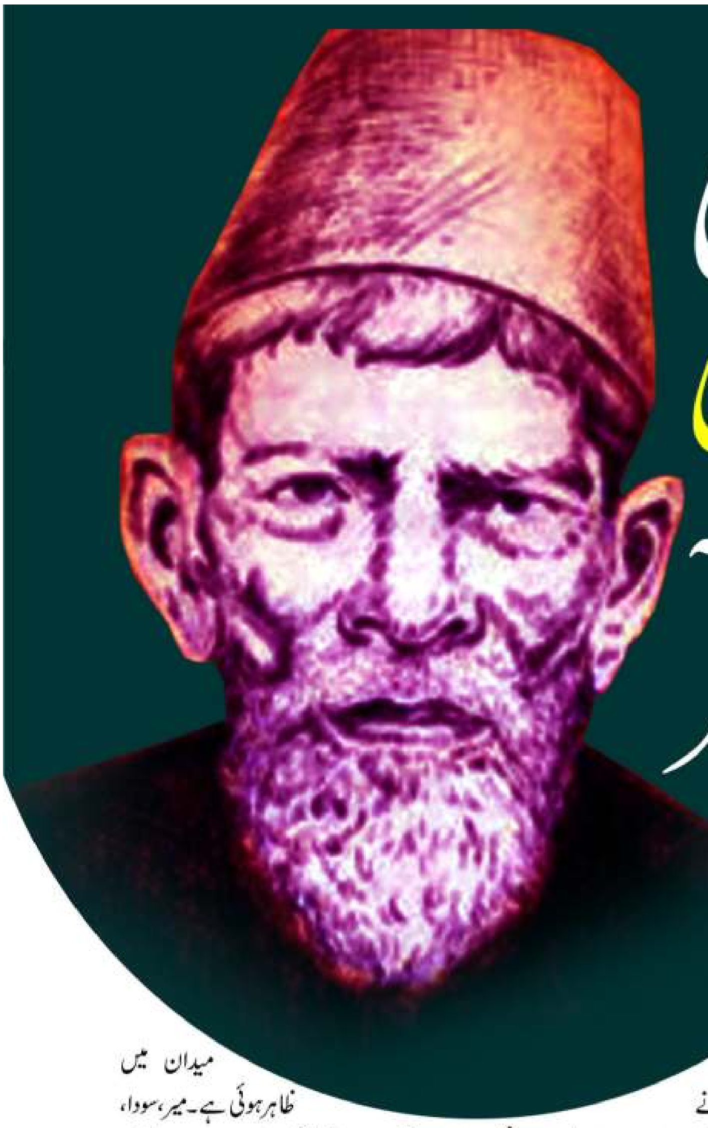

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں طنزیہ مزاحیہ عناصر

محمد یاسین

لسان العصر کا پورا نام سید اکبر حسین اور اکبر تخلص تھا۔ 16 نومبر 1846 کو بارہ تحصیل ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والدین نے تو ابتدائی تعلیم مشرقی انداز کی ہی دلوائی تھی مگر اکبر نے اپنی ذاتی لیاقت اور دلچسپی کی بنا پر انگریزی سے بھی اچھی واقفیت حاصل کرلی۔ شروع میں کئی جگہوں پر چھوٹی موٹی نوکریاں کیں۔ عدالت سے وابستگی ان کے لیے بہت فائدے مند ثابت ہوئی۔ وکالت کا امتحان پاس کیا اور سیشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ہائی کورٹ میں جج کی حیثیت سے تقرری ہونے سے قبل ہی خرابی صحت کی وجہ سے نوکری سے سبکدوش ہوگئے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں 1857 کی بغاوت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے آغاز و اختتام اور تحریکات خلافت وعدم تعاون تک، سب کچھ نہ صرف دیکھا بلکہ ذہنی وفکری طور پر ان میں دلچسپی بھی لی۔ عدالتوں سے منسلک ہونے کی وجہ سے برطانوی حکام اور ان کے گرد گھومنے والے طبقے کی زندگی اور کرداروں کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کی شاعری میں ان سب تجربات و مشاہدات کے بہت واضح اثرات ملتے ہیں۔

انگریزی حکام نے ہندوستانیوں میں دو قسم کے ردِّعمل پیدا کیے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو مغربی تعلیم و تربیت سے متاثر ہوکر نئی تعلیم اور نئے اقدار کو قبول کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ سر سید احمد خان اور مولانا حالی اسی گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسرا طبقہ قدامت پسندوں کا تھا جو مشرقی تہذیب وتمدن کی پرانی باتوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ شبلی اور اکبر الہ آبادی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں مغربی تہذیب سامراجی سازش کا ایک روپ بن کر سامنے آئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستانیوں کا انگریزی لبادہ اوڑھنے کا طرح طرح سے مذاق اڑایا۔ ان کی شاعری میں اس دور کی تاریخی حقیقتوں کی سچی عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ اکبر کا دور انتشار اور بحران کا دور تھا۔ مغربی تہذیب ایک طرح سے قدیم ہندوستانی معاشرے کی مذہبی، تہذیبی اور سماجی اقدار کے سامنے بہت بڑا چیلنج تھی۔ اکبر نے مغربی تہذیب کی پیدا کردہ خامیوں پر سخت لہجے میں نکتہ چینی کی ہے۔ وہ ایک بلند پرواز تخیل اور ایک فعال ذہن کے مالک تھے اس لیے انھوں نے شاعری میں طنز کے نشتر استعمال کیے۔ شاعری میں طنز و ظرافت کو معراجِ کمال تک پہنچا دینے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ اکبر اردو میں طنز و مزاح کے بڑے نمائندے تھے۔ اکبر کے یہاں پہلی بار طنز و مزاح دونوں شاعری کی تنگ اور محدود دنیا سے باہر نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ آلہ محض ایک انداز بیان ہی نہیں۔ وہ اسے سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا سب سے بہتر طریقہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں محض طنز و مزاح ہی نہیں بلکہ بلا کی سنجیدگی، شائستگی ملتی ہے۔ دراصل ان کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اکبر کو تنگ نظر اور قدامت پرست سمجھا جاتا رہا۔ اکبر اپنے کلام کی شوخی اور طنز و ظرافت کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک منفرد و اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

اکبر کی شاعری اور ان کا کلام اوروں سے جدا ہے۔ ان کی شہرت کا دار و مدار ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کا سنجیدہ کلام مقدار میں مزاحیہ کلام سے کسی طرح کم نہیں مگر مزاحیہ کلام زیادہ مشہور ہے۔ ان کی انفرادیت بھی پوری طرح طنز و مزاح ہی کے میدان میں ظاہر ہوئی ہے۔ میر، سودا، نظیر، غالب، انیس، اور اقبال کو جو نمایاں اہمیت حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی انفرادیت ہے۔ ان شعراء کے کلام میں ان کی انفرادی شخصیت کا اظہار مکمل طریقے سے ہوا ہے۔ کسی ایک کے کلام پر دوسرے کا دھوکہ نہیں ہوسکتا۔ اکبر الہ آبادی بھی اپنی انفرادیت کی بنا پر ہر معنیٰ میں اس لائق ہیں کہ غیر فانی ناموں کی اس فہرست میں ان کے نام کا اضافہ کیا جائے۔ اکبر سے پہلے بھی اردو شاعری میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے قابل ذکر نمونے ہجویات میں نظر آتے ہیں۔ سودا، نظیر، انشا وغیرہ کے یہاں کہیں تو ہجو معاشرے کی آلودگیوں کی پردہ دری کرکے بلند منصب پر فائز ہوگئی ہے اور کہیں ذاتیات میں الجھ کر اپنے مقام سے گر گئی ہے۔ غرض کہ اکبر سے پہلے کسی اور شاعر میں طنز و مزاح کے وجود سے یکسر انکار تو نہیں کیا جاسکتا البتہ اس میں شبہ نہیں کہ قابل ذکر سرمایہ کم ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو صحافت کے ذریعہ طنز و مزاح کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی۔

آزادی کا فخر اسے اگر ہے
یاں فخر اس سے زیادہ تر ہے

واں طبع کو زور لا تخف ہے
وقت تو جو ہے وہ اس طرف ہے

زنجیر خرد کی پائے بندی
با قاعدہ شرح درد مندی

کیوں کر نہ ہو ادعائے اعجاز
کھولے ہیں قفس میں بال پرواز

ہے لوک سناں پہ نقش پرواز
رقصاں دم تیغ پر بصد ناز

پابندی کا یاں ہے کب تاسف
یوسف زنداں میں بھی ہے یوسف

اکبران اشعار میں بڑی ہنرمندی کے ساتھ برطانوی عہد کی تعزیروں اور صحافتی پابندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چونکہ اکبر نے بہت ہی کم عمری میں سرکاری نوکری شروع کردی تھی اس لیے وہ انگریزی سرکار کے خلاف براہ راست اس کی تنقید کرنے سے بچتے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ برطانوی حکومت کی مخالفت کرتے تھے۔ جس کی مثال 'نامہ بنام اودھ پنچ' میں ہی نہیں دیکھی جاسکتی بلکہ اکبر کے طنزیہ اسلوب ان کے کلام میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

لغزشیں مد ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف

سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برفبار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اکبر کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے طنز ومزاح کو شعوری طور پر کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ جعفر زٹلی، سودا اور سید انشاء کے اشعار میں ہمیں معاشرے کی خرابیاں دکھائی دیتی ہیں تو یہ محض اتفاقیہ ہے۔ ان لوگوں نے اس آلہ سے افراد کے اوپر تیر چلانے کا کام کیا ہے۔ سودا کی ہجویات سے اس عہد کی معاشی اور معاشرتی ابتری بہت کچھ معلوم ہوجاتی ہے۔ مگر عموماً وہ افراد کی ہجویات لکھتے ہیں۔ بہرحال شاعری ایک الگ فن ہے جو فنون لطیفہ کی شاخ ہے اور اکبر بہرصورت بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ جو اپنے کلام سے قومی آزادی اور معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں کے ذریعہ ملک میں جو نسلی امتیازات پیدا کردیے گئے تھے اس پر گہری چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ سچ ہے کہ انہوں نے ملک لے رکھا ہے
ہم لوگوں سے کیمپ کو پرے رکھا ہے

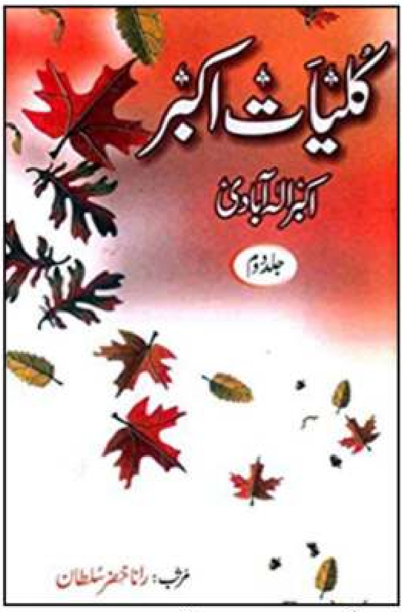

لیکن ہے ادائے شکر لازم ہم پر
کھانے بھر کو ہمیں بھی دے رکھا ہے

اسی طرح برطانوی حکومت کے ذریعہ ملک کی تمام اشیا کو لوٹے جانے کی مخالفت اور ظلم وتشدد کی پالیسی پر یوں طنز کرتے ہیں:

قدم انگریز کلکتے سے دلی میں جو دھرتے ہیں
حکومت خوب کی، اب دیکھیں شاہی کیسے کرتے ہیں

اکبر کے کلام میں لفظی مزاح بہت سی شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ کہیں محاورے اور ضرب الامثال کی مدد سے، کہیں لفظوں اور ٹکڑوں کی تکرار کے ذریعہ، کہیں لفظوں کو مقلوب کرکے اور کہیں صنعت گری کے وسیلے سے۔ اکبر نے اپنے اشعار میں محاورات کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ چونکہ وہ عام، عامیانہ اور خاص ہر قسم کے محاورات پر عبور رکھتے تھے۔ اور اسے برمحل استعمال کرنے کی خوبی بھی جانتے تھے۔ محاورے ہر تہذیب اور علاقے کی زندگی کا عکاس ہوتے ہیں۔ اس لیے اکبر کی محاورہ بندی ان کے تہذیبی مزاج کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اکبر کے یہاں محاورے اور ضرب الامثال زیرلب تبسم اور کہیں قہقہے کو تحریک دیتے ہیں۔

آپ کے ہو نہیں سکتے یہ غربی ریزے
دل نہ ٹھہرے تو نگل جائے ہیرے کی کنی

سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل
تمھارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ

اکبر کے کلام میں انگریزی کے الفاظ بے شمار جگہ ملتے ہیں۔ چونکہ وہ انگریزی الفاظ بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے ان سے قبل اکا دکا انگریزی کے الفاظ سید انشاء وغیرہ نے بھی استعمال کیے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے معاصرین میں حالی کے یہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں اکبران سب سے جدا ہیں۔ ان کے یہاں انگریزی کے الفاظ کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ سرسید، نذیر احمد اور حالی وغیرہ اپنی نثر میں انگریزی کے لاتعداد الفاظ لکھ جاتے ہیں۔ اسی طرح اکبر بھی اپنے کلام میں انگریزی کے بے شمار الفاظ کو بڑی فنکاری سے استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ اکبر الہ آبادی انگریزی کے اچھے عالم تھے۔ انھوں نے انگریزی کی قانونی کتابوں کے تراجم بھی کیے ہیں۔ وہ انگریزی کی مشکل سے مشکل کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے خصوصاً فلسفہ جیسے دقیق مضمون کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ اکبر چونکہ طنز ومزاح کے شاعر ہیں اس لیے وہ انگریزی کے الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ مزاح پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ناہمواری اور دوسرا تعجب خیزی بھی ہے۔

دیدنی ہے یہ تماشائے مشین انقلاب
باپ تو قبلہ تھے، بیٹا اسکوائر ہو گیا

اسمال نہیں، گریٹ ہونا اچھا
دل ہونا برا ہے، پیٹ ہونا اچھا

پنڈت ہو کہ مولوی ہو، دونوں بے کار
انسان کو گریجویٹ ہونا اچھا ہے

مختصر یہ کہ اکبرالہ آبادی کے کلام میں سنجیدگی ہے مگران کا اسلوب مزاحیہ ہے اور مزاحیہ اسلوب کے جملہ خصائص ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ وسیع اور کئی زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اکبر ضرورت کے مطابق عربی، فارسی، ہندی، یا انگریزی الفاظ استعمال کرسکتے ہیں اور اس معاملے میں وہ اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ کسی لفظ کو غریب یا متبذل نہیں سمجھتے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ شعر کی مخصوص فضا ہر لفظ کے استعمال کا جواز مہیا کرسکتی ہے۔ ایک وسیع اور ہمہ گیر ذخیرۂ الفاظ پر تصرف نظیر کے بعد اکبرالہ آبادی کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ اکبر کو زبان پر بلا کی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے عام بول چال کی زبان اور انگریزی کے رائج الفاظ کا اس قدر برجستہ استعمال کیا ہے۔ اور ان کے ذریعے اس خوبی سے مزاح کا کام لیا کہ ان سے پہلے شاید کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔

■

Mohd Yaseen
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University
Allahabad - 211002 (UP)

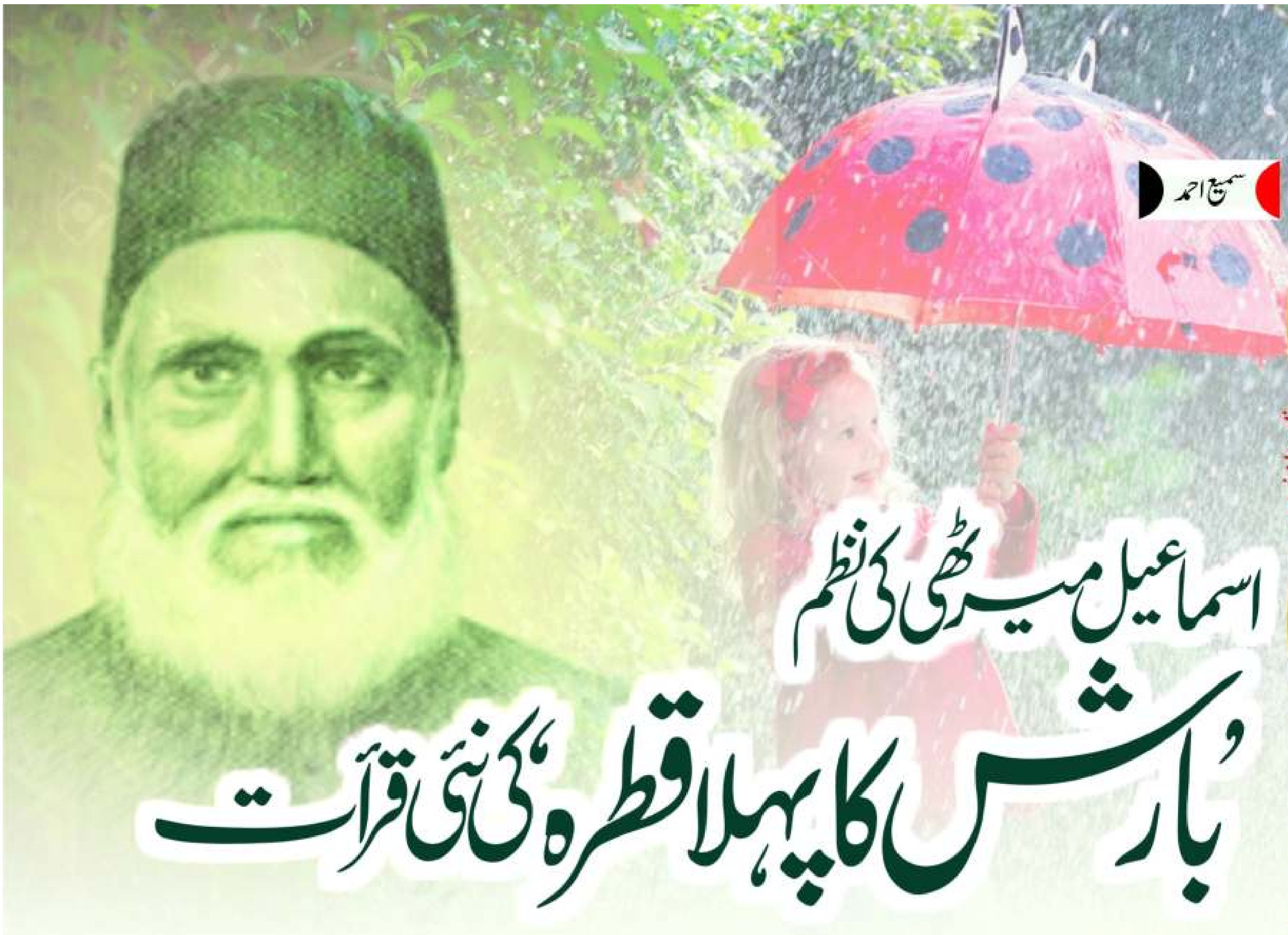

اسماعیل میرٹھی کی نظم
'بارش کا پہلا قطرہ' کی نئی قرأت

سمیع احمد

اسماعیل میرٹھی کا شمار اردو کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی، جدید نظم نگاری میں اسماعیل میرٹھی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی نظموں میں ہیئت کے تجربے کیے۔ ان کی شاعری میں معاصر رویے سے انحراف بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز تو غزل گوئی سے کیا مگر اس کے بعد انھوں نے تقریباً تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کی شاعری میں تاریخی، قومی، سماجی، اخلاقی، علمی تصوف اور دیہی زندگی سے متعلق موضوعات ملتے ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کے ساتھ ایک بڑی ناانصافی یہ ہوئی کہ انھیں بچوں کا شاعر اور ادیب سمجھ لیا گیا، یہ ایک المیہ ہے۔ میرے کہنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ بچوں کا ادیب ہونا کوئی عیب کی بات ہے۔ دراصل کسی بھی ادیب کو کسی مخصوص خانے میں مقید کرنے سے اس کے متن کی جہتیں محدود ہو جاتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسماعیل میرٹھی کے یہاں بچوں پر کہی گئی نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ وہ بچوں کی نفسیات سے زیادہ واقف تھے، اور اس کی ایک بڑی وجہ ان کا استاد ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے جو نظمیں کہی وہ یقیناً بچوں پر لکھی گئی نظموں کی پہلی فہرست میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔

ان نظموں کی ایک خاص بات یہ کہ اس میں مسرت، سادگی اور جوش پایا جاتا ہے۔ چونکہ اسماعیل میرٹھی نے ادب اطفال پر زور دیا شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر ناقدین نے انھیں بچوں کے ادیب کے طور پر دیکھا اور پیش کیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں بڑے کینوس میں دیکھا جائے۔ اسماعیل میرٹھی نے بہت عمدہ نظمیں لکھی ہیں جن کی معنویت آج کے عہد میں بھی برقرار ہے۔ انھی میں ایک نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' ہے۔ میں نے مذکورہ نظم کی روشنی میں اسماعیل میرٹھی کی نظم نگاری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اردو نظم نگاروں نے بارش کو موضوع بنا کر کئی دلکش، خوبصورت اور لازوال نظمیں کہی ہیں۔ اس ضمن میں مولانا الطاف حسین کی نظم 'برکھا رت' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حالی نے اپنی نظم 'برکھا رت' میں برسات سے قبل کی صورت حال کو پیش کرتے ہوئے بارش کے بعد آئی تبدیلی کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی مذکورہ نظم ان معنوں میں برکھا رت سے مختلف ہے کہ انھوں نے برسات کی اہمیت کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بارش کے اس پہلے قطرے کی بہادری کو مرکزیت دی ہے۔ بلکہ اسماعیل میرٹھی کے یہاں بارش کا پہلا قطرہ ایک علامت بن جاتا ہے۔ اس نظم کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسماعیل میرٹھی نے ایک خاص مقصد کی حصولیابی کے لیے یہ نظم کہی ہے۔ نظم کا ابتدائیہ ملاحظہ کریں۔

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا
میں اور کی گوں نا آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاوں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیا ناس

اسماعیل میرٹھی کی بیشتر نظموں کا مقصد اصلاح قوم ہے۔ اس غرض سے انھوں نے کہیں بے جان اشیاء کا سہارا لیا اور کہیں قدرتی وسائل کو استعمال کرکے وہ قوم وملت کے اندر حوصلہ اور اس کی اصلاح کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دراصل وہ ان کرداروں کی آڑ میں قوم کو محنت بہتر اخلاق اور قوت عمل کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ نظم کے پہلے حصے کو پڑھتے ہوئے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر قوم کے اندر حوصلہ اور عمل کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ گھنگھور بادل ہونے کے باوجود بارش کی بوندیں اس بات کے لیے خود کو تیار نہیں کر پا رہی ہیں کہ آخر کون پہلے جائے گا،

ہر بوند کو اس بات کا خوف ہے کہ وہ زمین کی تپش سے جل جائے گا۔ اگر ہم اس نظم کے سنہ اشاعت کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں اس بات کا احساس ہوجائے گا کہ اسماعیل میرٹھی کے عہد میں کس قسم کا ماحول رہا ہوگا۔ 1857 کی ناکام پہلی جنگ کے بعد انگریزی حکومت نے بالخصوص مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ قوم کے لیے بہتر کرنے کا جذبہ رکھنے والے مصلح قوم اس بات سے خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ کیا وہ قوم وملت کی خدمت کر سکیں گے۔ ان کی حالت بھی بارش کی ان بوندوں جیسی ہی ہے، یعنی جو خوف بارش کی ان بوندوں کو ہے کہیں نہ کہیں ہمارا سماج بھی اسی طرح خوفزدہ ہے۔ بارش کی بوندوں کی زبانی اسماعیل میرٹھی نے ان حالات کا ذکر کیا ہے:

خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت
پھیکی ہاتھوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری
میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم
سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

بارش کی بوندوں کا آپس میں گفتگو کرنا بلکہ سرگوشی کرنا اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ ان کے اندر ہمت کی کمی ہے، وہ خوفزدہ ہیں اور رہنمائی کرنے کے بجائے رہنما کی تلاش میں ہیں۔ ان بوندوں کو اس بات کا خدشہ لاحق ہے کہ اگر انھوں نے پیش رفت کی تو لوگوں کو سیراب کرنے اور پیاس بجھانے کے بجائے زمین کی تپش سے اس کا وجود ہی ختم ہوجائے گا۔ مگر ان بوندوں کے درمیان ایک ایسی بھی بوند تھی جس نے ہمت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے اور اپنے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کا ارادہ کیا۔ اشعار دیکھیے:

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور
ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت
بھڑکی اس کی رگ حمیت
بولا للکار کر کہ آؤ!
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

بارش کا یہ قطرہ جسے اسماعیل میرٹھی نے پہلا قطرہ لکھا ہے، وہ کون ہے؟ یکبارگی ہمارا ذہن سرسید احمد خاں کی طرف جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کے حصے میں بیان کیا ہے کہ 1857 کی ناکامی صرف جدوجہد آزادی کی ناکامی نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے حوصلے کی شکست بھی تھی، انگریزوں نے اس بغاوت کا انتقام بالخصوص مسلمانوں سے لیا، گویا حکومت کے چھن جانے کے ساتھ مسلمانوں کو قتل وغارت گری کا شکار بھی ہونا پڑا۔ ایسے نازک موقع پر مسلمانوں کے اندر اعتماد کی کمی پیدا ہوگئی۔ پوری ملت ایک انتشار کی کیفیت سے دوچار تھی، حالانکہ اس وقت علماء کرام کی ایک جماعت موجود تھی، ان کے اندر قوم وملت کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی تھا، مگر ان کی حالت بارش کی ان بوندوں جیسی تھی جسے اپنے مقصد کی ناکامی کے ساتھ ساتھ فنا ہونے کا خطرہ بھی درپیش تھا۔ ایسے موقع پر ایک رہنما جو پورے آب وتاب، ہمت وشجاعت اور نیک نیت سے ہمارے سامنے آیا وہ کوئی اور نہیں سرسید تھے۔ سرسید نے مسلم قوم کی اصلاح کی ذمہ داری کو اپنا فرض العین تسلیم کیا، اور بارش کے پہلے قطرے کی طرح ان کے اندر جوش وجذبے پیدا کیے، ان کی حمیت کو بیدار کیا اپنی قوم کو للکارتے ہوئے وہ کہا جسے بارش کے پہلے قطرے کی زبانی اسماعیل میرٹھی نے پیش کیا ہے:

کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان
ڈالو مردہ زمیں میں جان
یارو! یہ ہچر مچر کہاں تک
اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کروگے جاں فشانی
میدان پہ پھیر دو گے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں
آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہوگیا روانہ
''دشوار ہے جی پہ کھیل جانا''
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت
کی اس نے مگر بڑی شجاعت

ظاہر ہے بارش کی پہلی بوند نے جس طرح ہمت کا مظاہرہ کیا اور اپنے ساتھیوں کے اندر ایک جوش بھر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ ساتھی جو اب تک کشمکش کا شکار تھے، انھوں نے بھی پہلے قطرے کی للکار پر لبیک کہا:

دیکھی جرأت جو اس سکھی کی
دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا
قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار
بارش لگی ہونے موسلا دھار
پانی پانی ہوا بیاباں،
سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت
اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جرأت قطرہ کی کر گئی کام
باقی ہے جہاں میں آج تک نام

اتحاد کی اہمیت کی جانب مذہبی صحیفوں سے لے کر ادبی کتابوں میں ذکر ملتا ہے۔ اتحاد کامیابی و کامرانی کی علامت ہے، یہی سبب ہے کہ بارش کا ہر قطرہ انفرادی طور پر پیش رفتی سے گھبرایا ہوا تھا، مگر جیسے ہی پہلے قطرے نے پیش رفت کی اور ان کے اندر اتحاد پیدا ہوا، بارش نے پورے ماحول بیاباں، خیاباں گویا پوری خلقت کو سیراب کردیا۔ ٹھیک ویسے ہی جب سرسید احمد خاں نے قوم کے اندر جو اتحاد کی جوت جگائی تھی اسی کا اثر تھا کہ سرسید کی کوشش نے ہندوستانی مسلمانوں کے اندر سماجی، سیاسی، علمی، ادبی اصلاحات کیے جس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر انقلابی طور پر تبدیلی آئی۔ یہی سبب ہے کہ سرسید آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی کا یہ شعر اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

جرأت قطرہ کی کر گئی کام
باقی ہے جہاں میں آج تک نام

جیسا کہ میں نے ذکر کیا اسماعیل میرٹھی کی نظموں میں اصلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ مذکورہ نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' بھی اس سے الگ نہیں۔ اس نظم میں اسماعیل میرٹھی نے اتحاد کی اہمیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ یہی نہیں اس نظم کی قرأت کرتے ہوئے ہمیں سرسید اور ان کی خدمات کی جانب بھی اشارے ملتے ہیں۔ نظم کے آخری دو اشعار دیکھیے جس میں اسماعیل میرٹھی کی مقصدیت کی جانب اشارہ بھی ہے اور سرسید کے کاموں کا اعتراف بھی:

اے صاحبو! قوم کی خبر لو
قطروں کا سا اتفاق کرلو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمھاری

اسماعیل میرٹھی کی مذکورہ نظم کو میں نے ایک نئے اور الگ تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کی قرأت کرتے ہوئے میں نے جو محسوس کیا اس کو سپرد قلم کردیا ہے۔ اب میں اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا اس کا فیصلہ قارئین کے حوالے کرتا ہوں۔

■

Dr. Sami Ahmad
Guest Faculty, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

سالک جمیل براڑ

بچوں کے ناول نگار
کرشن چندر

اردو ادب میں ادبِ اطفال کی بات کریں تو ایسے بہت کم نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے مسلسل بچوں کے لیے لکھا ہو۔ ماضی میں ہر بڑے چھوٹے ادیب نے تجربے کے طور پر ادبِ اطفال میں ضرور طبع آزمائی کی ہوگی۔ لیکن باضابطہ طور پر ادبِ اطفال پر کوئی بڑا کارنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔ کرشن چندر (23 نومبر 1914 - 8 مارچ 1977) واحد ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب پر سنجیدگی سے توجہ دی اور ناول نگار کے طور پر ادبِ اطفال میں اپنی پہچان بنائی۔ راشد الخیری کے بعد بچوں کی ناول نگاری کا میدان بالکل خالی نظر آتا ہے تاہم کرشن چندر نے ادبِ اطفال کے فن پر محض خامہ فرسائی نہیں کی بلکہ بچوں کے ناولوں میں نئے تجربات سے اس صنف کو مقبولِ عام بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور اپنی الگ شناخت قائم کی۔ بقول محمود الرحمٰن:

''راشد الخیری کے بعد اس صنفِ ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا، جسے اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار کرشن چندر نے پُر کیا ہے۔ انھوں نے تقسیم کے بعد بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی ہے اور اب تک متعدد ناول لکھ چکے ہیں، جن میں 'چڑیوں کی الف لیلہ' اور 'الٹا درخت' کو قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ یہ دو ناول بچوں کے مشہور رسالہ 'کھلونا' دہلی میں قسط وار چھپتے رہے ہیں۔''

(اردو میں بچوں کا ادب، ص 406)

بلاشبہ کرشن چندر اردو ناول کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ انھوں نے جہاں بڑوں کے لیے 48 ناول لکھے ہیں وہیں بچوں کے لیے مندرجہ ذیل ناول لکھ کر ادبِ اطفال میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے

1۔ اُلٹا درخت، ایشیا پبلشرز، دہلی 1954
2۔ بیوقوفوں کی کہانیاں، کھلونا بک ڈپو، دہلی
3۔ سونے کی صندوقچی، کھلونا بک ڈپو، دہلی
4۔ چڑیوں کی الف لیلیٰ (دو جلدیں) کھلونا بک ڈپو، دہلی
5۔ شیطان کا تحفہ، کھلونا بک ڈپو، دہلی
6۔ سونے کا سیب 1957
7۔ ستاروں کی سیر، کھلونا بک ڈپو، دہلی 1957
8۔ لال تاج، ایشیا پبلشرز، دہلی 1954
9۔ ستاروں کی سیر کھلونا بک ڈپو، دہلی 1961
10۔ خرگوش کا سپنا، مکتبہ جامعہ، دہلی 1961
11۔ ہمارا گھر، ایشیا پبلشرز، دہلی 1966
12۔ بہادر گار جنگ (انڈین ٹارزن سیریز)، ایشیا پبلشرز، دہلی 1969

قابلِ ذکر ہے آخر الذکر ناول 'بہادر گار جنگ' (انڈین ٹارزن سریز) یہ سیریز ایک جنگلی انسان 'ٹارزن' کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جس میں اس کے مختلف کارنامے پیش کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ وار سیریز کے تحت یکے بعد دیگرے پانچ ناول شائع ہوئے۔ جو اس طرح ہیں۔

(1) نیل ہرن، (2) چمبک کا قلعہ (3) موتیوں کی جھیل (4) کانچ کا گولہ (5) خفیہ محل

اس ضمن میں جگدیش چندر ودھان رقم طراز ہیں:

''ان کے علاوہ کرشن چندر نے بچوں کے لیے پاکٹ بکس کی شکل میں 'بہادر گار جنگ' کے عنوان سے ناولوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا.... ان ناولوں میں انھوں نے ٹارزن کے کردار کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا اور دل چسپی، جاذبیت اور Suspence کو از اوّل تا آخر برقرار رکھا جس کی وجہ سے انھیں بچے ہی نہیں بڑے بھی پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'بہادر گار جنگ' کے عنوان کے تحت درج ہے۔

''سات سے ساٹھ سال کے بچوں کے لیے۔''

(کرشن چندر: شخصیت اور فن، ص 639)

کرشن چندر خود اس ناول کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

'بہادر گار جنگ' کا کردار ہر آدمی کو پسند آئے گا جس کے دل میں اندر کا بچہ بھی جاگتا ہے۔'' (نیل ہرن، صفحہ 3)

بہادر گار جنگ یعنی ٹارزن کے کردار کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کردار کو لے کر ہندی فلم انڈسٹری نے کئی فلمیں اور سلسلہ وار ڈرامے بنائے۔

کرشن چندر کے بیشتر ناول قسط وار بچوں کے رسالے ماہنامہ 'کھلونا' دہلی میں شائع ہوئے۔ جن کی بدولت موصوف کو بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں میں بھی خوب شہرت حاصل ہوئی لیکن دوسری جانب دیکھا جائے تو رسائل میں چھپنے کی وجہ سے ان کے بیشتر ناول کتابی شکل میں شائع نہیں ہو سکے۔ جس کی وجہ سے آج ان کے کئی ناول ناپید ہو گئے ہیں۔ جن کو ماہنامہ 'کھلونا' دہلی کے فائلوں سے ڈھونڈنے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ محققین و ناقدین کے یہاں ان کے ناولوں کو لے کر تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً خوشحال زیدی ان کے کچھ بچوں کے ناولوں کو کہانی کے زمرے میں رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان کی تخلیقات میں کچھ تو پریوں کی کہانیاں ہیں، اور کچھ خیالی دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ چڑیوں کی الف لیلیٰ، بیوقوفوں کی کہانیاں، سونے کی صندوقچی، سونے کا سیب، شیطان کا تحفہ، لال تاج اور 'الٹا درخت' کرشن چندر کی مقبول کہانیاں کتابی شکل میں ہیں۔'' (اردو میں بچوں کا ادب، ص 233)

جبکہ جگدیش چندر ودھان اپنی کتاب 'کرشن چندر: فن اور شخصیت' اور محمود الرحمٰن 'اردو میں بچوں کا ادب' میں کرشن چندر کی ان تخلیقات کو ناول کے زمرے میں لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'الٹا درخت'، 'چڑیوں کی الف لیلیٰ' اور 'ہمارا گھر' دیگر تخلیقات سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں جو سالوں تک قسط وار ماہنامہ 'کھلونا' دہلی میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ جن کو کہانی کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ اس سلسلے میں مزید تحقیق درکار ہے۔

کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں مختلف موضوعات لیے ہیں۔ تکنیک کے اعتبار سے نئے تجربے کیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے روایتی کہانی کو جدیدیت کے ہم رنگ کر دیا ہے۔ اصل میں بچوں کے لیے جو ادب لکھا جاتا ہے اس کا واحد مقصد بچوں کی تربیت ہوتی ہے۔ بچوں کے معصوم ذہن کو سبق آموز کہانیوں کے ذریعے بہتر زندگی گزارنے کا درس دیا جاتا ہے۔ دوسری جانب پریوں، جنوں، جادوگروں، اڑتے قالین بچوں کو اپنی جانب راغب کرنے کا بہترین طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ کرشن چندر کے بچوں کے لیے لکھے ناولوں کا مطالعہ کریں تو واضح طور پر وہ بچوں کے عظیم ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

ناول 'الٹا درخت' کرشن چندر کا بچوں کے لیے تحریر کردہ

پہلا ناول ہے جو 1954 میں ماہنامہ 'کھلونا' دہلی میں قسط وارشائع ہوا۔ جسے بعد میں ایشیا پبلشرز، دہلی نے یکم جولائی 1954 کو شائع کیا۔ 2001 میں رجت بک ہاؤس، دلی نے اس کو دوبارہ شائع کیا۔ پاکٹ بک سائز میں چھپا یہ ناول 149 صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس ناول کا دیباچہ مشہور ہندی کہانی کار ریوتی شرن شرما نے تحریر کیا ہے۔

'الٹا درخت' تمثیلی انداز میں لکھا گیا ناول ہے جس میں سماجی، سیاسی، جمہوری، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ کرشن چندر ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر تھے اور یہ ناول اس کا بہترین نمونہ ہے۔ اس ناول کی اسی خوبی کی وجہ سے اس ناول کا روسی زبان میں ترجمہ ہوا اور اس پر روس میں فلم بھی بنی۔ بقول محمود الرحمٰن:

''روس میں اِسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور وہاں اس کی فلم بھی بن چکی ہے۔''

(اردو ادب میں بچوں کا ادب، ص 408)

ناول کا مرکزی کردار یوسف نام کا ایک لڑکا ہے۔ جس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن بے رحم بادشاہ اس سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔ جب فاقے کی نوبت آتی ہے۔ تو یوسف تین بیجوں کے بدلے گائے بیچ دیتا ہے اور جن میں سے دو بیج جانور کھا جاتے ہیں۔ تیسرا بیج یوسف بو دیتا ہے۔ جس سے ایک الٹا درخت اگتا ہے جو آسمان کی بجائے زمین میں پھلتا پھولتا ہے اور یوسف اس درخت پر چڑھ کر ایک دن زمین کے اندر بنی اُس گپھا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ درخت پنپتا ہے اور وہ یعنی یوسف طلسماتی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جہان اسے صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں جو ان قلم کاروں، دانشوروں اور بہادروں کی ہیں جنھوں نے اپنے ظالم بادشاہ کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ لیکن مرنے کے بعد بھی ان لوگوں کی آوازیں پورے ملک میں گونجتی رہتی ہیں۔ اس طرح کرشن چندر نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ حق کی لڑائی میں شہادت پانے والے مر کر امر ہو جاتے ہیں۔ یوسف درخت پر چڑھتے ہوئے کالے دیو کے شہر میں پہنچ جاتا ہے۔ جہان کے حکمران کالے ہیں اور غلام گورے لوگ ہیں۔ ناول نگار یہاں پر نسل پرستی کا موضوع سامنے لایا ہے۔ اسی طرح سونے کا دیو، چاندی کا دیو اور شہزادی کو رُلا کر اس کے آنسو حاصل کرنے والا بڈھا جوہری اس ناول کے ضمنی کردار ہیں۔ ناول کا اختتام لاجواب ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں آ کر کرشن چندر کا فن اپنی معراج کو چھونے لگتا ہے۔ ناول کے آخر میں جب بادشاہ اور شہزادی کو گڈھے میں دفنا دیا جاتا ہے تو یوسف یوں مخاطب ہوتا ہے۔

''مگر بابا میں تو پورے طور پر اس درخت پر چڑھا بھی نہیں۔''

یوسف نے کہا۔ ''میں نے تو اس کی چوٹی بھی نہیں دیکھی..... بابا مجھے اس درخت کی چوٹی دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔''

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ ''بیٹا یہ کوئی معمولی درخت نہیں ہے۔ یہ انسان کی ترقی کا درخت ہے۔ اس کی چوٹی آج تک کسی نے نہیں دیکھی۔'' (ناول 'الٹا درخت' صفحہ 148-147)

یعنی انسان کی ہر منزل ایک پڑاؤ ہے اور ہر پڑاؤ ایک نئی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور انسان کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک منزل پانے کے بعد وہ دوسری کی طرف دوڑتا ہے جیسے کہ یوسف مزید آگے بڑھنے کی اپنی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ لیکن انسانی خواہشات کا کوئی انت نہیں۔ اس ناول کا اندازِ بیان قدیم داستانوں جیسا ہے۔ ایک قصے سے دوسرا قصہ جنم لیتا ہے اور کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن ناول میں کئی ایسے سیاسی اور سماجی عناصر کو اجاگر کیا گیا ہے جو کہ بچوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام پر جو چوٹ کی گئی ہے وہ بچوں کی سوچ سے بعید نظر آتی ہے۔

ناول 'چڑیوں کی الف لیلہ' روایتی انداز میں لکھا گیا ناول ہے جس میں ایک راجکمار کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے ظالم چچا نے اس کی حکومت پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے اور ننھا شہزادہ اُس سے بچ کر کسی طرح جنگل میں پہنچ جاتا ہے اور بھیڑیا اور بھیڑنی اس کو اپنا لیتے ہیں اور اپنی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ ان کے علاوہ شیر، چیتا، ہاتھی اور بھالو غرض کہ جنگل کے سبھی جانور اس کی پرورش میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ شہزادہ اپنی عقل سے جنگل کے سبھی خونخوار جانوروں کو اپنا مطیع بنا لیتا ہے اور جنگل کے پرندوں اور جانوروں کی فوج بنا کر اپنے چچا کو ہرا کر اپنا راج واپس حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایک سبق آموز ناول ہے جس میں ناول نگار نے بچوں کو یہ بتایا ہے کہ انسانوں کے مقابلے میں جانور زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول نگار نے بچوں کو یہ سبق دیا ہے کہ اگر انسان کچھ کرنے کی ٹھان لے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ناول نہایت دلچسپ ہے۔ بچوں کے لیے اس میں خاصا تفریحی مواد موجود ہے۔ ہندی فلم انڈسٹری والوں نے کرشن چندر کے راجکمار کے کردار کو 'موگلی' کا نام دے کر قسط وار ڈرامہ بنایا تھا جس کو بے پناہ مقبولیت ملی تھی۔ اس کے علاوہ اس کہانی کو لے کر 'جنگل بک' کے نام سے فلم بھی بن چکی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ کہانی میں کچھ بدلاؤ کیا گیا ہے۔ لیکن تھیم کرشن چندر کے اِسی ناول سے اخذ کیا گیا ہے۔ خواہ اُس ٹی وی سیریل میں کہیں کرشن چندر کا نام درج نہیں ہے۔

غالباً ناول 'ستاروں کی سیر' سائنسی موضوع پر لکھا گیا اُردو میں بچوں کا پہلا ناول ہے۔ جو اکتوبر 1957 میں قسط وار ماہنامہ 'کھلونا' دہلی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ ستاروں کی سیر کے کئی ایڈیشن اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ یہ ایک طویل ناول ہے جو بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں پچاس سال آگے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ زمین پر جنگ جاری ہے۔ ایٹم بم اور راکٹوں نے آدھی سے زیادہ دنیا کو موت کی نیند سلا دیا ہے اور زمین کی سطح نیچی اور پانی کی سطح اونچی ہو گئی ہے۔ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی میں ڈوب گیا ہے اور انسان پہاڑوں پر آباد ہیں۔ پہاڑوں پر قلعہ بندیاں ہو چکی ہیں۔ ایک طرف سائنسدان آباد ہیں تو دوسری طرف عام انسان۔ ان ہی سائنس دانوں میں ایک بوڑھا سائنسدان ہے جو اپنے تین بچوں عرفی، ناز اور موہنی کے ساتھ ایک پہاڑ کی چوٹی پر آباد ہے۔ اس کا چوتھا سائنسی بیٹا جمی روبوٹ ہے۔ جس کے سارے اعضا لوہے کے ہیں۔ اس بوڑھے سائنسدان کے بچے جمی روبوٹ کے ساتھ راکٹ میں سوار ہو کر خلا میں اڑنے لگتے ہیں اور مختلف ستاروں کی سیر کرتے ہیں۔ بقول خوشحال زیدی:

''خوبصورت نرالے اور نو بہ نو مناظر اور مختلف النوع کردار، عجیب و غریب پرندے، انوکھی مخلوق، اور سائنسی انکشافات کے تانے بانے سے تخلیق کردہ یہ شاہکار داستان اردو ادبِ اطفال میں کرشن چندر کو اہم ترین ناول نگار کا درجہ دلوانے میں کامیاب ہے۔'' (اردو میں بچوں کا ادب، ص 493)

بلاشبہ کرشن چندر اردو کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے جدید سائنس اور سائنسی دنیا کے متعلق بچوں کے لیے دلچسپ پیرائے میں ناول 'ستاروں کی سیر' تحریر کیا ہے۔

کرشن چندر نے بچوں کے لیے مہماتی، سائنسی، سماجی، اصلاحی اور معلوماتی ناول تحریر کیے ہیں۔ ان ناولوں کا اسلوب تمثیلی اور طنزیہ ہے جس میں مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ زبان نہایت سادہ اور دلکش ہے نیز اُن کے یہاں فنی طور پر نئے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ بچوں کی سادگی اور معصومیت کو کرشن چندر کے شعور اور احساس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کرشن چندر کے یہ ناول ادبِ اطفال کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ جن کی بدولت کرشن چندر کو بچوں کے ناول نگار کے طور پر بھی ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

■

Salik Jamil Brar
Brar Street, Hazrat Sheikh Road,
Malerkotla-148023(Punjab)
M:092560-33695,083602-03095
salikjamilbrar@gmail.com
salikbrar@gmail.com

عالیہ بیگم

ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار
مولانا ابو الکلام آزاد

Al-Hilal
CALCUTTA
الہلال
ایک ہفتہ وار مصور رسالہ

مولانا ابوالکلام آزاد (11 نومبر 1888 — 22 فروری 1958) کا شمار ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی ملک وملت کی خدمت میں صرف کردی۔ وہ ایک جید عالم دین، عظیم مفسر قرآن، بلند پایہ مفکر و فلسفی، بہترین شاعر و ادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ہی ایک قوم پرست رہنما، صف اول کے سیاست داں، بڑے مجاہد آزادی، بے مثال مقرر، اعلیٰ پایہ کے مکتوب نگار، بہترین انشاء پرداز اور ایک ماہر وزیر تعلیم بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی پوری زندگی ملک وقوم کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود وترقی کے لیے وقف کر دی۔ وہ ذات پات، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کی تفریق سے باہر نکل کر قوم کو آزادی اور اتحاد کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں، وطن سے ان کی بے پناہ محبت اور ملک کے لیے ان کی قربانیاں ہندوستانی عوام کے لیے ایک شاندار اور تابناک مثال ہے۔

ابوالکلام آزاد 11 نومبر 1888 میں مکہ معظمہ میں محلہ قدوہ متصل باب السلام میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم کا نام خیر الدین تھا اور والدہ محترمہ عالیہ بیگم تھیں۔ آزاد کا اصلی نام محی الدین احمد، تاریخی نام فیروز بخت، لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔ ان کے والد ایک حادثہ کا شکار ہو گئے اور ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ انھوں نے فوری طور پر وہیں اپنا علاج کیا لیکن مکمل علاج کی غرض سے وہ مع اہل وعیال 1895 میں (ہندوستان) کلکتہ آ گئے اور پھر کبھی ہندوستان سے واپس نہیں گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد انتہائی ذہین و باشعور، حق پرست اور حوصلہ مند انسان تھے۔ ان کا دل قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہندو مسلم قومی اتحاد کے خواہاں تھے ان کی خواہش تھی کہ مسلمان قوم بھی سیاست میں عملی طور پر حصہ لے، اس کے لیے انھوں نے مسلسل طور پر کوششیں کیں۔ یوں تو آزاد، سرسید احمد خاں کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے لیکن مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے کی پالسی کے سخت خلاف تھے لہٰذا انھوں نے رسالہ الہلال میں سرسید کی اس پالیسی کی شدید مخالفت کی اور مذہب کا سہارا لیتے ہوئے اپنا نظریہ لوگوں کے درمیان رکھا۔ آزاد نے الہلال میں لکھا کہ:

''اسلام آزادی کا علمبردار ہے لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے دوسری قوموں کے ساتھ مل کر آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔'' (رسالہ الہلال، کلکتہ دسمبر 1918)

مولانا ابوالکلام آزاد 'الہلال' کے ذریعہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی جد و جہد کی طرف متوجہ کراتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔''

بہرکیف آزاد کا یہ قدم کارگر ثابت ہوا اور الہلال نے جنگ آزادی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا ان کے اس بیان کے بعد مسلمانان ہند نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بذات خود نہ صرف سیاست میں بلکہ ہندوستان کی تمام تحریکوں میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا اور ہر تحریک میں پیش پیش رہے۔ تحریک ترک موالات، تحریک 'ہندوستان چھوڑ دو' قانون نمک کے خلاف تحریک، دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں

سے عدم تعاون کی تحریک وغیرہ غرض کہ تمام تحریکوں میں آزاد ایک جوش و ولولہ کے ساتھ عملی طور پر شریک ہوئے اور ملک کی آزادی کے لیے لگا تار کوششیں کرتے ہوئے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بہرصورت غلامی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے اقوام ہند اور ہندوستان کو آزاد تو کرانا چاہتے تھے لیکن وہ تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے، اور وہ ملک کی آزادی پر ہندو مسلم قومی اتحاد کو ترجیح دیتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا ایک قول بہت مشہور ہے جو درج ذیل ہے:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتا ہے بشرط یہ کہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوگی تو یہ ہندوستان کا عظیم نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

مولانا آزاد اپنے دور کے ایسے دانشوروں میں تھے کہ ان کی اس فکر اور سوچ کی اس دور کے سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ دیگر دانشوروں نے بھی مثلاً ڈاکٹر تارا چند، رام گوپال، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر ہمایوں کبیر اور مالک رام جیسی شخصیتوں نے تائید کی۔ مگر انگریز حکمرانوں کی سیاسی چالیں ایسی تھیں کہ ملک کو تقسیم کر کے ہندو مسلم فساد کو بڑھاوا دیا جائے اور آزادی کے ساتھ وہ تکلیف دہ حادثہ ہو کر رہا۔

تقسیم ہند کے بعد پورے ملک میں فرقہ پرستی پھیل گئی اور مولانا آزاد نے اس بدلے ہوئے حالات میں بھی وہی باتیں کہیں جو وہ دور انگریزی حکومت میں کہا کرتے تھے۔ آزاد نے فرقہ پرستی کا جواب دیتے ہوئے اور عوام ہند کو سمجھاتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ:

''میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرو اور اس کاسہ لیس کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا اشعار رہا۔

میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آرہے ہیں وہ تمہارے ہی قافلے کے چھوڑے ہوئے ہیں... ان کے وارث بن کر رہو..... اور سمجھ لو کہ اگر تم خود بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمھیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں، اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے''

(خان عبدالودود خاں، مولانا ابوالکلام آزاد تحریک آزادی و یک جہتی، مرتبہ کتاب والا، دہلی ص 88-87)

اس طرح ایک بہترین سیاسی بصیرت رکھنے کے ساتھ ہی آزاد ایک سچے مسلمان اور عالم دین بھی تھے۔ انھیں اپنے مذہب سے گہری انسیت تھی۔ انھوں نے ہمیشہ قرآن سے راہبری و رہنمائی حاصل کی اور دوسروں کو بھی قرآن سے استفادہ کرنے کا درس دیا کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر بھی ان کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ مشرق و مغرب کے مختلف فلسفوں میں بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تاریخ کا بھی گہرا علم تھا خصوصاً اسلامی تاریخ کا۔ تفسیر القرآن اس سلسلے کی اہم کڑی ثابت ہوئی۔

آزاد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا محض 11 سال کی عمر میں ہی انھوں نے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ آزاد نے شاعری کی تمام مشہور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جوان کی ذہنی صلاحتوں کا ثبوت ہے لیکن جلد ہی انھوں نے شعر گوئی کا یہ سلسلہ یک سر ختم کر دیا اور نثر کی طرف راغب ہو گئے۔ ان کی نثر نگاری کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے نثر میں آراستہ و پیراستہ اسلوب کے ذریعہ انفرادیت قائم کی اور ان کے اس منفرد اسلوب نے نہ صرف عوام کو بلکہ عالم و دانشوروں کو بھی بے حد متاثر کیا۔ آزاد کی نثر نگاری سے متاثر ہو کر حسرت موہانی نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

صحافت نگاری کے میدان میں بھی ابوالکلام آزاد نے اپنا جوہر کمال دکھایا ان کا رسالہ الہلال اردو صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ رسالہ الہلال 13 جولائی 1911 میں کلکتہ سے جاری ہوا لیکن جنوری 1914 میں انگریزی حکومت نے اس رسالے کی دو ہزار کاپیوں کی پرانی ضمانت ضبط کر کے دس ہزار روپیوں کی نئی ضمانت کا مطالبہ کیا لہٰذا آزاد نے اسے جنوری 1914 میں بند کر دیا اور اسی کی طرز پر 12 نومبر 19155 میں رسالہ 'البلاغ' کا اجرا کیا جس پر روشنی ڈالتے ہوئے نیاز فتح پوری نے لکھا کہ:

''الہلال کے بعد مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریقۂ ابلاغ کچھ مختلف تھا۔ تیور وہی تھے رخ دوسرا تھا۔ انداز قدر وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ البلاغ نفسیات ذہنی کا الہلال حرکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔''

بہرکیف بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے ان قومی رہنماؤں میں سے ایک تھے جنھوں نے حصول آزادی کے بعد ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں اپنی قیادت میں اپنا عظیم تعاون دیا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ آزاد نے ایک ماہر تعلیم کی طرح نہیں بلکہ مفکر تعلیم کی طرح تعلیمی نظام کی تشکیل پر کام کیا اور تعلیمی نظام کو ایک نیا رخ، نئی جہت اور نئی بلندی عطا کی۔ انہوں نے Central Institute of Education کی تشکیل کی اور ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے University Grant Commission اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے enter for Scientific Industrial Resaerch اور Indian Council for cultural Relations کے قیام کو بھی عملی جامہ پہناتے ہوئے ہندوستانی کلچر، ثقافت، تاریخ و تہذیب کو ہندوستان اور بیرونی ملک میں فروغ دینے کے لیے کوششیں کیں۔ اس کے علاوہ سنگیت اکادمی، ساہتیہ اکادمی اور للت کلا اکادمی جیسے ثقافتی ادارے بھی قائم کیے جس نے ملک کی تہذیب و ثقافت کو ایک نئی جہت دی۔

''مولانا آزاد کی سیاسی رہنمائی پر روشنی ڈالتے ہوئے 'حسن احمد' اپنے مضمون' کامیاب سیاسی رہنمائی اور ابوالکلام آزاد' میں لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ابوالکلام آزاد تقسیم کو روکنے میں کامیاب نہیں رہے مگر..... وہ کامیاب سیاسی رہنما تھے اور کامیابی کے لیے مذہب کا کلیہ بھی یہی ہے کہ اپنا پیغام اخلاص سے پہنچانا اور اس کے لیے سعی کرنا۔ وہ اپنا پیغام پرزور قول و فعل کے ذریعہ باشندگان ملک تک پہنچاتے رہے ان کا پیغام ان کی موت کے تیس سال بعد بھی زندہ ہے اور اس کی کامیابی کی واضح نشانیاں مختلف رنگوں اور صورتوں میں آشکارا ہیں، ان کا اثر دیر سے آنے والا، مگر گہرا اور دیرپا تھا۔''

(حسن احمد: کامیاب سیاسی رہنمائی اور ابوالکلام (مضمون) ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت مرتبہ: رشید الدین خاں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص 441)

مولانا ابوالکلام آزاد کا مقصد اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرانا اور اپنی قوم کو روحانی اقدار کا احساس کرا کر ان کے درمیان قومی اتحاد قائم کرنا تھا، جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی اس غیر معمولی شخصیت کا احاطہ کرنا کوزے میں سمندر بھرنے کے مترادف ہے۔ ایسے پرخلوص، قوم پرست، جری سیاست داں اور گوہر ریز اہل قلم کی فکر اور رہنمائی مستقبل میں لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

■

Aliya Begum
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University
Senate House, University Road, Old Katra
Allahabad - 211002 (UP)
Email: aliyashaikh380@gmail.com

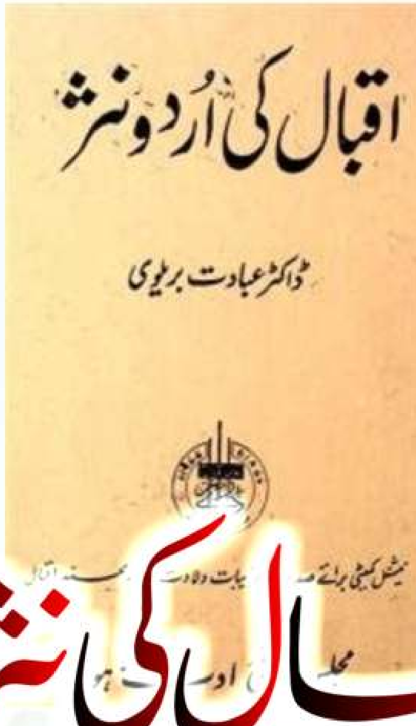

شہاب الدین

اقبال کی نثر

علامہ اقبال کو دنیا شاعرِ مشرق، فلسفی اور حکیم الامت کے نام سے جانتی ہے لیکن اس کا علم کم لوگوں کو ہے کہ اقبال کی پہلی تصنیف کا تعلق نہ شاعری سے ہے اور نہ فلسفے سے بلکہ نثر سے ہے۔ ان کی پہلی کتاب 1903 میں 'علم الاقتصادٗ کے نام سے 216 صفحات پر مشتمل لاہور سے شائع ہوئی جس میں معاشیات کے دقیق اور اہم مسائل کو نہایت واضح اور موثر انداز میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اقبال نے خود اس کا دعویٰ کیا ہے۔

''علم اقتصادیات پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی'' (15 اپریل 1917 مکتوب بنام کشن پرشاد شاد)۔ اس کو بیسویں صدی کی علمی نثر کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس زمانے میں اس طرح کے علمی موضوعات کو اردو میں پیش کرنے کی کوئی باقاعدہ روایت نہیں تھی، اس لیے اس قسم کے علمی موضوعات کو آسان، سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کردینا کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں ہے۔ کتاب کا ابتدائی نمونۂ نثر ملاحظہ ہو:

''علم الاقتصاد، علم انسانی کے اس خاص حصے کا نام ہے جس کا موضوع دولت ہے اور جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور استعمال کے اصول واسباب وطریق کیا کیا ہیں''۔

'علم الاقتصادٗ کے دیباچے میں اقبال نے لکھا ہے:

''یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے مضامین مختلف، مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتقاد تھا''

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے فن شعر ہی کو ذریعۂ اظہار نہیں بنایا بلکہ تقریروں، نثری تحریروں اور خطوں کے ذریعے بھی وہ اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کرتے رہے ہیں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اقبال اگر شاعری نہ کرتے اور نثر ہی لکھتے تو بھی وہ اردو نثر میں مرزا غالب کی مانند ایک خاص دبستان یادگار چھوڑ جاتے۔''

مگران کے نثری افکار کے خصوصی مطالعے کی طرف کسی نے خاص توجہ نہیں دی۔ ادھر چند سال ہوئے اقبال کے مکاتیب اور کچھ نایاب تحریروں کے مجموعے سامنے آئے ہیں۔ لیکن جو کام ہونا چاہیے تھا وہ اب بھی باقی ہے۔ علامہ اقبال کے مضامین کو سب سے پہلے حیدرآباد میں تصدق حسین حیدرآبادی نے 'مضامین اقبالٗ کے نام سے شائع کیا۔ اسی کو بنیاد بنا کر اضافے کے ساتھ سید عبدالواحد معینی نے 'مقالات اقبالٗ کے نام سے شائع کیا ہے۔ عبدالواحد صاحب نے اس مجموعے میں علامہ کے ان تمام مضامین ومقالات کو یکجا کردیا ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف رسائل واخبار میں لکھے تھے۔ غرض اس مجموعے میں علامہ کی بیشتر ایسی بکھری ہوئی نثری تحریریں یکجا ہیں جو انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین ومقالات کی صورت میں شائع کروائی تھیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واحد مجموعہ ہے جس میں علامہ کی بیشتر اہم تحریریں پڑھنے والوں کو یکجا مل جاتی ہیں۔ علامہ کا ایک مضمون 'بچوں کی تعلیم وتربیتٗ جو اس کتاب میں شامل ہے ایک نمونہ پیش کیا جارہا ہے:

''بچے میں بڑوں کی مدد کرنے کا مادہ خصوصیت سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں ہنستی ہے تو خود بھی ہنس پڑتا ہے۔ باپ کوئی لفظ بولے تو اس کی آواز کی نقل اتارے بغیر نہیں رہتا۔ ذرا بڑا ہوجاتا ہے اور کچھ باتیں بھی سیکھ جاتا ہے تو اپنے ہمجولیوں کو کہتا ہے!

''آؤ بھئی! ہم مولوی بنتے ہیں تم شاگرد بنو''۔

کبھی بازار کے دکان داروں کی طرح سودا سلف بیچتا ہے۔ کبھی پھر پھر کر اونچی آواز دیتا ہے کہ:

''چلے آؤ! انار ستے لگادیے''۔

اس وقت میں بڑا ضروری ہے کہ استاد اپنی مثال بچے کے سامنے پیش کرے تاکہ اسے اس کے ہر فعل کی نقل کرنے کی تحریک ہو۔

قوت متخیلہ یا واہمہ بھی بچوں میں بڑی نمایاں ہوتی

ہے۔شام ہوئی اور لگا ستانے اپنی ماں کو:

''اماں جان! کوئی کہانی تو کہہ دو!''۔

ماں چڑیا یا کوے کی کہانی سناتی ہے تو خوشی کے مارے لوٹ جاتا ہے۔''

مذکورہ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی افسانے کا مطالعہ ہورہا ہے۔اسی طرح 'قومی زندگی' میں شرائط زندگی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے۔اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہوکر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ اور باتیں تو خیر، ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسانی کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے''۔

آگے مولوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں، تو حیات مسیح یا آیات ناسخ ومنسوخ پر بحث کرنے کے لیے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں... ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ہاں امرا کی عزلت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہے۔ خیر سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے تو پہلے سے ہیں، ابھی میاں تیسری بیوی کی تلاش میں ہیں اور پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں۔ کبھی گھر جی جوتی بیزار سے فرصت ہوئی تو بازار کی کسی حسن فروش نازنین سے بھی گھڑی بھر کے لیے آنکھ لڑا آئے''۔

مضامین کے علاوہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ علامہ کے مکاتیب کے بیش بہا مجموعے موجود ہیں۔ان مکاتیب میں بھی علامہ نے زیادہ تر ادبی یا فنی موضوعات سے بحث کی ہے۔''اقبال نامہ'' علامہ اقبال کے مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اکبر الہ آبادی، محمد علی جناح، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور بعض دوسرے ہم عصروں کے نام لکھے ہیں۔اس مجموعے کو شیخ عطاء اللہ نے 1943 میں مرتب کیا ہے۔ان خطوط سے علامہ کی سیرت وشخصیت پر روشنی پڑتی ہے، مختلف موضوعات پر ان کے خیالات و نظریات کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے اسلوب نگارش کی صحیح قدر و قیمت بھی معلوم ہوتی ہے۔اس مجموعے کے ایک خط کے اقتباس سے اس کی حقیقت کا صحیح طور پر اندازہ ہوگا:

مکرم بندہ جناب میر صاحب

السلام علیکم

دونوں رسالے پہنچے، سبحان اللہ نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے، افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں دی....ایک تکلیف دیتا ہوں، اگر آپ کے استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے گا، بہت ممنون ہونگا۔اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمایئے گا کہ کہاں مل سکتی ہے۔میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو زجمع کرنے شروع کیے ہیں......اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہِ کرم جلد مطلع فرمائیں۔حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔

والسلام

خاکسار محمد اقبال

قارئین کو اس مختصر سے اقتباس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ علامہ کا مزاج کیا تھا۔مطلب کی بات کس قدر سہل اور چھوٹے چھوٹے جملے میں لکھتے تھے۔نیز ان کی نثر میں تکلف وتصنع کی پیچیدگیاں بالکل نہیں ہیں۔ ہر کوئی آسانی کے ساتھ ان کی بات سمجھ سکتا ہے۔

نثر اقبال کا ایک اہم موضوع قومی ملی زندگی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کوئی باقاعدہ ضخیم کتاب تو نہیں لکھی ہے لیکن جو کچھ انھوں نے اپنی شاعری میں کہا ہے اس کی تفسیر ان کے مضامین نثر میں ملتی ہے۔ان کا سب سے پہلا مضمون 'بچوں کی تعلیم وتربیت' کے عنوان سے ہے جو 1902 میں مخزن میں شائع ہوا۔یہ سلسلہ چلتا رہا 1904 میں 'مخزن' میں قومی زندگی پر ایک مفصل مضمون 'قومی زندگی' کے نام سے شائع ہوا۔پھر اس کے بعد اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں علامہ نے 'خلافت اسلامیہ'، 'ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر' جیسے اہم قومی وملی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ان مضامین کے علاوہ دیباچہ 'مثنوی اسرار خودی' اور دیباچہ 'پیام مشرق' میں بھی انھوں نے قومی وملی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ان میں سے ہر نثری تحریر بحیثیت موضوع اور اسلوب خاص اہمیت کی حامل ہے۔

"اقبال کے اسلوب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنجیدہ اور علمی موضوعات کو بھی دلچسپ اور پر لطف بنا کر پیش کرتے ہیں۔ شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی بعض جگہ تصویر کشی کے نمونے ملتے ہیں خاص طور پر کسی علمی نکتے کی وضاحت کے سلسلے میں جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو ان کا تخیل کچھ ایسی تصویریں بناتا ہے جو جاندار اور بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

اقبال کے اسلوب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ سنجیدہ اور علمی موضوعات کو بھی دلچسپ اور پر لطف بنا کر پیش کرتے ہیں۔شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی بعض جگہ تصویر کشی کے نمونے ملتے ہیں خاص طور پر کسی علمی نکتے کی وضاحت کے سلسلے میں جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو ان کا تخیل کچھ ایسی تصویریں بناتا ہے جو جاندار اور بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

''لاہور کے کسی محلے میں جا نکلو، ایک تنگ وتاریک کوچے پر ہماری نظر پڑے گی جس وحشت زدہ سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر لاغر، نیم برہنہ بچوں کی چیخ وپکار یا کسی پردہ نشیں بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوئی ہوں گی''

مسلمان قوم کی تباہ حالی، خصوصا غربا کی اس پامالی کا نقشہ دیکھ کر افسردگی کا احساس ہوتا ہے۔جزئیات یعنی لاغر ونیم برہنہ بچوں کی چیخ وپکار اور پردہ نشیں بڑھیا کی سوکھی مرجھائی اور خیرات طلب کرتی انگلیاں اس عبارت کا وصف خاص ہیں۔ یہ جزئیات دل کو متاثر کرتی ہیں اور افلاس وغربت کی تصویر حواس پر چھا جاتی ہے۔

تفکرات زمانہ اور گوناگوں مصروفیتوں نے اس کی مہلت علامہ کو نہ دی کہ وہ اردو نثر کو بھی اپنی غیر فانی نظموں کی طرح ایک گراں سرمایہ عطا کریں۔پھر بھی جس ادیب کی پہلی تصنیف نظموں کو چھوڑ کر اردو نثر میں ہو اور جو اپنی معرکتہ الآراء نظموں کے ساتھ اردو میں بیش بہا نثر بھی لکھتا رہا ہو۔اس کی نثر نگاری کو نظر انداز کرنا صریح طور پر ناانصافی ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اس زمانے میں جو نثر لکھی وہ مقدار میں کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی انھوں نے لکھا ہے اس میں اس عہد کے رجحانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ان کی نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی ان کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔

■

Mr. Mohd Shahabuddin Rahmani Qasmi
D-41, J J Coony, Inderapuri
New Delhi - 110012
Mob.:8826080282
E-mail.: qasmi1@gmail.com

علامہ شبلی اور ملا واحدی

محمد الیاس الاعظمی

محمد ارتضٰی معروف بہ ملا واحدی (1888-1976) دہلی کے رہنے والے اردو کے ممتاز اہل قلم تھے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔ 88 سال عمر پائی اور 70 سال تک لکھتے رہے یہی وجہ ہے کہ تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ خواجہ حسن نظامی (1878-1955) سے عقیدت مندانہ مراسم قائم ہوئے تو ان کے اشتراک سے 1909 میں دہلی سے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا جسے وہ پچاس برس تک نکالتے رہے۔ دہلی میں 1947 کے فسادات سے دل برداشتہ ہوکر ہندوستان کو خیرباد کہہ کر پاکستان کی راہ لی، جس وقت انھوں نے ہجرت کی اس وقت وہ آٹھ رسائل اور ایک اخبار کے مدیر تھے۔ اسی پر دیوان سنگھ مفتون (1890-1975) نے کہا تھا کہ واحدی کوچہ چیلان کو رسالوں اور اخباروں کا قبرستان بنا کر گئے۔[1] حالانکہ ان کی زبان پر یہ نوحہ تھا کہ:

تذکرہ دہلی مرحوم کا نہ چھیڑ اے دوست
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

ان کے لکھنے پڑھنے کا آغاز نوجوانی اور طالب علمی میں ہوا۔ بے شمار مضامین و مقالات، انشائیے اور خاکے لکھے ان کے علاوہ ان کی متعدد کتابیں میرے زمانے کی دلی، دلی کا پھیرا، دلی جو ایک شہر تھا، میرا افسانہ، سوانح خواجہ حسن نظامی، حیات سرور کائنات، تاثرات وغیرہ شائع ہوئیں، ان میں میرے زمانے کی دلی بہت مشہور ہوئی، ان کے اخباری کالموں کا مجموعہ تاثرات بھی قابل ذکر ہے جسے حکیم محمد سعید دہلوی نے مرتب کرکے شائع کیا۔ ملا واحدی نے دلی اور دلی والوں پر بائیس تیئس برس تک لکھا۔ دہلی سے متعلق ان کی کتاب 'ناقابل فراموش لوگ اور ناقابل فراموش باتیں' خدا جانے شائع ہوئی یا نہیں۔ اسی طرح 'تاثرات' کا ایک اور ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا غالباً اس کی اشاعت کی بھی نوبت نہیں آئی۔ اخیر دور میں اپنی خودنوشت میرا افسانہ اپنے بچوں کے لیے لکھی جو نامکمل رہی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں نے اسے سائیکلو اسٹائل کراکے تقسیم کیا، جسے مشہور محقق مالک رام (1906-1993) نے اپنے رسالہ تحریر دہلی (جولائی ستمبر 1878) میں شائع کیا۔ 2015 میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے اس کا ایک خوب صورت ایڈیشن شائع کیا ہے۔ راقم کے پیش نظر یہی جدید اشاعت ہے۔

ملا واحدی کے بارے میں گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل ان کی آپ بیتی 'میرا افسانہ' سے ماخوذ ہے۔ البتہ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ 'میرا افسانہ' میں انہوں نے ان بزرگوں اور احباب کا بھی ذکر کیا ہے جن سے رسالہ نظام المشائخ کے توسط سے روابط قائم ہوئے، ان میں ایک اہم نام علامہ شبلی کا بھی ہے۔

دور طالب علمی میں ملا واحدی کی نصابی کتابوں سے طبیعت اچاٹ ہوئی تو غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے اور پھر اس کی ایسی چاٹ لگی کہ تعلیم ادھوری رہ گئی، اس دور میں انھوں نے جن اساطین علم وادب کا مطالعہ کیا، اس میں ایک اہم نام علامہ شبلی کا نعمانی کا بھی ہے۔[2]

1908 میں علامہ شبلی (پیدائش: 4 جون 1857، وفات: 18 نومبر 1914) نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا کہ میں تھک گیا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں چنانچہ خواجہ صاحب نے انھیں دہلی بلا لیا۔ اس پوری مدت میں ملا واحدی ان کے ساتھ مقیم رہے۔[3] ملا واحدی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی آپ بیتی میں اس طرح کیا ہے:

''نظام المشائخ کے اجرا کے بعد سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی ہمارے ہاں تشریف لائے اور تقریباً مہینہ بھر ٹھہرے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو مولانا شبلی نے کسی خط میں لکھا تھا کہ کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مہینہ بھر کے لیے کہیں باہر چلا جاؤں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ کہیں نہ جایئے یہاں تشریف لے آیئے۔ سکون کا پورا بندوبست کردیا جائے گا۔ مولانا نے یہ تجویز اس شرط پر منظور فرمائی کہ آپ صرف قیام کا انتظام کریں، طعام کا انتظام میرا باورچی کرے گا، باورچی کو لاؤں گا۔''[4]

واحدی صاحب نے تاثرات میں بھی 'علامہ شبلی کی یاد' کے عنوان سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی نعمانی ایک دفعہ دلی تشریف لائے اور خواجہ حسن نظامی کے ہاں مہینہ بھر ٹھہرے۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں نواب بڈھن کے کمرے میں رہتے تھے جو اعظم خاں کی حویلی (دہلی) کے سامنے تھا، کمرہ کیا پورا دیوان خانہ تھا۔ کمرے سے متصل نواب بڈھن کی محل سرا تھی۔ نواب غلام نصیرالدین عرف نواب بڈھن رئیس شیخوپورہ برناوہ ضلع میرٹھ نے کمرہ اور محل سرا دونوں خواجہ صاحب کے سپرد کرکے رکھے تھے۔ رسالہ نظام المشائخ کی ابتدا اسی کمرے سے ہوئی تھی، جو میں نے اور خواجہ صاحب نے جاری کیا تھا۔''

خیر یہ 1908 کی بات ہے، نظام المشائخ کے اجرا سے سوا سال پہلے کی، مگر میں اس کمرے اور محل سرا میں آنے جانے لگا تھا۔''[5]

ضیاء الدین احمد برنی (1890-1969) مصنف عظمت رفتہ نے علامہ شبلی کے اس سفر کا سال 1909 لکھا ہے،[6] اور مولانا سید سلیمان ندوی نے 1914[7] چونکہ کسی اور مقام پر اس سفر کا ذکر نہیں ملتا اس لئے قیاس ہے کہ ملا واحدی ہی کا بیان کردہ سنہ درست ہے۔ علامہ شبلی نے 1914 میں بھی دہلی کا ایک سفر کیا تھا۔ ممکن ہے اس سفر میں بھی خواجہ حسن نظامی سے ملاقات ہوئی ہو لیکن تصوف پر تقریر کا واقعہ 1908 ہی کا ہے جیسا کہ ملا واحدی نے صراحت سے لکھا ہے۔

ملا واحدی چونکہ علامہ شبلی کے قیام دہلی میں ان کی مجالس کے حاضر باشوں میں تھے اس لیے انھوں نے علامہ کو قریب سے دیکھا تھا، ان کے معمولات تصنیف و تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ علامہ شبلی صرف آٹھ بجے سے دس بجے تک لکھنے کا کام کرتے ہیں اور دس بجے کے بعد یا اخبار رسالے اور کتابیں پڑھتے ہیں، یا لوگوں سے ملتے جلتے ہیں، آٹھ سے دس بجے تک کے لیے ہدایت تھی کوئی آئے، مت آنے دو، اور کچھ ہو جائے مت خبر کرو۔''[8]

علامہ شبلی کے دوسرے سفر دہلی میں بھی جو 1913 میں ہوا تھا ان کا یہی معمول رہا، ملا واحدی لکھتے ہیں:

''دوسری دفعہ غالباً 1913 میں علامہ شبلی دلی تشریف لائے اور حکیم اجمل خاں کے ہاں قیام فرمایا، وہاں بھی آٹھ سے دس (بجے) تک وہ تخلیہ کرتے تھے اور ان کے قریب پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

علامہ شبلی کی تمام معرکۃ الآرا تصانیف دو گھنٹے روزانہ لکھنے کی کرامات ہیں۔ دو گھنٹے سے زیادہ لکھنا ان کے نزدیک حرام تھا اور دو گھنٹہ پابندی سے لکھنا فرض۔ اسے وہ سفر و حضر میں نباہتے تھے۔ باقی اوقات میں کبھی کھانا بھی پکا لیتے تھے۔ پکانے کا غالباً شوق تھا اور کھانا کھانا بھی جانتے تھے۔''[9]

علامہ شبلی نے خواجہ صاحب سے یہ شرط رکھی تھی کہ طعام کا انتظام وہ خود کریں گے۔ اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب نے نواب بڈھن کی پوری محل سرا مولانا کے سپرد کردی جہاں وہ باورچی سے آگ ضرور سلگواتے تھے اور چپاتیاں پکواتے تھے، باقی سالن اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔''[10]

اس محل سرا میں خواجہ حسن نظامی کی خواہش پر علامہ شبلی نے تصوف کے موضوع پر تقریر کی جسے چند لوگوں نے مل کر نقل کیا اور جسے نظام المشائخ دہلی کے 1909 کے کسی شمارے میں شائع کیا گیا۔ نظام المشائخ کا یہ شمارہ راقم کو اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس لیے تصدیق نہیں کی جا سکی کہ وہ خطبہ خطبات شبلی میں شامل ہے یا نہیں؟

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خطبہ سے خواجہ حسن نظامی کے متاثر ہونے کا ذکر کیا حیات شبلی میں مولوی اکرام اللہ خاں (م: 16 جنوری 1952) ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ کے حوالہ سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔''[11]

ضیاء الدین احمد برنی جو اس خطبہ کے سامعین میں تھے اپنی کتاب 'عظمت رفتہ' میں لکھتے ہیں:

''تقریر سے قبل ہم میں سے بہت سوں کا خیال تھا کہ چونکہ علامہ صوفی منش بزرگ نہیں اس لیے تصوف جیسے موضوع پر ان کی تقریر بالکل خشک ہوگی، لیکن جب انھوں نے تقریر ختم کی تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں نے کم سے کم یہ محسوس کیا کہ علامہ تو چھپے رستم ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنید یا بایزید بسطامی کے پایہ کا کوئی درویش ہے جو تصوف کے رموز و نکات کے دریا بہائے چلا جا رہا ہے۔ تقریر کے بعد جس عقیدت مندی سے حاضرین نے ان کے ہاتھ چومے وہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔''[12]

تاثرات میں ایک جگہ ملا واحدی نے منصف مزاج مستشرقین کا ذکر کیا ہے، اس میں علامہ شبلی کا ایک قول نقل کیا ہے:

''بعض منصف مزاج مستشرقین یورپ حضورؐ کی زندگی کے وہ محاسن اور کمالات بیان کر جاتے ہیں کہ بڑے بڑے ذی علم مسلمانوں کی نظر ان تک کم جاتی ہے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی راکھ کے ڈھیر میں سونے کے ذرے نکال لیتے ہیں، منصف مزاج ہی نہیں متعصب مستشرقین نے بھی صف انبیاء کا ہیرو حضورؐ ہی کو قرار دیا ہے۔''[13]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا واحدی نے شبلی کی تحریروں کو بڑے غور سے پڑھا تھا، مگر حوالہ نہیں دیا ہے کہ انھوں نے یہ قول کہاں سے نقل کیا ہے۔

تاثرات کا ایک عنوان 'مولانا ابوالکلام کی یاد' ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان سے پہلی ملاقات کان پور ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات کی تفصیل میں علامہ شبلی کا بھی ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء کا دلی میں اجلاس تھا جس کی صدارت کرنے مصر سے علامہ رشید رضا آئے تھے۔ مولانا شبلی، مولوی حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور خدا معلوم کتنے بڑے بڑے علما مطبع مجتبائی میں مقیم تھے۔ مولانا ابوالکلام کا کمرہ مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن کے کمروں کے درمیان تھا۔ ایک طرف مولانا شبلی دوسری طرف مولوی حبیب الرحمٰن شروانی، صرف دو ہی شخص ایسے تھے جن سے شاید ابوالکلام متاثر رہے ہوں۔ لیکن میں اور خواجہ حسن نظامی کئی مرتبہ مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے پاس گئے۔ مولانا ابوالکلام کو ایک مرتبہ بھی ان دونوں کے کمروں میں قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ شام کے وقت سب علما ٹکڑیاں بنا کر صحن میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس وقت مولانا ابوالکلام بھی باہر نکلتے تھے اور مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ میری دوسری ملاقات مولانا ابوالکلام سے اسی شام کی مجلس میں ہوئی۔''[14]

ندوۃ العلما کا وہ اجلاس جس کی صدارت علامہ رشید رضا نے کی تھی وہ تو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور مطبع مجتبائی دہلی میں تھا۔ راقم یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ملا واحدی جو خود اس اجلاس میں شریک تھے انہیں کیسے التباس ہوا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ ندوہ کا 1910 کا اجلاس دہلی میں ہوا تھا غالباً ملا واحدی اور خواجہ حسن نظامی اس میں شریک ہوئے ہوں اور 1912 کے لکھنؤ اجلاس میں بھی شریک رہے ہوں اس وجہ سے دونوں کی روداد بیان کرنے میں لکھنؤ اور دہلی میں شبہہ ہو گیا ہو۔ البتہ ملا واحدی نے اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی عربی دانی اور خطابت کا جو ذکر کیا ہے اسے سید صاحب نے بھی حیات شبلی میں قلم بند کیا ہے۔ ملا واحدی لکھتے ہیں:

''علامہ رشید رضا نے خطبہ لکھا نہیں تھا، علامہ برجستہ بولے تھے۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی (استاد مولانا شبلی) کے ذمہ تھا کہ ترجمہ کریں گے، مگر ترجمہ کرنے لگے تو تبحر عالم ہونے کے باوجود سٹ پٹا گئے، مولانا شبلی نے فوراً مولانا ابوالکلام کو اشارہ کیا۔ مولانا اگلی صف سے اٹھے اور اسٹیج پر پہنچے اور حاضرین سے کہا کہ الگ الگ فقروں کا ترجمہ نہیں کروں گا۔ صاحب صدر کی تقریر ختم ہونے دیجیے پوری تقریر کا ترجمہ ایک ساتھ کر دوں گا۔ چنانچہ تیئس سالہ ابوالکلام نے ایسا مربوط ترجمہ سنایا کہ بوڑھے اور متبحر علما کو متحیر کر دیا۔''[15]

ملا واحدی کے اس اقتباس سے جہاں مولانا آزاد کی عربی دانی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں پہلی بار یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ رشید رضا کی تقریر کے ترجمہ کی ذمہ داری مولانا فاروق چریا کوٹی کے ذمہ تھی۔

ملا واحدی کے ان چند اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف علامہ شبلی سے ملے تھے، ان کی تحریروں کو بغور پڑھا تھا بلکہ ان سے متاثر بھی تھے۔

حواشی

(1) تاثرات ص 22
(2) ایضاً، ص 21
(3) عظمت رفتہ ص 265
(4) میرا افسانہ ص 68
(5) تاثرات ص 46
(6) عظمت رفتہ ص 261
(7) حیات شبلی ص 748
(8) تاثرات ص 46
(9) ایضاً، ص 47
(10) میرا افسانہ ص 68
(11) حیات شبلی ص 748
(12) عظمت رفتہ ص 266
(13) تاثرات ص 3-102
(14) ایضاً، ص 258
(15) ایضاً ص 259

■

Dr. Mohd Ilyas Azmi
Shaesta Manzil, 641, Ghulami Kapura
Behind Awas Vikas
Azamgarh- 276001 (UP)
Mob.:9838573645

منیر شریف کی چھوٹی بڑی درگاہوں کی تاریخی اہمیت

مہتاب جہاں

2014 میں پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا۔ پٹنہ ویسے تو کئی بار گئی ہوں مگر اس دفعہ کئی مشہور و معروف جگہوں کی زیارت کی اور پٹنہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان معروف جگہوں میں بہار شریف، پھلواری شریف، نالندہ کے کھنڈرات، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ کالج، مخدوم جہانیاں کا مقبرہ جسے مخدوم کنڈ بھی کہا جاتا ہے۔ کماؤ، گول گھر، تارا منڈل یہ تمام جگہیں دیدنی ہیں اور بہار کی تاریخ میں اہم حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں، ایک جگہ جس نے اپنی طرف ایک خاص وجہ سے توجہ مبذول کرائی وہ مقدس و پاک جگہ تھی۔ 'منیر شریف' اور اس میں واقع چھوٹی اور بڑی درگاہیں۔ چھوٹی درگاہ کو دیکھ کر ایک عجیب و غریب کیفیت اور ایک ہیبت کا عالم طاری ہوتا ہے۔ اس عمارت کی عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ پُرشکوہ عمارت اپنے پورے وقار کے ساتھ اس سرزمین پر ایستادہ ہے۔ اور یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے اور آنکھیں خیرہ کہ کوئی پرسان حال نہ ہونے کے باوجود یہ عمارت صحیح و سالم ہے۔ اس عمارت کی خوبصورتی دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور اس عمارت کا جلال و دبدبہ نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ شاید اس کی وجہ وہ پاک روحیں ہیں، جو اس میں دفن ہیں۔ میں دہلی کی رہنے والی ہوں اور یہاں بے شمار مغلیہ اور سلاطین دور کی عمارتیں اپنی پوری شان و شوکت سے دہلی و ہندوستان میں اپنے جلوے بکھیر رہی ہیں۔ خاکسار کو کئی طرح کی عمارتیں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں جب بھی بہار جاتی ہوں۔ منیر شریف جائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ گھنٹوں اس عمارت کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک بے حد پرسکون اور ویران جگہ پر واقع یہ عمارت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی ہے۔ آس پاس آبادی بھی بسی ہوئی ہے جس نے عمارت کے اطراف کو کافی غلاظت اور گندگی سے آلودہ کیا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی یہ پاکیزہ جگہ ایک عجیب سا تاثر دل پر چھوڑتی ہے۔ یہ عمارت پٹنہ سے 30-25 کلومیٹر مغرب میں نیشنل ہائی وے پر واقع ایک تاریخی شہر میں ہے جو عہد وسطیٰ میں کافی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مگر اس عمارت اور اور منیر شریف کے بارے میں بات آگے بڑھانے سے پہلے یہ لازمی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کے تاریخی پس منظر پر نگاہ ڈالی جائے۔

منیر شریف کا تاریخی پس منظر:

صوبہ بہار میں اسلامی حکومت کا آغاز محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات سے ہوا۔ لیکن بعض واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن بختیار خلجی سے پہلے مسلمانوں نے یہاں قدم جمانا شروع کردیے تھے۔ مقامی روایات کے مطابق منیر کو پہلے سلطان محمود غزنوی کے سپاہیوں نے فتح کیا تاریخ سالار مسعود غازی سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود غزنوی کی وفات سے دو سال پہلے اس کا لشکر اُس کے بھانجے سالار مسعود غازی کی ماتحتی میں ہندوستان آیا۔ مسعود نے سترکھ کے مقام پر قیام کر کے مشرقی علاقوں پر چڑھائی کی۔ اکثر راجاؤں نے اکٹھا ہوکر مقابلہ کیا۔ لیکن ان میں بعض ایسے تھے جو پہلے سے سلطان محمود سے تعلق رکھتے تھے۔ اور بعض کا خیال تھا کہ ایک بھاری لشکر مسعود کی مدد کے لیے غزنی سے روانہ ہونے والا ہے۔ بہرحال مسعود نے اکثر راجاؤں کو شکست دے کر ان کی متحد طاقت کو ختم کردیا۔ لیکن بالآخر وہ خود بھی قتل ہوا اور بہرائچ میں دفن ہوا اور اس کے بعد تقریباً 160 سال تک سلاطین غزنین کا کوئی لشکر اس طرف نہیں آیا۔ جن مقامات پر مسعود غازی کے سپاہیوں نے جنگ کی۔ اور مقتول ہوکر مدفون ہوئے۔ عام طور سے ایسے علاقے گنج شہیداں کے نام سے مشہور ہیں۔ کڑہ مانکپور کے اطراف، غازی پور، سیوان (ضلع سارن) اور ان کے علاوہ خاص قصبہ منیر میں ایسی جگہ موجود ہے جہاں اس واقعہ کی یادگار میں سالانہ میلاد ہوا کرتا ہے۔ جو 'غازی میاں کے میلے' کے نام سے مشہور ہے۔ منیر کے مخدوم زادوں کے سفینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 1178 میں حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار نے راجہ منیر کو شکست دے کر منیر پر قبضہ کیا قطب سالار کا مزار منیر سے دو میل پورب میں موضع مہدواں میں مسجد کے پیچھے میدان میں واقع ہے اس جنگ میں جو مسلمان شریک تھے ان میں 25 آدمیوں کے نام بھی سفینوں میں مذکور ہیں ان سفینوں کی رو سے حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار کے آنے سے پہلے ایک مسلمان مومن عارف منیر میں رہتا تھا جس کو راجہ منیر سخت اذیتیں دیتا تھا۔ مومن نے اس راجہ سے تنگ آکر مدینہ کی راہ لی اور وہاں جاکر حضرت تاج فقیہ کو اپنا حال بیان کیا۔ حضرت تاج فقیہ جن کا اصل وطن خلیل الرحمٰن (ہبرون) تھا وہ ایک گروہ کو لے کر غزنی ہوتے ہوئے منیر پہنچے اور راجہ منیر سے جنگ کر کے منیر پر قابض ہوگئے۔ بہرحال اس زمانے میں مومن عارف یا کسی مسلمان کا منیر کا باشندہ ہونا اس طرح ہوسکتا ہے کہ مسعود غازی کے ساتھیوں میں سے کسی نے شاید منیر آکر سکونت اختیار کرلی ہو اور اس کی نسل میں مومن عارف، تاج فقیہ اور قطب سالار کے زمانے میں منیر کا باشندہ تھا۔

منیر اور مخدوم شرف الدین احمد:

مخدوم شرف الدین کی حیثیت صوبہ بہار میں ایک روحانی بادشاہ جیسی ہے محمد تاج فقیہ کی اولاد نے اسلام کی تبلیغ اور خدمت خلق کا جو نمونہ پیش کیا ہے اس میں اس جیسی جامع اور منظم تحریک کی مثال برصغیر پاک و ہند میں منفرد ہے اس خاندان نے جو خاندان مخدوم کے نام سے مشہور و موسوم ہے 1608-1178 تک یعنی چار سو تیس سال تک تبلیغ اشاعت دین اور خدمت خلق کا سلسلہ بہت ہی پامردی، تڑپ اور بصیرت کے ساتھ جاری رکھا اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ شرف الدین احمد کی بدولت مشرقی ہندوستان اور بہار میں دین اسلام کو تقویت حاصل ہوئی۔

انھوں نے صرف اپنی تقریری صلاحیت سے ہی کام نہیں لیا بلکہ تحریر کے ذریعہ بھی تبلیغ اور درس و تدریس کو ملفوظات اور مکتوبات کی شکل میں پھیلایا اسلامی مسائل اور دوسری چیزوں کو جہاں اس کی وضاحت کی اشد ضرورت تھی آپ نے اس کام کو انجام دینے کی سعی قوی کی۔ ان کی تصانیف اسلامی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ آپ کی کل 35 تصانیف بتائی جاتی ہیں ان میں مکتوبات صدی، مکتوبات، ملفوظات، فارسی کتاب آداب المریدین،

مکتوبات دوصدی مکتوبات تین صدی، مکتوبات جوابی اور ملفوظات میں معدن المعانی وخوان پُر نعمت وغیرہ اہم و مشہور ہیں۔ مخدوم شرف الدین کوتعبیر گوئی پر بھی پورا ملکہ حاصل تھا اس کا ثبوت ہمیں معدن المعانی میں تعبیر خواب کے ایک خاص باب کے حوالے سے ملتا ہے۔ شیخ شرف الدین احمد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا خاندان علم وادب کا گہوارہ تھا۔ آپ شاعر بھی تھے۔ اور مشرف آپ کا تخلص تھا۔ آپ کے فالنامے، فقیری نسخے، اور دوہے اور ریختہ گوئی کے اسلوب قابلِ رشک ہیں۔ شرف الدین احمد کی والدہ بی بی رضیہ بہت ہی عبادت گزار اور بزرگ خاتون تھیں۔ مخدوم شرف الدین نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی پائی۔ آپ نے 29 برس کی عمر میں اپنے استاد ابوتوامہ سے کلام پاک کی تفسیر، حدیث، فقہ، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم مکمل کی۔ دوران تعلیم ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ اور علم تصوف کا بھی مطالعہ کیا جسے انھوں نے اپنے مکتوبات میں تحریر کیا ہے۔ دوران تعلیم ہی آپ کی شادی ان کے استاد مکرم کی بیٹی سے ہوگئی۔ دوران تعلیم آپ گھر سے دور تھے اور جتنے خطوط بھی گھر سے آتے آپ نے ایک بھی نہیں کھولا، مگر جب فراغت پائی تو ان تمام موصولہ خطوط کو کھولا تو اس میں ان کی والدہ کی موت کی خبر تھی اس خبر سے آپ دل برداشتہ ہوکر گھر پہنچے مگر وہاں قلیل مدت کے لیے ہی رکے کیونکہ آپ کا دل بے قرار تھا۔ اور آپ کو اس کے مداوے کے لیے ایک عابد وزاہد کی تلاش تھی اس تلاش کی بنا پر آپ حضرت نظام الدین اولیا اور شیخ نجیب الدین فردوسی کے پاس بھی پہنچے اور بیعت لی۔ اور وہاں سے رخصت ہوکر گھر کو روانہ ہوئے۔ مگر راستہ میں جب آپ ضلع آرہ کے بہیا کے جنگل میں پہنچے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور آپ گریبان چاک کرکے جنگل میں نکل گئے۔ آپ کے بھائی نے جنگل میں بہت ڈھونڈا مگر وہ ناکام گھر واپس لوٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے تیس برس جنگلوں میں عبادت کی جن میں بارہ سال بہیا کے جنگل اور کئی سال راج گیر کے علاقوں میں رہے۔ راج گیر پہاڑوں کے دامن میں ہرا بھرا جنگل سے بھرا ایک بے حد خوبصورت اور صحت افزا مقام ہے۔ اس مقام کی اپنی ایک تاریخ و اہمیت ہے۔ راج گیر کا اصل نام راج گری ہے یعنی بادشاہوں کی رہائش گاہ۔ مہابھارت کے زمانے میں اس جگہ کو گرب راج کہا جاتا تھا۔ یہ تاریخی شہر ادیان ہند کا مرکز تھا۔ اجات شترو کا دارالحکومت اور جین مذہب کی تبلیغ کا بھی مرکز تھا۔ اور گوتم بدھ نے بھی اپنی زندگی کے آخری ایام یہیں گزارے۔ آخر میں یہاں برہمنوں کی ایک آبادی بس گئی۔ بدھ مذہب کی پہلی تاریخی کونسل یہیں منعقد ہوئی تھی۔ یہاں کئی گرم پانی کے چشمے ہیں جن میں مخدوم کنڈ سب سے مشہور ہے یہیں پر شیخ شرف الدین احمد کا حجرہ بھی ہے۔ اس وجہ سے بھی یہ جگہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ آپ نے ساٹھ برس تک بہار شریف میں تبلیغ اسلام کی۔ آپ کی روحانیت، شہرت اور اہلیت ودرویشی کا حال سن کر سلطان محمد تغلق نے بہار شریف میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور پرگنہ راج گیر بھی ایک فرمان کے ذریعہ نذر کیا تاکہ اس سے خانقاہ کے اخراجات اس کی آمدنی سے پورے ہوسکیں۔ مگر مخدوم صاحب کو یہ پسند نہیں آیا اور انھوں نے اس کو لوٹا دیا۔ آپ کے والد یحییٰ منیری نے بھی بختیار خلجی کو اپنے والد تاج فقیہ کی فتح کردہ حکومت منیر حوالہ کردی تھی۔ یعنی آپ کا خاندان گویا فقیری میں بادشاہ تھا۔ آپ کی منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنے ملفوظات میں اکثر خود لکھا ہے کہ میں تو اسلام کے لائق بھی نہیں ہوں اور کئی جگہ خود کو بدبخت اور ذلیل وغیرہ بھی تحریر کیا۔ غرور اور ظاہرداری سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ آپ کا لباس بے حد سادہ اور غذا میں صرف خشک روٹی، چاول، یا کھچڑی کھایا کرتے تھے۔ آپ کا وصال 782ھ بروز جمعرات نماز عشاء کے وقت ہوا اور آپ نے تقریباً 121 سال عمر پائی۔

منیر شریف کی چھوٹی بڑی درگاہیں:

ان درگاہوں اور منیر سے متعلق اہم معلومات ہمیں انگریزی زبان میں مستند تحریروں کے حوالے سے ملتی ہیں ان میں سے سب سے پہلے 14-1812 میں بکانن (Buchanan) کی تیار کردہ پٹنہ اور گیا سے متعلق رپورٹ ملتی ہے۔ اس کے کچھ مدت بعد جنرل کننگھم (Cunninghim) نے اور اس کے بعد بلاک (Bloch) نے 1902 میں آثار قدیمہ کے تعلق سے رپورٹیں تھیں جن مین ضخیم کننگھم کی تھی۔ اس کے بعد 1924 میں مولوی حمید قریشی نے بہار اور اڑیسہ کے تحفیظ شدہ آثار سے متعلق فہرست مرتب کی جس میں منیر کی درگاہوں کا تفصیل سے ذکر ہے۔ 1927 میں L.S.S.O.Malley کے گزیٹیرز (Gazetteer) کے نظرثانی شدہ ایڈیشن کی بھی اشاعت ہوئی۔ حافظ شمس الدین منیری نے بھی ایک طویل مضمون میں منیر کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے بارے میں مفصل بیان کیا ہے۔ جو 1930 میں تحریر ہوا۔ 1963 میں ڈی۔ آر۔ پاٹل کی کتاب بہ عنوان (Autiquarian Remains in Bihar) جس میں منیر کی تاریخی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ سید حسن عسکری اور قیام الدین احمد نے بھی منیر کی عہد وسطی کی تاریخ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ 1973 میں قیام الدین احمد کی ایک کتاب Corpus of Arabic & persian inscription of Bihar کے عنوان سے شائع ہوئی جو بہت تفصیلی اور تحقیقی کتاب ہے۔

بڑی درگاہ:

یہ درگاہ منیر شریف کے دیگر مقدس مقامات میں خاص طور سے متبرک ہے۔ یہ تالاب سے متصل مرتفع ٹیلہ پر مشرق کی جانب واقع ہے اس کے روضہ کا احاطہ وسیع ہے اور دیواروں کی حد بندی کی ہوئی ہے اس میں دو بڑے دروازے ایک جانب مغرب اور دوسرا شمال کی طرف ہے مشرقی جانب ایک مسجد ہے جو پہلے تین عالیشان گنبدوں کی بنی ہوئی تھی چند سال ہوئے موجودہ صاحب سجادہ کے اہتمام سے نئے طریقے سے تعمیر ہوئی ہے۔ جس کے بیچ کا دروازہ اپنی اصلی حالت پر ہے اس کے آگے ایک صحن ہے۔ اتر کی طرف ایک سنگی دالان اور حجرہ ہے صحن سے متصل حضرت مخدوم کے وضو کرنے کا چبوترہ ہے۔ بیچ احاطہ میں ایک چبوترے پر حضرت ولی اعظم سلطان المخدوم حضرت شاہ یحییٰ منیری قدس سرّہٗ کا مزار اقدس ہے۔ آپ کے قریب آپ کی والدہ ماجدہ اور والد محترم اور عم محترم کے مزارات ہیں۔ ایک چھوٹے احاطے میں ملک کے ممتاز بزرگ حضرت مخدوم جہاں شاہ شرف الدین احمد کی اہلیہ محترمہ اور دو صاحبزادیاں مدفون ہیں۔ حضرت مخدوم کے زیر پائین آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مخدوم جلیل الدین احمد منیری فردوسی کا مرقد مبارک ہے۔ آپ کے دوسری جانب حضرت شاہ ہدایت اللہ منیری رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کی شریک حیات کا اور آپ سے متصل حضرت مولانا شمس الدین مازندرانی مدفون ہیں۔ وغیرہ

مغربی دروازے کے قریب تاج الدین کھانڈ گاہ کا مزار ہے جو سلطان محمود غزنوی کے خاندان کے ایک رکن تھے۔ حضرت مخدوم کے خاندان کے بیشتر افراد اسی احاطے میں دفن ہیں شمالی پھاٹک کے باہر ایک کھلی ہوئی مسجد ہے، جس کو شاہان دہلی کے کئی بادشاہ کے دو خواجہ سراؤں نے تعمیر کرایا تھا۔ اور حسب وصیت یہیں سپرد خاک بھی ہوئے مسجد سے متصل اس زمانے کے دو کمرے ہیں اس سے کچھ دور ایک سنگی مجسمہ ہے جسے وہاں کے عوامی لوگ شہدول یا سادول کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ قدیم زمانے کی یادگار ہے۔ دراصل یہ مجسمہ ایک شیر کا ہے جو ایک ہاتھی کے بچہ کو اپنے پیروں کے بیچ لیے ہوئے ہے بقول مولوی حمید قریشی کے یہ بڑی درگاہ راجہ منیر کا قلعہ تھی جس کا ثبوت یہ مجسمہ ہے جو درگاہ کے دروازہ پر ایستادہ ہے۔ اور اسی کے آثار کا ایک نشان یا حصہ ہے اس کے علاوہ مقامی روایتوں کے مطابق بھی اسے امام تاج فقیہ کے ذریعہ قلعہ کی فتح کی ایک یادگار کے طور پر

بیان کیا جاتا ہے وغیرہ۔ اس درگاہ کے احاطہ میں سیکڑوں پختہ مزارات اولیا اور شاہزادوں کے ہیں اور جابہ جا قناتی مسجدیں بھی ہیں۔ بڑی درگاہ کے احاطہ کو اس کے سائبان اور مسجد کو دوسری بار ابراہیم خان کانکر مغل امیر جو کہ صوبہ گجرات کا صوبہ دار تھا۔ 1014ھ میں تعمیر کرایا تھا۔

چھوٹی درگاہ:

یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلطان المخدوم شاہ یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے ممتاز بزرگ حضرت قطب الاقطاب مخدوم امام یزید الملقب بہ شاہ دولت منیریؒ آرام فرما ہیں۔ یہ مقبرہ آپ کے مرید ابراہیم خاں کانکر صوبہ دار گجرات نے تعمیر کرایا ہے۔

تعمیر روضہ کا جب خیال ہوا تو حضرت سے آپ کی زندگی ہی میں اس کی اجازت طلب کی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے بزرگوں نے آسمان کا سایہ اختیار کیا ہے، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے کہا مجھے تعمیر کی اجازت دی جائے تاکہ میں بھی مرنے کے بعد اس میں دفن کیا جاؤں۔ اس طور پر اس عالیشان عمارت کی بنیاد پڑ گئی۔ ابراہیم خاں کانکر بہت غریب تھے۔ آنحضرت کی سفارش سے عبدالرحیم خان خاناں نے ان کو گجرات میں جگہ دی، ابراہیم خاں کانکر اپنی دلاوری اور حسن خدمت سے معزز ہوکر شاہی ملازمت تک بلند ہوئے اور توزک جہانگیری کی تحریر کے مطابق عہد جہانگیری میں دلاور خاں کے خطاب سے سرفراز کیے گئے اور تمام عمر کاٹھیاوار اور گجرات میں خدمت جلیلہ انجام دیتے رہے۔ گجرات ہی میں انہوں نے روضہ اور تالاب کا خاکہ تیار کیا، اور تنگر قلی خاں بدخشانی ماہر تعمیرات کو اس نقشہ اور لوازمہ ٹھیک کرنے پر مامور کیا، یہ عالیشان مقبرہ سرتاپا سنگ چنار کا بنا ہوا ہے۔ صوبہ کی اور عمارتوں میں یہ عالیشان اور بہت خوبصورت عمارت ہے۔ 58 فٹ مربع اور دو فٹ اونچے چبوترہ پر واقع ہے۔ باہر کی چہار دیواری، 252 فٹ چوڑی اور دس فٹ اونچی ہے۔ چاروں کونے پر بارہ پہل کی برجیاں ہیں، جنوب مشرق کی جانب جو برجی ہے اس کے دو تلے پر نہایت نفیس پتھر کی جالیاں ہیں، جس حصہ پر مقبرہ ہے وہ باہر سے 34 فٹ 8 انچ مربع ہے اور اس کے چاروں طرف 11 فٹ 8 انچ چوڑا برآمدہ ہے۔ برآمدہ کی چھت اعلیٰ قسم کی سنگ تراشی اور نقاشی کا نمونہ ہے۔ چھت میں جابہ جا آیات قرآنی بھی کندہ ہیں۔ اس سنگ تراشی کا مقابلہ فتح پور سیکری کی بہترین سنگ تراشی اور نقاشی سے کیا جاسکتا ہے۔ اندر سے مقبرہ 13 فٹ مربع ہے اور ہر طرف چار بڑے ستون ہیں۔ ستونوں کے درمیان نہایت پتلی دیوار ہے۔ محراب کی جالیوں پر عربی خط میں اللہ کافی لکھا ہوا ہے۔ اور ستونوں کے بریکٹ پر پتھر کی سلیاں رکھ کر اس کو ہشت پہل پھر دائرہ بنایا گیا ہے۔

مقبرہ کے اندر کی قبروں میں بیچ کی قبر حضرت مخدوم شاہ دولت منیریؒ کی ہے۔ پائین کی دو قبروں میں پورب کی قبر آپ کی اہلیہ محترمہ کی اور پچھم بانی مقبرہ ابراہیم خان کانکر کی ہے۔

ابراہیم خاں کا انتقال 1028ھ میں ہوا۔ اور حسب وصیت اندرون مقبرہ اپنے محترم پیر کے پہلو میں دفن ہوئے۔

شمال اور مغرب کی طرف پتھر کے ستونوں پر کھلی ہوئی گیلریاں ہیں۔ پچھم والی گیلری کے وسط میں ایک خوشنما لداؤ چھت کی شاندار مسجد ہے۔ اس میں ایک کتبہ ہے جس کی اول دو سطروں میں آیات قرآنی اور آخر سطر میں سنہ تعمیر 1028ھ۔ 1618 کندہ ہے۔ قطعۂ تاریخ

چوں این عالی بنائے کعبہ تمثیل جہاں آرا
بفیض صانع قادر تمامی اقتضا کردہ
دل عاصی ہمہ جست از خرد سال بنائے او
خرد گفتا جو ابراہیم بیت اللہ بنا کردہ

1028ھ

قطعۂ تاریخ کا ترجمہ: جب اس عالی شان عمارت کی بنیاد دنیا کو سجانے والے کعبہ کی طرح خدا کے فیض سے رکھنے کی خواہش ظاہر ہوئی ہے تو اس نافرمان اور گنہگار دل نے عقل سے اس کو بنانے کی تاریخ تلاش کی تو عقل نے کہا جیسے ابراہیم نے بیت اللہ (کعبہ) کی بنیاد رکھی ہے۔ اس جملے کے اعداد میں تاریخ تعمیر پوشیدہ ہے۔

مسجد کے سامنے ایک چبوترہ پر حضرت مخدوم شاہ مبارک حسین عرف شاہ دھومن منیریؒ، آپ کے والد ماجد آپ کے جدامجد اور بھی خاندان کے بزرگوں کے مزارات ہیں۔ مقبرہ سے دکھن جانب ایک صفہ عالی پر آپ کے دو صاحبزادے حضرت مخدوم شاہ فرید الدین احمد محمد ماہر وفردوسی منیری وحضرت مخدوم شاہ محمد علیؒ اور آپ کے سجادگان حضرت شاہ قطب الدین احمد فردوسی منیری و حضرت شاہ امجد حسین چشتی النظامی الفردوسی المنیری، حضرت سید شاہ ابوالظفر فرید الدین احمد فردوسی منیری حضرت سید شاہ ابولفرح فضل حسین قادری منیری اور حضرت سید شاہ دولت علی محمد امان اللہ فردوسی منیری اور بھی خاندان کے بہت سے حضرات آسودہ خاک ہیں۔

مقبرہ کے پورب جانب حضرت شاہ اعظم علی عرف فردوسی بھیکن منیری المتوفی 1270ھ ابن حضرت سید شاہ ابوالفرح شاہ لطف علی فردوسی منیری حضرت شاہ نظام الدین منیری 1297ھ، حضرت سید شاہ خلیل الدین احمد جوش منیری، حضرت شاہ اولاد علی زاہدی الفردوسی المنیری المتوفی 1307ھ اور حضرت سید شاہ احتشام الدین حیدر المتخلص بہ مشرقی منیری اور بہت سے لوگوں کے مزارات ہیں۔

مسجد کے دکھن جانب سائبان میں ایک زمین دوز کمرہ ہے جس میں جانے کے لیے زینے بنائے گئے ہیں۔ درگاہ سے تالاب کے طرف جانے کے لیے ایک سنگی دروازہ ہے۔ جنوب مغرب گوشہ پر ایک خوبصورت کمرہ اور جنوب مشرق گوشہ پر ایک ناغول (چھت دار زینہ) ہے۔ جس کی دیوار اعلیٰ قسم کے پتھر کی جالدار بنائی گئی ہے۔ تالاب کی طرف دو ناغول ہیں جو بہت خوب ہیں۔ مقبرہ سے شمال کی جانب عظیم الشان صدر پھاٹک ہے جو 5 فٹ 9 انچ چوڑا ہے، طرز تعمیر مغلیہ ہے۔ پھاٹک کے دونوں طرف ہشت پہلو خوبصورت برجیاں ہیں، جن پر جانے کے لیے زینے بنے ہوئے ہیں۔ دروازہ کے باہر 30 فٹ لمبا اور 12 فٹ چوڑا خوبصورت سنگی چبوترہ ہے۔ صدر پھاٹک پر تین کتبے ہیں جن میں دو عربی میں اور ایک فارسی میں ہے۔

چو درین روضۂ مقدس شاہ ۔۔۔ روئے زینت نہادہ براتمام
سال تاریخ من از او جستم ۔۔۔ خردم بہر این خجستہ مقام
بدعا لب کشودہ گفتا ۔۔۔ در دولت کشادہ باد دوام

1028ھ

قطعۂ تاریخ اشعار کا ترجمہ: جب بادشاہ کے اس مقدس روضہ (باغ) نے اس سرزمین کو زینت بخشی ہے یعنی جب اس عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی تو میں نے عقل سے اس کی تاریخ تعمیر دریافت کی تو عقل نے اس مبارک مقام کے واسطے اپنے لب کھولے اور کہا اس دولت وحکومت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں۔ اسی مصرعہ میں تاریخ تعمیر پوشیدہ ہے یعنی 1028ھ۔ 1618ء۔

تالاب کے چاروں طرف دو دو گومتیاں بنائی گئی تھیں۔ پچھم اور پورب کی گومتیاں ابھی قائم ہیں۔ اتر کی گومتیاں بہت شکستہ ہوچکی ہیں۔ دکھن کی منہدم ہوگئی ہیں۔ تالاب میں جانے کے لیے چاروں طرف سے زینے بنائے ہیں اور اس کے دکھن بلندی پر گورنمنٹ کا پُرفضا ڈاک بنگلہ ہے۔

غرض منیر شریف کی یہ دونوں درگاہیں بے حد مقدس اور عہد مغلیہ کی شاندار یادگار ہیں۔

ماخذ:

1۔ تاریخ بہار: چند مقالات، ندیم گیا، خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، اشاعت 1994

2۔ ارض بہار اور مسلمان: عبدالرقیب حقانی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 2012

3۔ آثار منیر: تصنیف سید شاہ مراد اللہ منیری، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ شاعر اول 1948 اشاعت دوم 2010

■

Mehtab Jahan
Dept of Persian
Delhi University
Delhi - 110007

اورنگ آباد کے صوفیائے عظام
حیات اور تعلیمات

قاضی نوید احمد صدیقی

اورنگ آباد جہاں ایک طرف علمی، ادبی اور تاریخی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے وہیں دوسری طرف یہ شہر خجستہ بنیاد روحانیت کے مرکز کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت میں اس شہر کو ایک طرح سے مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ اندرون و بیرون تاجروں کی آمد کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام بھی اس شہر کو گوشۂ عافیت جان کر یہیں مقیم ہو گئے۔ انھوں نے اپنی خانقاہیں اور تکیہ جات تعمیر کروائے۔ سلسلہ مشائخین چشتیہ کی بنیاد اورنگ آباد میں ڈالنے والے بزرگ تھے۔ حضرت شاہ نور حمویؒ 1666 میں اورنگ آباد آئے۔ بچپن ہی میں آپ کے والد عبداللہ بن سید ابوالعلی کا انتقال ہو چکا تھا۔ آپ نے علومِ ظاہری و باطنی اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کیے۔ آپ حضرت شرف الدین قطب حمویؒ سے بیعت تھے۔ آپ کا وصال 1698 میں ہوا۔ ان کے خلیفہ سید شہاب الدین نے اپنے پیر و مرشد کے مزار پر ایک گنبد بنوایا اور تکیہ میں مسجد اور خانقاہ بھی تعمیر کروائی اور ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس میں تقریباً دو سو طلباء کے قیام و طعام کا انتظام تھا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت کے اواخر میں مرہٹوں نے مغلیہ علاقوں پر تاخت شروع کر دی تھی۔ اس لیے اورنگ زیب بذات خود مرہٹوں کا قلع قمع کرنے دکن چلے آئے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرتا چلوں جو میں بچپن سے سنتا آیا ہوں اور ڈاکٹر مرزا محمد خضر بیگ نے بھی اپنی کتاب 'تاریخ کے جھروکے سے' میں رقم کیا ہے۔ ایک دن اورنگ زیب نے اپنے معتمد خاص امانت علی کو اہم دستاویزات دہلی سے لانے کا حکم دیا۔ امانت علی وقت مقررہ پر دستاویزات لے آئے لیکن اورنگ زیب نے جب دستاویزات ملاحظہ کیے تو ان میں ایک اہم فائل نہیں تھی جس کی وجہ سے اورنگ زیب کو کئی شکوک و شبہات نے مضطرب کر دیا۔ امانت علی پر غصہ و سرزنش کی وہ مار پڑی کہ خدا کی پناہ۔ آخر امانت علی شاہ نور حمویؒ کی روحانی قوت سے مطلوبہ میعاد میں دہلی سے وہ فائل لانے میں کامیاب ہوئے اور امانت علی شاہی عتاب سے محفوظ رہے۔ اورنگ زیب کو جب تمام روداد معلوم ہوئی تو وہ شاہ نور حمویؒ کے معتقد ہو گئے اور ان کے آستانے پر حاضری دی۔

دولت آباد کے ہندو سنت شری مونی بابا کے اور شاہ نور حمویؒ کے دوستانہ مراسم تھے۔ شری مونی بابا نے اپنے ہاتھ سے شاہ نور حمویؒ کی تصویر بنائی تھی جو آج بھی مونی بابا کی سمادھی کے پجاری کے پاس محفوظ ہے۔ جب شاہ نور بابا کا عرس ہوتا ہے تو صندل و پھول مونی بابا کی سمادھی سے بھی بھیجے جاتے تھے اور جب مونی بابا کی سالانہ یاترا ہوتی تھی تب شاہ نور حمویؒ کی درگاہ سے پھولوں کی چادر روانہ کی جاتی تھی۔ آج تعصب بھرے دور میں یہ سماجی یکجہتی دلوں کے لیے فرحت بخش ہے۔

سید عبدالقادر خادم الاولیاء کا شمار بھی اورنگ آباد کے بزرگوں میں ہوتا ہے۔ آپ کا سلسلہ راست حضرت غوث اعظم سے ملتا ہے یہاں آ کر وہ حضرت شاہ نور حموی کے مرید ہو گئے اور حضرت نور حموی نے انھیں خلافت بھی دی۔ اورنگ زیب آپ کے حلقہ بگوش تھے بالخصوص اورنگ زیب کی بیوی نواب بائی قادرالاولیاء کی مریدہ تھیں۔ آپ کا وصال 1098 میں ہوا۔ آپ کی درگاہ محلّہ اسمٰعیل پورہ اندرون ظفر دروازہ واقع ہے لیکن عوام الناس میں یہ محلّہ نواب پورہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فاروق محمد خان صاحب مرحوم کے ایک مضمون کے مطابق نواب بائی کے نام پر اس محلّہ کا نام نواب پورہ ہوا۔ قادرالاولیا نے بھی ایک خانقاہ اور مسجد تعمیر کروائی تھی، آپ کا کتب خانہ بھی بہت بڑا تھا، اس میں بہت سارے مخطوطات اور قرآن مجید کے نسخے تھے۔

شہر اورنگ آباد کی مذہبی و ثقافتی زندگی میں بابا سعید پلنگ پوش اور بابا شاہ مسافر کی خدمات قابل تعریف اور ناقابل فراموش ہیں جن کے فیوض و برکات آج بھی جاری ہیں۔ تاریخ عالم میں پن چکی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ پن چکی کا شمار ہندوستان کے مشہور تاریخی مقامات میں ہوتا ہے اور اس مقام کو دیکھنے کے لیے ہر برس ہزاروں سیاح ملک و بیرون ملک سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ پن چکی کو اور اس کی وجہ سے شہر اورنگ آباد کو جو مقام حاصل ہوا ہے وہ ان دو صوفیائے کرام کا مرہون منت ہے۔ یہ دونوں بزرگ پن چکی کی مسجد سے متصل درگاہ میں محو استراحت ہیں۔

حضرت سعید پلنگ پوش کا نام محمد سعید تھا۔ آپ کی پیدائش دس ہجری میں بخارا کے ایک گاؤں عجدوان میں ایک متمول گھرانے میں ہوئی۔ ایک دن آپ اپنے

ساتھیوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک نورانی بزرگ باباقل کو دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر بزرگ کے پیچھے ہولیے۔ باباقل نے انھیں بہت سمجھایا پر وہ نہ مانے۔ ڈاکٹر ثاقب انور اپنی کتاب 'صریر خامہ' میں لکھتے ہیں کہ باباقل شب کو اپنے حجرہ میں استراحت فرماتے تو آپ حجرے کی دیوار سے لگے کھڑے رہتے کہ پتہ نہیں کب باریابی نصیب ہو۔ ایک مرتبہ باباقل بخارا کی مسجد کے حجرے میں آرام فرما رہے تھے اور محمد سعید حسب عادت دیوار سے لگے کھڑے تھے اتنے میں حجرے سے آواز آئی کون ہے؟ محمد سعید نے جواب دیا ''حضرت آپ کا فقیر'' اس جواب سے باباقل بے حد متاثر ہوئے۔ بڑی محبت اور شفقت سے حجرے میں بلایا، بیعت و خرقہ سے نوازا اور حضور اقدسؐ کی سنتوں کو اپنی زندگی کا شعار بنانے کی تلقین کر کے تربیت شروع کر دی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں باباقل نے حضرت محمد سعید کو مزید تربیت کے لیے اپنے پیر بھائی شیخ درویش عزیزاں کے سپرد کیا۔ کچھ عرصے بعد شیخ درویش عزیزاں نے محمد سعید کی تربیت کی تکمیل کے بعد آپ کو رخصت کیا۔ یہاں محمد سعید کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ عشق حقیقی میں جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی اور آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر صحرانوردی کرنے لگے، یہاں تک کہ آپ لباس کی قید سے بھی آزاد ہوگئے۔ کچھ عرصے یہی حال رہا۔ ایک صاحب نے آپ کو چیتے کی کھال پہنا دی، اس کے بعد آپ کو ہوش آگیا اور آخری وقت تک اسی لباس میں رہے۔ اسی سبب سے لوگ آپ کو پلنگ پوش کہنے لگے۔ آپ نے بہت مسافت کی، تاشقند گئے اور پھر آخر میں اورنگ آباد تشریف لائے اور لشکر شاہی سے وابستہ رہے۔

بابا پلنگ پوش کا وجود سراپا رحمت اور مجسم شفقت تھا۔ بلا تفریق سب پر آپ کا لطف و کرم تھا۔ بچوں، بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں پر ہمیشہ نظر التفات رہتی تھی۔ آپ کو امراء، رؤساء اور عمائدین شہر سے جو کچھ نذریں ملتی تھیں وہ سب آپ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ آپ صرف خانقاہ نشین نہیں تھے بلکہ فوج میں رہ کر ظالموں کے خلاف لڑتے تھے اور معاشرے کو مختلف برائیوں سے پاک کرتے رہے۔ آپ کی وفات 1699 کو گلبرگہ میں ہوئی۔ آپ کا جسد خاکی اورنگ آباد لایا گیا اور یہیں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

عالمگیری عہد کے ایک اور مشہور بزرگ حضرت بابا شاہ مسافر گزرے ہیں۔ آپ کا نام محمد عاشور تھا۔ آپ کے حقیقی ماموں حضرت شاہ محمد سعید پلنگ پوش آپ کے پیر طریقت تھے۔ ماموں نے اپنے ہونہار بھانجے کو کلاہ اور خرقہ اپنے دستِ مبارک سے پہنا کر خلافت عطا کی تھی اور سیاحت کی مزے داریاں چکھاتے ہوئے مسافر کے لقب سے نوازا تھا۔ بابا شاہ مسافر ایک جید عالم بھی تھے۔ یہ آپ کے علم و فضل کا صدقہ ہی تھا کہ پن چکی کو ایک دارالعلوم یا ایک یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، جہاں سیکڑوں طالب علم روزانہ حدیث، طب، تاریخ، فقہ اور ادب کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ حضرت روزانہ عشاء کی نماز کے بعد مثنوی مولانا روم کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں نادر روزگار کتب خانہ تھا جس میں حضرت نے علمی دنیا کے کونے کونے سے ہزاروں قلمی نسخے جمع کیے تھے، جن سے استفادہ کے لیے شمع علم کے پروانے دنیا کے دور دراز مقامات سے چلے آتے تھے۔ اس کتب خانے سے غلام علی آزاد بلگرامی جیسے نامور اہل قلم نے بھی استفادہ کیا۔ حکومت نے ان کتابوں میں سے ہزاروں قلمی نسخوں کو حیدرآباد منتقل کر دیا۔

حضرت بابا شاہ مسافر کے یہاں سیکڑوں فقراء و مساکین اور یتیموں کی مستقل سکونت تھی اس کے علاوہ مسافروں اور مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا۔ ان سب کے قیام و طعام کا انتظام بابا شاہ مسافر

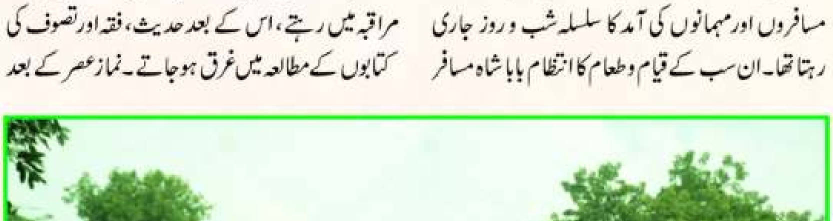

کے یہاں ہی ہوتا تھا۔ ہر روز اتنی بڑی مقدار میں آٹا پیسنا ہوتا تھا اس لیے خانقاہ کے منتظمین نے یہاں کے آبشار سے گرتے ہوئے پانی کی توانائی کو رائیگاں جانے نہیں دیا اور ایسی چکی ایجاد کی جو پانی کی طاقت سے چلا کرتی تھی۔ یہ پن چکی اپنے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی تھی۔

اورنگ آباد کا یہ دور جہاں ہولناک جنگوں، شورشوں کا دور رہا یہ بھی عجیب و غریب بات ہے کہ اسی دور میں اس شہر میں ادب، آرٹ اور کلچر اپنے شباب پر تھا۔ جنگیں، شہر سے باہر ہوتی رہیں اور اندرون شہر امن تھا۔ آزاد نے اس دور کے اورنگ آباد کو 'دارالامن' کہا، جہاں اس شہر میں معاشی اور مادی ترقی ہوئی وہیں یہ شہر علما و صوفیا کا مسکن رہا۔ صرف اور صرف پن چکی کے نقشبندیہ سلسلہ کے صوفیائے کرام کی روحانی تعلیمات اور خدمات خلق کی ایسی ایسی مثالیں نظر آتی ہیں کہ شاید کہیں نظر آئیں۔ اس خدمت خلق کے جذبے سے متاثر ہو کر اُس دور کے حکمراں، روسا اور امرا خطیر نذرانے پیش کر دیتے تھے۔ آصف جاہی دور میں اس درگاہ کو ایک لاکھ روپے سالانہ سے زائد آمدنی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ تکیہ بابا شاہ مسافر ایک عوامی فلاحی ادارہ بن گیا۔ ایک طرح سے یہ ادارہ اپنے دور کا بلاسودی بنک تھا۔

حضرت بابا شاہ مسافر جو نقشبندیہ سلسلہ سے تھے بہت سختی سے احکام قرآن اور شریعت محمدی کے پابند تھے اور اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ آپ نہایت نرم دل تھے، غریبوں اور مسکینوں کی اعانت فرماتے، دکھی دلوں کا مداوا کرتے، کوئی غریب آپ کو دعوت دیتا تو قبول کرتے لیکن امرا اور روسا کی دعوت میں نہیں جاتے تھے۔ آدھی رات گئے عبادت میں مصروف رہتے، فجر سے اشراق تک مراقبہ میں رہتے، اس کے بعد حدیث، فقہ اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ میں غرق ہو جاتے۔ نماز عصر کے بعد حاجت مندوں پر اپنی برکتیں نچھاور کرتے اور مسئلے مسائل کے جوابات دیتے۔ یہ سلسلہ مغرب تک جاری رہتا پھر عشاء تک آپ آرام فرماتے۔ عشاء کے بعد مریدوں کی تربیت کرتے۔ 25 رجب المرجب 1126ھ مطابق 1714 کو آپ اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی تدفین پیر و مرشد بابا پلنگ پوش کے پہلو میں عمل میں آئی۔

انتقال سے قبل بابا شاہ مسافر نے حضرت بابا شاہ محمود کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا اور اپنے خرقۂ خاص سے نوازا۔ بابا شاہ محمود نے تاریخ اورنگ آباد میں ناقابل فراموش

کردارادا کیا۔ آپ نے طویل عمر پائی اور اپنے پیرومرشد کے انتقال کے بعد تقریباً پچاس سال عوام الناس کی خدمت انجام دی۔ عوام کے ساتھ ساتھ امراء و رؤساء بھی آپ کے گرویدہ تھے۔ نواب میر قمر الدین آصف جاہ، نواب ناصر جنگ اور غلام علی آزاد بلگرامی سے آپ کے دوستانہ مراسم تھے۔ مرہٹہ سرداروں سے بھی آپ کے دوستانہ تعلقات تھے جنھوں نے بابا اور خانقاہ کے لیے جاگیریں دی تھیں۔

بابا شاہ محمود میں انتظامی صلاحیت کے ساتھ ساتھ تعمیر کاری کا بھی نہایت اچھا ذوق پایا تھا۔ خانقاہ کی موجودہ عمارتیں سب کی سب آپ ہی کے عہد اور آپ ہی کی نگرانی میں بنیں۔ پن چکی کا باب الداخلہ جو آپ کے نام پر محمود دروازہ کہلاتا ہے، ندی پر بنا ہوا پختہ پل، باہر کا بڑا حوض اور سب سے بڑھ کر پن چکی کی جان یعنی نہر آپ ہی نے بنوائی۔ پن چکی کا موجودہ حسن اور دلکشی تمام تر بابا شاہ محمود ہی کا فیضِ جاریہ ہے۔ تعمیری کام کے علاوہ ان کی ایک قلمی یادگار 'ملفوظات نقشبندیہ' ہے۔ یہ بابا پلنگ پوش اور بابا شاہ مسافر کی تعلیمات وحالات کا آئینہ ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کی تصویر ہے۔ آپ نے جمادی الآخر 1175ھ مطابق 1761 میں وفات پائی اور بابا شاہ مسافر کے گنبد کی سیڑھیوں کے بازو آپ کا مزار ہے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے انتقال (1707) کے بعد دکن میں ہر طرف انتشار اور افراتفری کا ماحول تھا۔ اس ہوش رُبا اور پُرآشوب دور میں جبکہ دینی، علمی اور ثقافتی قدریں بکھر رہی تھیں، حضرت کلیم اللہ شاہ دہلوی نے اپنے عزیز مرید و خلیفہ حضرت شاہ نظام الدین کو رشد و ہدایت کے لیے اورنگ آباد دکن روانہ کیا۔ انھوں نے برہانپور شولاپور اورنگ آباد میں قیام فرمایا، آخر میں انھوں نے اورنگ آباد کو اپنا وطن قرار دیا اور نظامیہ سلسلے کی ایک شاندار خانقاہ قائم کی۔ احسن الشمائل کے مصنف کہتے ہیں" جیسا فیض حضرت شاہ صاحب مدظلہ کی ذات بابرکات سے عالم کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے شاید بزرگان سلف میں کسی سے پہنچا ہو، اس وقت تو فیض چشمہ انہی کی ذات ہے۔"

حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی کا سلسلہ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے واسطے سے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ وہ حضرت شاہ کلیم اللہ کی خدمت میں علوم ظاہری کی تکمیل کے لیے گئے تھے لیکن چوں کہ شاہ صاحب علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی میں بھی یگانہ عصر تھے اور روحانی اصلاح و تربیت بھی بڑی محنت و توجہ سے کرتے تھے اس لیے حضرت نظام الدین کی طبیعت بھی علوم باطنی کی تحصیل کی طرف راغب ہوگئی۔ 'مجالسِ کلیمی' و 'احسن الشمائل' کے پیش لفظ میں معروف شاعر جے پی سعید مرحوم یوں رقمطراز ہیں کہ حضرت نظام الدین نے جو خانقاہ تعمیر کروائی تھی اس کے دس دروازے تھے۔ آپ ضرورتمندوں کو اپنے سجع کی مہر دے دیتے اور وہ شخص اس افسر یا عہدیدار کے پاس پہنچ جاتا اور اس کی مراد پوری ہوجاتی۔ اس لیے کہ ہر امیر حضرت کے حکم کی تعمیل کو اپنے لیے سعادت دارین سمجھتا تھا۔

حضرت کی صحبت میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو شخص ان سے ملتا وہ ان کا گرویدہ ہوجاتا اور آخر بیعت کی درخواست کرتا، ان کے تقریباً ایک لاکھ مرید تھے۔ ابتدا میں وہ کسی کو مرید بنانے میں احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن مرشد کے حکم پر عوام کو بھی حلقہ ارادت میں شامل کرنے لگے۔ حضرت کامگار خاں نے حضرت شاہ نظام الدین کے اخلاق حسنہ کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے کھڑے ہوجاتے اور اس کی تعظیم بجا لاتے۔ انتہا یہ ہے کہ چار سال کے بچے کے ساتھ بھی ان کا وہی طریقہ تھا جو ستر سال کے بوڑھے کے ساتھ ہوتا تھا۔

ان کے خلفاء میں خواجہ نور الدین حسینی (جن کی آخری آرام گاہ اورنگ آباد کے صدر ٹپہ خانہ کے روبرو ہے) اور خواجہ کامگار حسینی (جن کی آخری آرام گاہ حضرت نظام الدین کی درگاہ کے قریب ہے) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے اور اورنگ آباد میں حضرت شاہ نظام الدین کے دامن تربیت سے وابستہ ہوگئے تھے۔ علمی مرتبے کی بلندی مرشد سے گہری عقیدت اور سلسلے کی تعلیم کی گہری دلچسپی کی وجہ سے خانقاہ نظامیہ میں وہ خاص عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

عالمگیری عہد میں ایک اور بزرگ سید حیدر حسینی چشتی نظامی گجرات سے آئے۔ یہ جس جگہ رہتے تھے اسی جگہ انھوں نے ایک خانقاہ اور مسجد بنوائی۔ ان کے داماد اور بھانجے سید شاہ علی درویش جو کہ ایک اچھے انجینئر تھے انھوں نے آٹھ میل طویل ایک نہر اورنگ آباد کے جنوب میں واقع پہاڑیوں سے جاری کی۔ سید شاہ علی درویش کو نہر لانے کی وجہ سے نہری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان کا تکیہ بیرون پٹن دروازہ جانب مشرق واقع ہے اور چھوٹا تکیہ کہلاتا ہے، ان کے خسر سید حیدر حسینی کے تکیہ کو بڑا تکیہ کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں آج بھی اچھی حالت میں ہیں اور ان کے سجادگان ان دونوں کے بزرگوں کے عرس کی تقریبات انجام دیتے ہیں۔

ایک اور بزرگ صوفی سید شاہ غلام حسین حسینی قادری اورنگ آبادی بہت مشہور تھے۔ آپ کے والد کا نام شہاب الدین قادری تھا۔ آپ شاہ علی رضا گجراتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ گجرات سے اورنگ آباد آئے اور کالا دروازہ کے قریب مسجد اور خانقاہ بنوائی۔ ایک دیوڑھی مع باغ بنوایا جو نواب منزل کے نام سے آج بھی جانی جاتی ہے۔ ان کا شمار اُس زمانے کے چند عالموں میں ہوتا تھا۔ نواب ناصر جنگ شہید آپ کے مرید اور معتقد تھے اور آپ سے ملنے اکثر آپ کی خانقاہ پر آتے۔ اس دور کے بہت سارے امراء بھی آپ کے معتقد تھے۔ اکثر علماء و فضلاء بھی آپ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ جس میں مولوی قمرالدین نقشبندی اور شیخ الاسلام جیسی شخصیتیں بھی تھیں۔ آپ شرع کے پابند تھے۔ آپ کی مجلس میں سماع نہیں ہوتا تھا۔ درس قرآن، تفسیر و تشریح اور فن حدیث پر دسترس رکھتے تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اسی لیے مولوی عبدالجبار خان ملکاپوری نے آپ کا ذکر 'تذکرۂ شعرائے دکن' میں بھی کیا ہے لیکن انھوں نے ان کے والد کا نام سید اسحٰق لکھا ہے جو درحقیقت ان کے دادا کا نام ہے۔ دوسری فاش غلطی یہ کی کہ ان کے مزار کا محل وقوع چیلی پورہ بتایا ہے جبکہ شاہ غلام حسین اپنے تکیہ واقع دیوڑھی بازار نزد کالا دروازہ دفن ہیں۔

شاہ غلام حسین نے عشق الٰہی کے جذبے سے سرشار ہوکر ایک مثنوی 'بطرز رومی' کہی ہے۔ آپ کا وصال 1176ھ م 1762 میں ہوا، آپ اپنے ہی تکیہ میں دفن ہیں۔ عوام میں آپ کی درگاہ کو 'کوڑیاں لُٹتی' درگاہ کہا جاتا ہے۔

حضرت سید احمد شاہ گجراتی کا ذکر اس لیے ناگزیر ہوگیا ہے کہ ولی اورنگ آبادی آپ کے معتقدین میں سے تھے۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مطابق ولی یہیں دفن ہوئے۔ حالانکہ بیشتر محقق اس بات پر متفق ہیں کہ ولی کا انتقال 1707 میں احمد آباد میں ہوا اور وہ شاہ وجیہہ الدین علوی کے قریب دفن ہیں۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ شاہ وجہ الدین علوی سے نسبت رکھنے والے کوئی اور ولی تھے اور مشہور شاعر ولی کا انتقال 1722 اور 1725 کے درمیان ہوا اور وہ بہرحال احمد آباد میں دفن نہیں ہیں۔ اگر جمیل جالبی کے استدلال کو صحیح مان لیا جائے تو پھر ڈاکٹر زور کی تحقیق میں وزن پیدا ہوتا ہے اور ولی کا مدفن حضرت سید احمد گجراتی کی خانقاہ ہی ٹھہرتی ہے۔

سید احمد شاہ بھی گجرات سے اورنگ آباد آئے۔ ان کی خانقاہ ظفر دروازے کے باہر ہے۔ آپ بھی اپنے مریدوں کو روحانیت کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کے بعد اُن کے صاحبزادے حضرت شاہ شیبان شطاری خلیفہ ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت شاہ شیبان شطاری پیشے کے اعتبار سے تاجر تھے۔

ایک اور بزرگ حضرت شیخین احمد شاہ شطاری کی درس گاہ محلہ اسمٰعیل پورہ (موجودہ نواب پورہ) میں واقع تھی۔ آپ مثنوی مولانا روم کا درس دیتے تھے۔ متذکرہ

بالا بزرگوں کے علاوہ اس دور میں اور بہت سارے صوفیائے کرام اورنگ آباد میں مقیم تھے جیسے حضرت شاہ بے ریا وغیرہ۔ آپ بھی سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

سراج اورنگ آبادی کا شمار بھی صوفیا کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ سراج کی پیدائش 13 صفر المظفر 1124ھ مطابق 11 مارچ 1712 کو اورنگ آباد کے ایک سادات گھرانے میں ہوئی۔ بچپن ہی سے سراج بہت ذہین واقع ہوئے تھے۔ اُن کے والد محترم سید درویش نے اُن کی تعلیم کا اہتمام اُن کی کم عمری ہی سے کیا اور بارہ سال کی عمر تک تعلیم کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ اس کے بعد سات سال تک سراج آشفتگی کا شکار رہے۔ اُس حالت جذب و مستی میں سراج اکثر برہان الدین غریبؒ کے روضے کے چکر لگایا کرتے تھے۔ سات برس کے بعد بے خودی کا نشہ کم ہونے لگا تو انھیں کسی مرشد برحق کی تلاش ہوئی اور خوش قسمتی سے انھیں حضرت شاہ عبدالرحمٰن چشتی جیسی برگزیدہ ہستی کا اتفاق حاصل ہوگیا جو مشائخ چشتیہ میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ سراج کو اپنے پیرومرشد سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار انھوں نے جابہ جا اپنے اشعار میں کیا ہے۔ سراج نے سات آٹھ سال کی مختصری مدت میں سلوک کے تمام منازل طے کر لیے تھے۔ سراج کے تکیہ پر علما، امرا، رؤسا، بغرض ملاقات حاضر ہوا کرتے تھے۔ عبدالجبار ملکاپوری اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'محبوب الزمن' میں یوں رقمطراز ہیں:

''شہر میں کوئی محفل ایسی نہ تھی جس میں آپ نہ ہوں، ہر ایک محفل میں آپ ہی صدر ہوتے، مشائخ اور علماء آپ کی قدر کرتے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ طریقہ کے پابند تھے۔ ہفتے میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے۔ اس میں شہر کے اکثر عمائدین و مشائخ جمع ہوتے تھے۔ قوال اور گویے آپ کی غزلیں سناتے۔ کبھی سامعین کوڑلاتے، کبھی لٹاتے تھے۔ کوئی وجد و حال میں تڑپتا تھا۔ کوئی وحدت کے دریا میں ڈوبتا تھا۔ صوفیائے کرام لطف اندوز ہوتے تھے۔ سب اہل محفل باادب عالم سکوت میں ہوتے تھے۔ جس پر توجہ کرتے وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتا تھا اور جس پر ہاتھ رکھتے لوٹ پوٹ ہوجاتا تھا۔''

سراج سرتاپا تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ ایک صاحب دل اور صاحب باطن شاعر تھے۔ آپ کا مزار پنچ کنواں قبرستان میں آج بھی موجود ہے۔

حضرت شاہ غریب اللہ، حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفا میں سے تھے۔ آپ کا تکیہ بھی دیوڑھی بازار میں نالے سے متصل تھا۔ آپ نے ایک خانقاہ اور مسجد بھی بنوائی تھی۔ انتقال کے بعد تکیہ میں ہی دفن ہوئے۔ شاہ سراج اور شاہ غریب اللہ نہ صرف ہمعصر تھے بلکہ دونوں کے تکیے ایک دوسرے سے متصل تھے۔ شاہ غریب اللہ کی آل کا سلسلہ جاری رہنے سے یہ تکیہ ابھی اچھی حالت میں ہے لیکن شاہ سراج کے پسماندگان میں کوئی نہ ہونے کی وجہ سے ان کے مکان کا نشان باقی رہا اور نہ تکیہ کا۔ لیکن اس کے باوجود تکیہ کے اب بھی کچھ کچھ آثار باقی ہیں مثلاً عمارت کی بنیادیں مسجد کا حوض وغیرہ۔

ایک اور بزرگ مولوی نورالہدیٰ گزرے ہیں۔ ان کے والد محترم کا نام قمرالدین تھا۔ مولوی نورالہدیٰ 1153ھ م 1740 میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والد نے کی۔ سولہ سال کی عمر میں کتب درسیہ عربیہ و علوم ادبیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اوائل عمر میں ہی حفظ القرآن و قرات کی تکمیل کی۔ مولانا غلام علی آزاد آپ کی نسبت سے فرماتے ہیں کہ آپ علوم و فنون کے عالم و حافظ ہیں۔ بیس (20) سال کی عمر میں فریضہ حج سے

فارغ ہوئے۔ آپ اپنے وقت کے صوفی و جید عالم تھے۔ آپ نے متعدد شرح و رسائل لکھے۔ آپ کا سلوک امیر و غریب کے ساتھ یکساں تھا، اس لیے ہر طبقہ میں آپ ہر دل عزیز تھے۔ آپ نقشبندیہ سلسلے سے تھے۔ 1303ھ (1885) میں انتقال کر گئے۔ دروازہ بھڑکل کے قریب مدفون ہیں۔

اورنگ آباد کے ایک اور بزرگ قاضی صاحب قدس سرہ گذرے ہیں۔ مولف 'بہار و خزاں' نے لکھا ہے کہ آپ الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم کی تحصیل کے لیے آپ نے علامہ عبدالباقی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد آپ تلاش معاش میں دہلی پہنچے اور شہنشاہ اورنگ زیب نے آپ کو احتساب کی خدمت پر مقرر فرمایا۔ چند سالوں بعد اورنگ زیب نے آپ کو اورنگ آباد میں قضات کی خدمت پر مامور کیا۔ تقریباً چالیس سال تک آپ نے نہایت عدل و انصاف سے خدمت انجام دی۔ آخری عمر میں تصوف کی طرف مائل ہوئے اور شاہ نور حموی کے دست مبارک پر بیعت کی۔ آپ مغل بادشاہ بہادر شاہ اول کے آخری عہد میں انتقال کر گئے اور نہر ہرسول کے قریب دفن کیے گئے۔

ایک اور بزرگ سید شاہ ظہورالحق بن میر بھنگا نے اپنا کاروبار ترک کر کے گھر بار چھوڑ کر مرشد کی تلاش میں نکل پڑے اور بلخ، بخارا وغیرہ شہروں میں بھی گئے اور یہاں کے معروف بزرگوں کی صحبت سے مستفیض ہوئے بعدازاں ہندوستان تشریف لائے اور حضرت شاہ عبداللہ سے بیعت کی۔ پھر احمد آباد، ممبئی، پونہ، ناسک، گلبرگہ، حیدرآباد ہوتے ہوئے اورنگ آباد میں وارد ہو کر ملک عنبر کی بنائی ہوئی کالی مسجد شاہ بازار میں مقیم ہوئے۔ آپ اپنے مریدین کو رشد و ہدایت سے نوازا کرتے تھے۔ آپ کی وفات 21 رمضان 1284ھ میں ہوئی اور نماز جنازہ مسجد شاہ گنج کلاں میں ادا کی گئی۔ آپ کا مزار دمڑی محل درگاہ حضرت نورالہدیٰ کے احاطہ میں واقع ہے۔

ان تمام بزرگوں کے علاوہ بہت سارے بزرگ اورنگ آباد میں گزرے ہیں جن کے حالاتِ زندگی گوشہ تاریکی میں ہیں۔ ان بزرگوں میں حضرت شاہ سوختہ میاں، حضرت شاہ بندہ علی، حضرت شاہ حسین مجذوب اورنگ آبادی، حضرت خواجہ وفا قدس سرہ، حضرت شاہ شریف چشتی نظامی اورنگ آبادی، حضرت سید نظام الدین ادریس حسینی، حضرت مولوی سید نورالمصطفیٰ بن مولانا قمرالدین اورنگ آبادی، حضرت بنے میاں، ماں باپ، حضرت معین اللہ شاہ قادری، شیخ ریاض الدین کپتان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

■

Dr.Quazi Naweed
Head Dept of Urdu
Maulana Azad College
Aurangabad- 431001 (MS)

اختر تلہری

ایک گمنام ادبی شخصیت

سید ابوذر علی

اختر تلہری کا نام سید اختر علی تھا۔ انھوں نے عصری علوم کے ساتھ دینی علوم بھی حاصل کیے۔ مولانا سید اختر علی تلہری 21 اپریل 1901 میں شاہ جہانپور (اتر پردیش) کے ایک چھوٹے سے قصبہ تلہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا واجداد دور مغلیہ میں گاسنا ڈاسنا سے کسی سبب ہجرت کر کے تلہر آبسے تھے۔ مغلیہ سلطنت نے انھیں خاصی عزت بخشی تھی اور تصرف کے لیے باغات وغیرہ بھی دے رکھا تھا، لیکن 1857 کے غدر میں باغیوں کی اعانت کی پاداش میں ساری چیزیں ضبط کر لی گئیں۔ اختر تلہری کے والد سید اکبر علی ریاست رام نگر کے منیجر تھے۔ ان کا انتقال اختر تلہری کے بچپن میں ہی ہوگیا اور والدہ بھی بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ والدین کے انتقال کے بعد پرورش کی ذمہ داری ان کی پھوپھی خورشید بیگم نے سنبھالی۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو ان کے چچا حکیم سید اصغر علی جو کہ خود بھی ایک شاعر تھے اور اصغر تخلص کرتے تھے، بہتر تعلیم کے لیے ان کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ خیال تھا کہ مجتہد بنائیں گے۔ اسی بات کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی سے شروع ہوئی اور ان کا داخلہ مدرسہ اسلامیہ عین العلم میں کرادیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ عالیہ رام پور میں داخلہ ہوا۔ جہاں پر ان کا شمار ممتاز طالب علموں میں ہوتا رہا۔ رام پور سے فراغت کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے عربی اور فارسی کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔ 1916 میں مولوی فاضل، 1917 میں درس نظامی اور 1918 میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔[1] ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات بھی ساتھ ہی ساتھ پاس کر لیے۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی ملازمت مل گئی۔ پہلا تقرر 1919 میں گورنمنٹ ہائی اسکول للت پور میں بحیثیت مدرس (عربی و فارسی) ہوا۔ ایک سال بعد یعنی 1920 میں للت پور سے ٹرانسفر ہو کر گورنمنٹ ہائی اسکول حمیر پور آگئے۔ حمیر پور میں چار سال تک پڑھایا، پھر 1924 میں جوبلی انٹر کالج لکھنؤ میں تبادلہ ہوگیا اور وہاں 18 سال کی طویل مدت تک تعلیم دی۔ 1942 میں گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہاں پور بھیج دیے گئے۔ 1957 میں شاہجہاں پور سے ہی ریٹائر ہوئے۔ 1947 میں شاہجہانپور کے کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان کی تدریسی خدمات کے عوض ایوارڈ سے نوازا۔ جب 1957 میں اختر تلہری ریٹائر ہوئے تو اس وقت تاریخ آزادی ہند لکھی جا رہی تھی، جس میں اختر تلہری کو بحیثیت پروجکٹ ریسرچ اسسٹنٹ کے لکھنؤ میں متعین کیا گیا۔ مگر عارضہ چشم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس فرض سے سبکدوش ہونا پڑا اور پھر لکھنؤ میں ہی مع اہل وعیال مستقل قیام پذیر ہوگئے۔

اختر تلہری ہمیشہ نزلے کا شکار رہتے تھے اور کام کی کثرت کی وجہ سے رفتہ رفتہ ذہن بھی کمزور ہوتا چلا گیا۔ 1970 میں دل کا پہلا دورا پڑا، جس کی وجہ سے ایک ہاتھ اور ایک پیر مفلوج ہوگیا۔ ابھی اس دورے سے سنبھل بھی نا پائے تھے کہ 1971 میں پھر دوسرا دورا پڑ گیا۔ یہ دورا اس قدر شدید تھا کہ ڈاکٹروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود انھیں بچایا نہ جاسکا اور وہ 21 اپریل 1971 کو دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان مہمند گڑھی میں ہوئی۔[2] ان کی نماز جنازہ شیعہ وسنی دونوں ہی طریقوں سے ادا کی گئی۔ آپ کے جنازے میں عقیدت مندوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔

مولانا سید اختر علی تلہری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ادیب، نقاد، بہترین نثر نگار اور لغت شناس ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار کا کوئی دیوان یا مجموعہ تو موجود نہیں ہے، البتہ ان کے اشعار غزل، نظم اور سلام کی صورت رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ان کو اکٹھا کیا جائے تو ایک خاصا مجموعۂ کلام ضرور تیار ہوسکتا ہے۔ ان کے اشعار کے مختلف رنگ و آہنگ ہیں۔ وہ ایک روشن خیال شاعر تھے اور اسی روشن خیالی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے کبھی بھی سکہ بند شاعری نہیں کی۔ یہاں پر ان کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان کی فکری اور فنی صلاحیتوں کا قدرے اندازہ لگایا جاسکے۔ مختلف غزلوں کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

ہر نفس قید نو ہے میرے لیے
یوں نظر آرہا ہوں میں آزاد

یہ مرے ذہن کی شوریدہ مزاجی اختر
اپنے ہی رنگ میں رنگتا ہے وہ یزداں ہی سہی

سبحہ و زنار میں الجھا ہوا ہے تیرا ذوق
تو ابھی انسانیت کے رنگ میں کامل نہیں

غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں کا بھی اپنا ایک الگ اسلوب ہے۔ بطور مثال ان کی ایک نظم کے دو شعر ملاحظہ کریں۔

نظر نہیں ہے حقیقت نگر تری ورنہ
بہار میں ہے وہ کیا رنگ جو خزاں میں نہیں

حدیث گردش دوراں ہے دل گداز مگر
فغاں کا ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں

اختر تلہری نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ 'سلام' بھی کہے ہیں۔ ایک سلام کے چند اشعار نقل ہیں۔

دل میں جگہ دے سوزِ مشیت گداز کو
تجھ کو اگر ہے خواہش فیضانِ زندگی

او محوِ نائے و نوش نظر کو بلند کر
دیکھی نہیں ہے تو نے ابھی شان زندگی

تو نے حیات کا ہمیں بخشا نیا نظام
حیدر کی جان اے شہِ مردانِ زندگی

مولانا سید اختر علی تلہری کی اصل دلچسپی نثر نگاری سے تھی۔ ان کی نگارشات میں فلسفہ مذہب میں 'ابتلائے عظیم' (1925)، 'شہادت عظمیٰ' (1930)، 'مذہبی تصورات' (1953)، اور 'علوی تصورات' (1954) شامل ہیں۔ ادبی نگارشات میں 'تنقیدی شعور' (1957)، 'شعروادب' (1958) اور 'مقالات تلہری' (1960) کے علاوہ معیاری ادبی جریدوں خاص کر سرفراز، ادب، نگار، الحکیم وغیرہ میں بہت سارے مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ اگر انھیں اکٹھا کر دیا جائے تو ادب کے لیے کافی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

مولانا سید اختر علی تلہری ایک غیر معمولی صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کے لیے مشہور یہ تھا کہ وہ ترقی پسند تحریک کے مخالفوں میں ہیں۔ جبکہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ اصلاً وہ قدامت پسندی سے دور تھے اور ادب کے

تمام گوشوں پر ایک روشن فکر رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں اعتدال تھا۔ اسی سبب انھیں افراط و تفریط سے دوری تھی اور اگر کوئی ادیب کسی مسئلے پر افراط و تفریط کا شکار ہو جائے، چاہے وہ ان کا محبوب سے محبوب تر ادیب و شاعر ہی کیوں نہ ہو، اس پر اعتراض کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اسی لیے ان کے زیادہ تر مضامین کی کیفیت ادیبوں کے افراط و تفریط کا جواب ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ان کے مجموعہ مضامین 'تنقیدی شعور' کا مضمون 'حالی اور پیروی مغربی' ہے۔ 'حالی اور پیروی مغربی' کافی اہم مضمون ہے جس میں اختر تلہری نے خواجہ الطاف حسین حالی کے مندرجہ ذیل شعر میں 'پیروی مغربی' کی وضاحت بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ حالی کا مشہور زمانہ شعر:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اصل میں اس شعر میں لفظ 'پیروی مغربی' کے سلسلہ میں 5 ستمبر 1948 کے صداقت (لکھنؤ) میں پروفیسر احتشام حسین نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ 'پیروی مغربی' سے مغربی ادب اور مغربی خیال کے سوا اور کوئی چیز مراد نہیں ہو سکتی۔ اسی کے جواب میں اختر تلہری نے اس خیال کی تردید کی اور بڑا ہی راسخ خیال اپنی دلیلوں کے ساتھ رکھا۔ اختر تلہری کا ماننا ہے کہ اس شعر میں 'پیروی مغربی' سے مغربی خیال کی پیروی مراد نہیں ہے بلکہ ایک ایرانی نژاد صوفی شاعر شیریں تبریزی المتخلص بہ مغربی گذرا ہے۔ اس شعر میں حالی اسی شاعر کی پیروی کی بات کر رہے ہیں۔ جبکہ مولانا اختر علی تلہری نے اس مضمون میں مغربی شاعروں سے حالی کے متاثر ہونے کی بھی بات مضمون کے شروع ہی میں قبول کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں سرسید کے اثر سے حالی بھی مغربی ادب و شعر سے اچھے خاصے متاثر ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کا محور بدل دیا تھا۔''[3]

مولانا اختر علی تلہری ماقبل کے اقرار نامے کے باوجود 'پیروی مغربی' سے مراد ایرانی صوفی شاعر 'مغربی' کی ہی پیروی کو مانتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ چند دلیلیں بھی رکھتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''میں جہاں تک اس شعر کے انداز بیان، نشست الفاظ اور اسلوبِ خیال پر غور کرتا ہوں مجھے اس کا یقین بڑھتا جاتا ہے کہ حالی نے اس شعر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس کے سمجھنے کے لیے فلسفیانہ نظریات کا سہارا لینے کی ضرورت ہو بلکہ یہ سیدھی سادی سی بات کہی ہے کہ ہم بوالہوسی کے سوتے سے جو کیفیتیں اور جذبے پھوٹتے ہیں انھیں کی ترجمانی کرتے رہے، آؤ! اب وارداتِ ہوس کی تصویر کشی سے کنارہ کریں اور اس عشق حقیقی کی دنیا میں قدم رکھیں جہاں پاکیزگی ذرّے ذرّے میں لہریں لیتی ہے۔ اس خیال میں کوئی خاص شاعرانہ ندرت نہیں ہے۔ عشق مجازی کے کاکل و گیسو میں الجھے ہوئے بہت سے شاعروں میں بوالہوسی سے نفرت پیدا ہوئی ہے اور انھوں نے مختلف پیرایوں میں اسے ادا کیا ہے۔ اس شعر میں تازگی اسلوب بیان کے راستے سے آئی ہے۔ عشق مجازی کا نمائندہ مصحفی و میر کو قرار دیا گیا۔ اس لیے کہ ان کی شاعری کا غالب حصہ مجازی حسن و عشق کے زلف و گیسو ہی کو الجھاتا اور سلجھاتا رہا ہے اور عشق حقیقی کا نمائندہ ایران کے مشہور صوفی شاعر شیریں تبریزی المتخلص بہ مغربی کو قرار دیا گیا۔ اس لیے کہ تصوف کے ایک خاص الخاص نظریے کے آستانے پر اس کی شاعری کی جبین عقیدت ہمیشہ جھکی رہی۔''[4]

اس سلسلہ کی دوسری توجیہہ میں اختر تلہری کا خیال ہے کہ اگر اس شعر میں 'پیروی مغربی' سے مغرب کی پیروی مان لی جائے تو حالی جیسے قادر الکلام شاعر پر نفسیاتی الجھن کے تحت غلط ترکیبوں کے استعمال کا الزام آئے گا اور ایسا حالی جیسا شاعر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''حالی کے مذکورہ بالا شعر کے اس ٹکڑے 'پیروی مغربی' میں 'مغربی' سے مراد قطعاً ایران کا مشہور شاعر شیریں تبریزی ہی ہے اور یہ کوئی بڑا ادق معمائی مطلب بھی نہیں ہے۔ جو لوگ 'مغربی' سے متعارف ہیں ان کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوگا، البتہ جو لوگ مغربی سے آشنا نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان کا ذہن مغربی شاعر کی طرف منتقل نہ ہو مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ اگر انھیں اردو کے صرفی و نحوی نکات اور اس کی عبارتی ترتیب کے ڈھانچوں کے انداز سے واقفیت ہے تو ان کے سلیقۂ شعر فہمی کو اس مقام پر ٹھٹک جانا چاہیے کیونکہ حالی کا سا قادر الکلام شاعر 'پیروی مغرب' کی جگہ 'پیروی مغربی' استعمال نہیں کر سکتا۔''[5]

اسی سلسلہ گفتگو میں اختر تلہری حالی کے اردو الفاظ کے تصرفات کا دائرہ وسیع مانتے ہوئے، ان کے تصرفات کے دائرے کی بھی نشاندہی کر دیتے ہیں تاکہ کسی کو کسی اعتبار کا کوئی شبہ باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ اسی سلسلہ تحریک میں لکھتے ہیں:

''مولانا حالی کے نزدیک اردو کے تصرفات کا دائرہ اچھا خاصا وسیع ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو ہے کہ حالی انھیں غلط الفاظ کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں جو خاص و عام دونوں زبانوں پر جاری ہو جائیں۔ عوام اور جہلا کی زبان پر جو غلط لفظ جاری ہو گئے ہیں ان کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ 'مزاج' کو 'مجاز'۔ 'نسخہ' کو 'نخسہ' کہنا ان کے نزدیک بھی غلط ہے۔ ایسی حالت میں وہ 'مغرب' کی جگہ یا 'مغربی شاعری' کی جگہ 'مغربی' استعمال کریں، محال تو نہیں لیکن بہت ہی مستعبد امر ہے۔''[6]

'پیروی مغربی' کی تیسری اور آخری توجیہ میں اختر تلہری نے 'مقدمہ دیوان' سے حالی کی ہی تحریر کا سہارا لیا ہے جس میں حالی نے سعدی، رومی، حافظ، عراقی، جامی، احمد جامی کے ساتھ مغربی کا ذکر کرتے ہوئے ان شعرا کو عشق الٰہی کا راگ گانے والا اور اہل اللہ کہا ہے۔ 'مقدمہ دیوان' کا اقتباس یہ ہے:

''غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے، یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدی، رومی، خسرو، حافظ، عراقی، مغربی، احمد جام اور جامی وغیرہم۔''[7]

اقتباس بالا کے نقل کرنے کے بعد اختر تلہری لکھتے ہیں کہ ''اگر اہل ذوق نظر ڈالیں گے تو انھیں اس کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا کہ 'پیروی مغربی' سے مراد 'مغربی' شاعر ہی ہے۔''

اختر تلہری کی تنقید نگاری میں ادبی دیانت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی تحریریں ناقدین میں ایک نیا رنگ انقلاب بھرنے کا کام کرتی ہیں اور ایک عالمانہ اور حکیمانہ ادبی شعور بھی بخشتی ہیں۔ علی عباس حسینی ان کی تحریروں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''ان کی تحریر میں استدلال و تفکر انشا پردازی کی صوری خوبیوں سے چولی دامن کی طرح ہمکنار ہیں۔ وہ نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرنے اور اچھوتے فقرے تراشنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کا ادبی مذاق بہت ہی سلیم، سلجھا اور رچا ہوا ہے۔ ان کی نقد کا پورا رنگ نکھرا، ستھرا، خالص، سچا، پرخلوص، مدلل، حق بین اور راست گو ہے۔''[8]

حواشی

(1) انجمن وظیفہ سادات و مومنین رجسٹرڈ کا سلور جبلی نمبر ص 104
(2) شمیم مبارک: سخنوران شاہجہانپور ص 206)
(3) اختر علی تلہری: تنقیدی شعور، ص 196
(4) ایضاً ص 197 (5) ایضاً ص 198
(6) ایضاً ص 198 (7) ایضاً ص 200
(8) (علی عباس حسینی از مقدمہ 'شعر و ادب'

■

Syed Abu Zar Ali
Research Scholar, Dept of Urdu
BHU, Varanasi -221005 (UP)

محمد یوسف رضا

خیام الہند حیدر دہلوی کا ایک گمنام اور اہم شاگرد زاہر حیدری

ہندوستان میں ایسے بہت سے شاعر ہیں جو گوشۂ گمنامی میں جی کر راہیِ ملک عدم ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد بھی لوگوں نے ان کی خدمات کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسی قبیل کے شعرا میں ایک اہم نام زاہر حیدری کا ہے۔

ان کا اصل نام غلام عباس تھا اور زاہر تخلص، حیدری، اپنے استاد جلال الدین حیدر دہلوی کی مناسبت سے تھے۔ ان کی پیدائش یکم جولائی 1905 کو بلند شہر ضلع کے قصبہ سانکھنی میں ہوئی۔ سانکھنی کے پاس ہی جہانگیر آباد ہے جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رہا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم نانا علی بخش قریشی کے پاس رہ کر حاصل کی۔ پھر اس کے بعد 1920 میں مڈل کی سند حاصل کی، 28 مئی 1921 کو الہ آباد بورڈ کا اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا۔ 1930 میں انھوں نے دہلی سے پرائمری استاد کی سند حاصل کی۔ علم ریاضی میں ماہر تھے، اردو زبان کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے عالم تھے۔ جب انھوں نے شاعری کی طرف توجہ کی تو اس وقت دہلی میں مشہور و معروف استاد جلال الدین حیدر دہلوی کا چرچہ تھا۔ زاہر حیدری نے انھی سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ان کے سب سے عزیز شاگرد ہوگئے۔ حیدر دہلوی اپنی رباعیات کی وجہ سے مشہور تھے اور بقول حاجی میاں فیاض الدین صاحب اسی مناسبت سے خیام الہند کہلاتے تھے۔ زاہر حیدری کے معاصرین میں مانی جائسی، پنڈت گوپی ناتھ امن، شیش چند طالب دہلوی، بشیشر ناتھ منور لکھنوی، شعری بھوپالی، اور بسمل سعیدی کے نام اہم ہیں۔ دہلی میں ہی اینگلو عربک ہائر سکینڈری اسکول سے 1967 میں ریٹائر ہوئے۔ اور غالباً 1978 میں ان کا انتقال اپنے وطن سانکھنی میں ہوا۔ زاہر حیدری کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد عزیز حاجی میاں فیاض الدین صاحب نے ان کی غزلوں کا انتخاب کیا اور 2011 میں 'دست مژگاں' کے نام سے ایک مجموعہ خواجہ پریس دہلی سے شائع کیا۔

زاہر حیدری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اس کے علاوہ انھوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے جن میں قطعات، رباعیات، سلام، نوحے، مناقب اور قصائد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ زاہر حیدری کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کے استاد حیدر دہلوی پاکستان ہجرت کر کے جانے لگے تو اپنے شاگردوں کو زاہر حیدری کے سپرد کر دیا۔ (بقول حاجی میاں فیاض الدین صاحب)۔ حاجی میاں فیاض الدین صاحب زاہر حیدری کے شاگرد ہیں۔

اب ان کی غزلیہ شاعری پر گفتگو کرتے ہیں، غزلوں کا مطالعہ کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی غزلوں میں ہر جذبہ اپنی پوری شدت سے موجود ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں سمندر، صحرا، سفر، آسمان، تنہائی اور وصل اپنے پورے تاثر کے ساتھ محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وسیع کینوس پر ان کی شاعری کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ ان کے خوابوں اور امنگوں کی عکاسی کرتی ہے۔ مثال کے لیے یہ اشعار پیش ہیں۔

کوئی حد بھی ہے ذوق ایذا طلب کی
میں ہنس ہنس کے زخم جگر دیکھتا ہوں
منزلیں اس کی نزاکت کا پتہ دیتی ہیں
کروٹیں لیتے ہیں وہ قلب وجگر میں رہ کر

انھوں نے اپنے اشعار میں اپنے داخلی جذبات کو تخیل کی زبان میں بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ کی تلاش نہیں کی اور نہ ہی الفاظ کے لیے معنی تلاش کیے۔ یہ انھوں نے اس لیے کیا ہے کیونکہ معنی سے الفاظ کی شکل تو متعین ہو سکتی ہے لیکن الفاظ کے برمحل استعمال سے معنی کا تعین عمل میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ لفظ اور معنی کے مناسب ربط سے ہی حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے اور اسی سے کلام میں تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں یہ صفات بخوبی ملتی ہیں۔ نازک خیالی اس سلسلے میں ان کے کلام کی سب سے اہم خوبی ہے۔ الفاظ میں تصور اور خیال دونوں ہی

پوشیدہ ہوتے ہیں اور انہی پر طرز ادا کی خوبی منحصر ہے۔

ان کی غزلوں میں سہل بیانی کی بھی مثالیں ملتی ہیں جن میں شیرینی بیان کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی بھی بہ حسن خوبی ملتی ہے۔ان میں بلا کی شوخی بھی موجود ہے یہ شوخی عشقیہ مضامین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے مسائل کے متعلق بھی ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔اس شوخی نے ان کے طرز ادا میں چار چاند لگادیے ہیں۔ان کے کلام میں پختہ گوئی اور بلوغت سخن میں سیمابی لہو کی روانی بدرجہ اتم برق رو ہے۔خیالات کا اچھوتا پن،زاویہ ندرت بیان،افکار کی عمودی سمت ذی ہوش قارئین کو وجدانی تسکین عطا کرتی ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

حسرت یہی ہے لطف طلب بھی اسی میں ہے
وہ بات ہو جو حسن کے دل پر گراں نہ ہو
میں تو تمہاری یاد میں مرجاؤں یا جیوں
تم کو قسم ہے یاد نہ کرنا کبھی مجھے
ملال کس لیے تردامنی پہ اے زاہر
یہ زندگی کی شریعت کسی کو کیا معلوم

تصوف سے متعلق مسائل کو اردو غزل میں ابتداء ہی سے پیش کیا گیا۔ان کے کلام میں بھی تصوف سے متعلق مضامین دیکھے جاسکتے ہیں۔ان کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری پر مذہب کا زیادہ اثر رہا ہے۔اشعار ملاحظہ کیجیے:

بے خبر تھا غالباً وہ اپنی ہست و بود سے
سرکشی کرتا حباب اٹھا خودی کے جوش سے
ذرے ذرے میں نہیں ہے جلوۂ جانہ کیا
اے دل مضطر طواف کعبہ و بت خانہ کیا
اس قدر جذبۂ توحید سے لبریز ہے دل
آنکھ جس ذرے پہ ڈالوں وہی کعبہ ہوجائے

ان کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کی غزلوں میں زبان و بیان کی صفائی اور شیرینی موجود ہے۔یہ ان کی وہ صفت ہے جو اس عہد کے شعرا میں انھیں ممتاز کرتی ہے۔زبان کی یہ لطافت،صفائی اور شیرینی یہی ان کے کلام میں ایک پر کیف فضا پیدا کرتی ہے۔انھوں نے علمی صلاحیت کی بنا پر اپنے کلام میں کوئی لفظ اس طرح کا استعمال نہیں کیا جو طبیعت پر بار معلوم ہوتا ہو۔

قفس اور آشیاں کی رمزی علامت میں اردو غزل گو شعرا نے جدت ادا کا حق ادا کیا ہے۔یہ صرف جدت ادا اور حسن تخیل ہے جس کی بدولت فرسودہ مضامین میں بھی تازہ کاری اور شگفتگی کی آمیزش ہوجاتی ہے۔الفاظ کے

ان کی غزلوں میں سہل بیانی کی بھی مثالیں ملتی ہیں جن میں شیرینی بیان کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی بھی بہ حسن خوبی ملتی ہے۔ان میں بلا کی شوخی بھی موجود ہے یہ شوخی عشقیہ مضامین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے مسائل کے متعلق بھی ہماری بصیرتوں میں اضافہ کرتی ہے۔اس شوخی نے ان کے طرز ادا میں چار چاند لگادیے ہیں۔ان کے کلام میں پختہ گوئی اور بلوغت سخن میں سیمابی لہو کی روانی بدرجئہ اتم برق رو ہے۔خیالات

معنی سے زیادہ اہم اس کا مفہوم ہوتا ہے۔کیونکہ اسے برتنے والے کے ذوق و وجدان کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے اس کا مفہوم کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔قفس اور آشیاں سے متعلق اشعار ملاحظہ کیجیے۔

آشیاں میں اک خلاف باغباں جنبش نہ تھی
اب قفس میں ہوں تو کتنی کوشش پرواز ہے
فصل بہار میں بھی قفس ہی ہوا نصیب
ہر چند عندلیب نے مارے ہزار پر

زاہر حیدری کی غزلوں میں ترکیب نو کا استعمال بدرجہ اتم ملتا ہے۔یہ مرکب ہے اور ایسے الفاظ زبان کے ذخیرے میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔کسی ایک خیال کو پیش کرنے کے لیے ایک خاص لفظ ہوتا ہے مگر شاعر کا تخیل، اس کے تصورات،اور واردات ذہنی الفاظ کے دائرے میں محدود نہیں ہوسکتے۔تخلیق کار اس طرح نازک اور مشکل خیالات کو اپنی ذہنی ترنگوں میں دوڑاتا ہے کیونکہ کسی خیال کے اظہار کے لیے صرف الفاظ ہی کافی نہیں ہوتے لیکن اپنی بات کو اسے پیش کرنا ہی ہوتا ہے۔اس لیے وہ رمز و کنایہ،تشبیہات و استعارات،تلمیح،مجاز و اختراع ترکیب کا سہارا لیتا ہے۔اختراع ترکیب کی مدد سے شاعر اپنی اس بات کو مرکبات کی مدد سے پیش کردیتا ہے جو وہ آسانی کے ساتھ ادا نہیں کرپاتا۔اور شعر کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے لیکن یہ مفہوم حسن کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔انھوں نے لطافت خیال،مضمون کی پیچیدگی کو تازہ ترکیب کے ذریعے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔اشعار پیش ہیں۔

اک اک بلائے دہر مرے نام ہوگئی
فطرت رہین گردش ایام ہوگئی
دم بدم افزونیِ غم پے بہ پے جوش جنوں
خاص ہے اب تیرے دیوانے پہ فیضان بہار
کون گلشن میں نہیں ساغر بکف مینا بدوش
کس قدر عشرت فزا ہے سازو سامان بہار
ترے وحشی کو ہنگام جنوں بھی تھا شعور اتنا
کہ خار دشت وحشت دست مژگاں سے نکالے ہیں

شعر کہنا ان کے نزدیک صرف ذوق کی سیرابی ہی نہیں تھا بلکہ یہ ان کے ایمانی،روحانی،ذہنی،شعوری اور فکری ارتقا کی اساس ہے۔محبت یا نفرت یہ انسان کی جذباتی و جبلتی زندگی کے تجربات ہیں۔سو یہ مفروضہ غلط العوام ہے کہ شاعری کا وجود محبت کا مرہون منت ہے۔شاعری کا تصور آتے ہی اکثر لوگوں کا ذہن پیار و محبت کی دنیا میں گردش کرنے لگتا ہے کہ اس میں عشق و عاشقی کی باتیں ہوتی ہیں۔اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری عشق و محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی کشمکش اور حیات انسانی کے تمام مسائل کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے،اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں کہنا پڑا۔

لے گئی سوئے لحد غم کی فراوانی مجھے
مشکلوں نے کرلیا حاصل بہ آسانی مجھے

انھوں نے اپنا آشیانہ بڑی محنت و مشقت سے بنایا تھا اور وہ اس کی حفاظت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔انھیں اس بات کا احساس تھا کہ باد مخالف کہیں ان کا آشیانہ برباد نہ کردے۔اسی کی عکاسی انھوں نے اپنے اشعار میں کی ہے۔

مرے ان چار تنکوں سے الٰہی کیسی الفت ہے
چلی آتی ہے سوئے آشیاں برق تپاں خود ہی

جب تصور میں ان کا آشیانہ اجڑ جاتا ہے تو اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرے آشیانے کے اجڑنے سے اطراف میں رنج و غم کا سماں نظر آرہا ہے۔اور یہ فطرت انسان بھی ہے کہ جب انسان پریشان ہوتا ہے تو اسے عالم کی تمام رنگینیوں سے نفرت ہونے لگتی ہے یعنی اسے اس رنگینی میں بھی مایوسی نظر آتی ہے اور اسے ہر شے میں لطف ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔شعر ملاحظہ کیجیے۔

یہ عالم صرف میرے چار تنکوں کے اجڑنے پر
پڑی ہے اوس سی صحن گلستاں میں جدھر دیکھو

بے سروسامانی کے بعد جب انسان محنت کرکے اپنے پاس کچھ اثاثہ اکٹھا کرلیتا ہے تو سب سے پہلے اسے اپنا سر چھپانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اسی سے متعلق ان کا یہ خیال دیکھیے۔

فراہم جہاں چار تنکے ہوئے
وہیں پر مرا گلستاں ہوگیا

ان کے اشعار میں وہ تمام محاسن موجود ہیں جو غزل کو غزل بناتے ہیں۔زبان و بیان کی روانی،منظر نگاری،مصوری،

الفاظ کا برمحل استعمال سبھی میں انھیں مہارت حاصل ہے۔ جذبات نگاری،صداقت کی قوت سے جو ماحول پیدا ہوا ہے وہ فلسفہ وفکر کی گہرائیوں سے معرا ہونے کے باوجود زندہ اور خوبصورت ہے اور اس میں تغزل کی بھر مار ہے۔

ہر ذرہ میرے واسطے صد رشک حور تھا
ڈالی جدھر نگاہ ادھر تیرا نور تھا

ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ غزل کے شیدائی ہیں اور فرسودہ تشبیہات و استعارات سے اپنا دامن بچایا ہے۔ان کا یہ منفرد لہجہ ان کی شناخت ہے، ان کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ نظر آتا ہے۔ان کے اسلوب بیان میں ایک نوع کی ندرت اور رچاؤ ہے۔ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ دلکش ہے وہ شدت احساس کے ساتھ صداقت وخلوص کا اظہار ہے۔انھوں نے اس کا اظہار جس بے باکی سے کیا ہے وہ انھیں اپنے عہد کے شعرا میں امتیاز بخشتا ہے۔

بھری تھی جس میں رنگینیِ عالم
کسی عاشق کا دل تھا جام جم کیا
یہ جوش جوانی بھی کوئی دن کی ہوا ہے
ہم جانتے ہیں رہنے بھی دو کر و فر اپنا
لاکھوں بری بھلی وہ سنا کر چلے گئے
شاید یہی جواب تھا میرے سلام کا
اب تیری طرف سے وہ کرم ہو کہ ستم ہو
دعوے سے میں کہتا ہوں کہ ہاں میرے لیے ہے

ان کی غزل کی خاص پہچان مسرت اور عشق کے جذبات کے ساتھ ساتھ والہانہ ذوق وشوق ہے۔ان کے انداز بیان اور اسلوب کی ادائیگی کی رعنائی ان کی غزلوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔انھوں نے غزل کے دائرے میں ایسے ایسے گل بوٹے کھلائے ہیں جن کی خوشبو مفرح اور معطر کرنے میں بے مثال ہے۔اپنے لہجے سے غزل کو ایسے معنویت کے پیکر میں ڈھالا ہے جس سے روایت اور جدت کی آمیزش سے صرف لطف ہی نہیں بلکہ تاثر بھی پیدا ہوا ہے۔یہ اشعار دیکھیے:

اے دل غم کوش یہ بھی عشق کی معراج ہے
آج جان ناتواں پہ کھیل جانے دو مجھے
موج بحرِ عشق کی آسودگی ہم سے نہ پوچھ
ایک ساحل ہے نظر میں اک نظر ساحل میں ہے

ان کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت ہے جن کا موضوع عشق ومحبت ہے اور اسی سے متعلق نفسیاتی اور جذباتی اظہار خیال ان کا محبوب مشغلہ ہے۔انھوں نے عشق ومحبت کے جذبات کو بھی نئے انداز سے برتا ہے جن میں نفسیاتی کیفیت اور خیال کی صداقت موجود ہے۔زاہر حیدری کی غزل گوئی سے متعلق ابرار کرتپوری ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے غزل کے گیسو سنوارنے میں ایک عمر گزاری۔ان کی غزل کے مختلف پہلو ہیں۔ایک پہلو روایتی غزل کی شان ہے جسے ہم عاشقانہ شاعری یا محبوب سے باتیں کرنا بھی کہہ سکتے ہیں۔غزل میں زاہر حیدری اپنے محبوب سے تمام مراحل ومسائل عاشقانہ پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے لہجے میں عجز بھی ہوتا ہے، شکوہ شکایت بھی اور محبت بھی۔کبھی کبھی اشعار پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا محبوب بھی کہیں آس پاس موجود ہے۔اشعار ملاحظہ کیجیے:

بتادے گی خود ان کی پہلی نظر
ہوئی کیوں محبت کہاں ہوگئی
تو نے جس وقت بھی شانوں پہ بکھیرے گیسو
منتشر سلسلۂ عالم ایجاد کیا

یا یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خراماں خراماں وہ جس دم چلے
سر راہ اک کہکشاں ہوگئی
بے کسوں کی آہ کا بھی کیا حسیں انداز ہے
حسن پردے میں ہے لیکن گوش برآواز ہے

عشق میں فنا ہوجانا ہی حقیقی عشق ہے۔پروانہ شمع پر مر مٹ کر ہی اس کے عشق میں تحلیل ہوجاتا ہے۔اس عشق کی راہ میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔کوئی اس میں کامیاب گزر جاتا ہے اور کوئی ناکام ہوجاتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ

فنا فی العشق ہونا بھی کوئی آساں نہیں زاہر
بڑی مشکل سے ہم پہنچے غم الفت کی منزل تک

اشک کا ذکر غم الفت میں ناگزیر ہے لیکن زاہر حیدری نے جس انداز میں اسے برتا ہے وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے۔

جوش رنج و غم بھی آخر برسر کار آگیا
لے چلی اس بزم میں اشکوں کی طغیانی مجھے

ان کی شاعری کا ایک اور نمایاں وصف نازک خیالی ہے۔انھوں نے کبھی تو خیال کو ہی نازک بنا کر پیش کیا ہے اور کبھی ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ وہ بات جو پیچیدگی لیے ہوئے تھی خیال کے پیکر میں ڈھل کر سامنے آگئی ہے۔نازک خیالی دراصل شعر کا حسن ہوتا ہے اور اگر اسی کو اس طرح برتا جائے کہ اس میں حسن پیدا نہ ہو تو یہ پیچیدہ بن جاتا ہے اور شعر مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔یہ اشعار دیکھیے

غم کہاں خنجر کہاں رہنے بھی دو مجھ سے سنو
دست رنگیں میں تمہارے جام ہونا چاہیے
اے دل نقاب الٹنے میں ان کو یہ شرم ہے
حرف آنہ جائے گردش لیل و نہار پر

غزل اردو شاعری کا ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ ہے جس نے ہر دور میں دلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔بلا تفریق مذہب وملت ہر خاص و عام نے اسے اپنایا ہے اور سراہا ہے۔عشق ومحبت کے موضوعات کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی اپنایا اور دائرہ وسیع کیا ہے۔شعر ایک بڑے آئینے کے مانند ہوتا ہے جس میں بیک وقت کئی لوگ اپنا چہرہ دیکھتے ہیں۔اس طرح ایک شعر میں لاکھوں لوگوں کے دکھ درد، بے چینی، اور بیقراری کو دیکھا جاسکتا ہے اور شعر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ اس میں بسا اوقات کئی کئی واقعات آسانی سے سما جاتے ہیں۔جس کو لکھنے کے لیے مؤرخ کئی صفحات سیاہ کردیتا ہے۔زاہر حیدری نے اس طرح کے مضامین کو خوب برتا ہے۔انھوں نے متصوفانہ اور عارفانہ مضامین کو بھی اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔

تیری منزل میں فنا کا آسرا رکھتا ہوں میں
گویا یوں عالم میں بنیاد بقا رکھتا ہوں میں

اس شعر میں عشق حقیقی کی کتنی بہترین عکاسی کی گئی ہے یعنی جب تک انسان خود کو اس کی ذات میں تحلیل نہ کردے تب تک اس کو مدعا حاصل نہیں ہوسکتا۔اس خیال کے مطابق انھوں نے اس راہ میں قدم بڑھاتے ہی یہ ارادہ کرلیا تھا کہ عشق میں فنا ہوجانا ہی ہے۔اور تبھی مجھے اس دنیا میں بقا مل سکتی ہے۔ان کے یہاں خود اعتمادی، شعور فن، وسعت مطالعہ، اور فکری توانائی وہ عناصر ہیں جن کی مدد سے یہ اپنی شعری کائنات کی تجسیم نپے تلے انداز میں کرتے ہیں۔ان کے یہاں اس طرح کے اشعار کثرت سے موجود ہیں جن میں الفاظ کے انسلاکات اور تلازمات کے ساتھ ان کے مفاہیم کی تبدیلیوں کی آہٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔اور اکثر جگہ ایسا بھی لگتا ہے کہ نئی پیکر تراشی ایک نئی دنیا کی سیر کراتی ہے۔

دماغ اپنا فلک پر تھا جبیں مصروف سجدہ تھی
تمہارے ہاتھ سے جس وقت پہنیں بیڑیاں میں نے
دشمن بھی ہیں میں بھی ہوں ذرا تیغ اٹھاؤ
جوہر ابھی اک وار میں کھل جائیں گے سارے

ان کے اشعار میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ برجستگی بھی ہے۔جمالیاتی اقدار کی ترجمانی انھوں نے جس خوبصورتی سے کی ہے اس سے ان کی شاعری میں جمالیاتی حسن نمودار ہوئی ہے جو قاری کے دل پر ایک طرح کا اثر کرتی ہے۔

■

Mohd Yousuf Raza
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

کیٹس کا شاہکار اوڈ ٹو اے نائیٹنگل

منظر نیاز

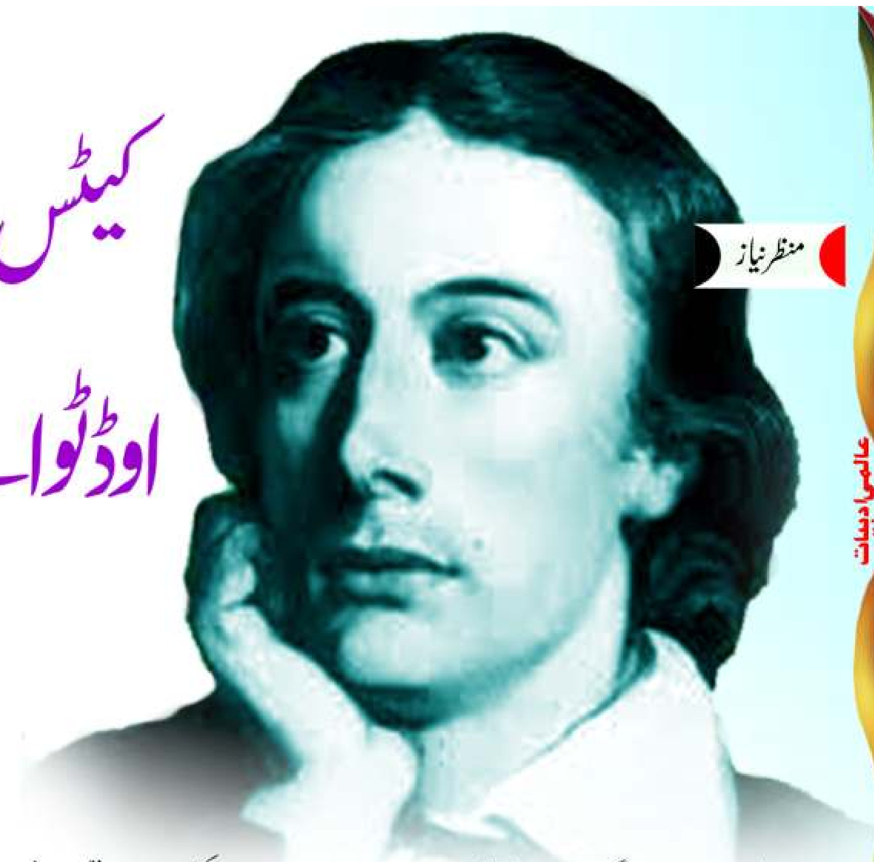

اوڈ ٹو اے نائیٹنگل انگریزی ادب کے شعری سرمایے کا مایہ ناز شاہکار ہے۔ اوڈ کے لفظی معنی کسی خاص موضوع کو گفتگو کا مرکز بنا کر اپنی بات کہنا ہے۔ یہ ایک طرح کی طویل نظم ہوتی ہے جس میں شاعر کسی جاندار یا بے جان شے کو موضوعِ گفتگو بناتا ہے اور مخاطب کو زندہ جاوید، ذی شعور حیثیت دے کر باقاعدہ اس سے گفتگو کرتا ہے۔ موضوعِ گفتگو بہر حال مخاطب سے مربوط رہتا ہے۔ لیکن شاعر اس گفتگو کے دوران اپنے نظریات و خیالات اور فلسفۂ حیات کو نظم کرتا چلا جاتا ہے۔ زیرِ جائزہ نظم اوڈ ٹو اے نائیٹنگل جان کیٹس کی مشہور ترین اوڈس میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم کی تخلیق مئی 1819 میں عمل میں آئی تھی اور اسے جنوری 1820 میں Annals of the Fine Arts میں شامل اشاعت کیا گیا تھا۔ کیٹس نے اس نظم کے ساتھ ساتھ دیگر کئی اوڈس تخلیق کی تھیں جن میں اوڈ ٹو آٹمن (Ode to Autumn)، اوڈ ٹو انڈولینس (Ode to Indolence)، اوڈ ٹو سائکی (Ode to Psyche)، اوڈ ٹو گریسین ارن (Ode to Grecian urn) اور اوڈ ٹو ملن کولی (Ode to Melancholy) کا نام لیا جاسکتا ہے۔

اردو شاعری میں اسرار الحق مجاز کا موازنہ کیٹس سے کیا گیا تھا اور ایک بڑے شاعر نے تو مجاز کی رومانوی شاعری کے حوالے سے بڑا خوبصورت استعارہ تحریر کیا ہے کہ ''اردو شاعری میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیے اٹھالے گئے۔'' اس سے قطع نظر کہ کیٹس کا موازنہ کس اردو شاعر سے کیا جا سکتا ہے، پہلے نظم کا پس منظر جان لینا ضروری ہوگا۔ کیٹس نے اس نظم میں غمِ جاناں کو غمِ دوراں بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مئی 1819 کے نصف سے لے کر جنوری 1820 کے دوران Annuals of Fine Arts میں شاعر کی اس نظم کے ساتھ دیگر چھ نظمیں بھی شائع ہوئی تھیں۔

کیٹس کے دو بھائی اور تھے۔ سب سے بڑا بھائی جارج کیٹس جو جان کیٹس کی حتی المقدور مالی امداد کرتا تھا، تاہم بہت جلد انگلینڈ چھوڑ کر غیر ملک چلا گیا۔ کیٹس کا چھوٹا بھائی ٹام کیٹس تپ دق کا شکار تھا۔ چھوٹے بھائی کا تپ دق کا مرض سوہانِ روح تھا۔ اس وقت تک تپ دق کا شافی علاج لندن جیسے ترقی یافتہ شہر میں بھی دستیاب نہ تھا۔ کیٹس چھوٹے بھائی کو تل تل، پل پل، گھل گھل کر موت سے ہمکنار ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ اس کے امکان میں تھا وہ کرتا رہا لیکن اپنے عزیز بھائی کو موت سے نہ بچا سکا۔ کیٹس کا یہ درد اس کی نظم میں واضح الفاظ میں جھلکتا ہے اور ہم چشم تصور سے کیٹس کو بھائی پر اشک بار اور غم زدہ دیکھ سکتے ہیں جب وہ کہتا ہے کہ 'جہاں نوجوان زرد پڑ جاتے ہیں، گھل گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتے ہیں، پھر موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ تو تھامس کیٹس کی کیفیت ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔

عزیز ترین بھائی کی جدائی کے فوراً بعد کیٹس کو پتا چلا کہ وہ بذاتِ خود اسی موذی مرض یعنی ٹی بی میں مبتلا ہے۔ کیٹس ایک نوخیز شاعر، حساس نوجوان، وہ سمجھ گیا کہ اب ہر سانس آخری سانس کی تمہید ہے۔ مفلسی نے پہلے

ہی سارے حوصلے پست کر دیے تھے۔ ایسے میں اُسے مزید صدمہ اپنی محبوبہ فینی براؤن (Fanny Brawne) کی جانب سے پہنچا جس نے کیٹس سے منھ موڑ لیا تھا۔

ڈھلتے سورج کی بھلا کون کرے گا پوجا
شمع گل ہوتے ہی پروانے پلٹ جاتے ہیں

فینی براؤن کو اس علیل نوجوان شاعر میں کشش معدوم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس نے اپنا قبلہ بدلنے میں ہی عافیت سمجھی اور اپنی راہیں الگ کر لیں۔ ایک سال کے اندر کیٹس نے بھی ٹی بی کے مرض میں عین جوانی کے عالم یعنی 25 برس کی عمر میں 23 فروری 1821 کو اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا۔ اس مختصر سے عرصے میں چھ اوڈس لگاتار تخلیق کیں۔ جو کچھ کہا وہ نغمہ جاں فزا نہ تھا بلکہ ٹوٹے ہوئے بربط کی فغاں تھی جو اسے انگریزی ادب میں حیاتِ جاودانی عطا کر گئی۔ موت تو برحق ہے لیکن بہت سے لوگ اپنے

پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو انہیں رہتی دنیا تک یاد کرنے کا بہانہ بن جاتے ہیں۔

زیر جائزہ نظم کی تخلیق جان کیٹس نے خود اپنے مکان وینٹ ورتھ پلیس، ہیمپ اسٹیڈ واقع لندن کے پائیں باغ میں کی تھی۔ اس کے قریبی دوست Charles Armitage Brown نے لکھا ہے کہ 1819 کے موسمِ بہار میں ایک دن جب نائیٹنگل یا بلبل اپنی دھن میں نغمہ سرا تھی، کیٹس اپنی کرسی اٹھا کر اس کے گھونسلے کے نزدیک لے گیا اور بہت غور سے اس کا نغمہ سنتا رہا۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ متفرق کاغذات تھے۔ نغمہ سننے کے دوران وہ کچھ لکھتا بھی جا رہا تھا۔ بعدازاں جب براؤن نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے تھے تو اس نے دکھایا کہ میں یہ لکھ رہا تھا۔

اوڈ ٹو اے نائیٹنگل کے حسن و نغمگی کے مداحین اور ناقدین بڑی تعداد میں موجود رہے ہیں۔ معترفین نے اسے غمِ جاناں کا شاہکار تسلیم کیا ہے جس میں شاعر نے انگریزی ادب کے فن عروض سے بھی بقدرِ استطاعت استفادہ کیا ہے۔ بعدازاں جب یہ شاہکار نظم جنوری 1820 میں منظرِ عام پر آئی تو اس نظم کے استعارات کو دیگر ادباء و مصنفین نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر ٹینڈر از دی نائٹ (Tender is the night) جو اس نظم کی 35 ویں سطر ہے، کو ایف۔ اسکاٹ فٹز گیرالڈ (F. Scott Fizgeral) نے اپنے ناول کا عنوان بنایا۔ پی جی گڈ ہاؤس کے ناول کا نام فل مون (Full Moon) بھی اسی نظم کا استعارہ ہے۔ ایسی دیگر بے شمار مثالیں ہیں جہاں انگریزی ادب کے فکشن کے تخلیق کاروں نے بڑی خوبصورتی سے اس شاعری تخلیق سے استفادہ کیا ہے اور پوری پوری سطریں حوالے کے طور پر پیش کی ہیں۔

جان کیٹس کی زندگی اور اندازِ حیات پر نظر ڈالنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان واقعات اور سانحات نے اس کی پوری شخصیت اور شاعری کو متاثر کیا ہے اور اس نظم میں بھی ان کی واضح جھلک موجود ہے۔ کیٹس کے والد جب کیٹس کی عمر محض پانچ برس تھی، اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔ کیٹس کی والدہ بھی 14 برس کی عمر میں چل بسی تھیں۔ جان کیٹس کی پیدائش 31 اکتوبر 1795 کو لندن میں ہوئی تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد بڑے بھائی جارج کیٹس نے جان کیٹس اور ٹام کیٹس کی پرورش کی ذمے داری نبھائی۔ لیکن جلد ہی وہ غیر ملک سدھار گئے۔ جان کیٹس نے جیسے تیسے خود کو اور چھوٹے بھائی کو سنبھالا۔ ٹام کیٹس ٹی بی میں مبتلا ہو کر جلد ہی دنیا کو خیر باد کہہ گیا۔

نوجوان جان کیٹس کو ٹام کیٹس کی رحلت کا غیر معمولی صدمہ ہوا۔ نوجوان شاعر ادبی دنیا میں اپنا مقام حاصل کرنے میں کوشاں تھا۔ جس پذیرائی کا وہ حقدار تھا وہ پذیرائی اسے بعد از مرگ حاصل ہوئی۔ 25 برس کی عمر میں یعنی 23 فروری 1821 کو خود جان کیٹس بھی تپ دق کا شکار ہو کر دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

کیٹس کا عہد ولیم ورڈس ورتھ (1770-1850) اور سیموئیل ٹیلر کولرج (1772-1834) کا تھا۔ یعنی یہ رومانوی شاعری کا دور تھا۔ ان دونوں شعرا کو زبردست مقام حاصل ہوا۔ کیٹس ان دونوں سے عمر میں چھوٹا تھا اور موت نے اسے اپنی مقبولیت اور پذیرائی سے استفادہ کرنے کا موقع نہ دیا۔ اس زمانے کے بیشتر ناقدین۔ مثلاً رڈیارڈ کپلنگ سے لے کر الیکزینڈر میکی، ایچ ڈبلیو گراڈ، رچرڈ فوگلے، ای سی پیٹلس، والٹر جیکسن بیٹیاز نے اپنے اپنے طور پر اس نظم کے بارے میں بہت کچھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ رچرڈ فوگلے نے کافی ناقدانہ موشگافیاں کی ہیں۔ تاہم ای سی پیٹر، والٹر جیکسن بیٹاز نے ان موشگافیوں کا بڑا اچھا جواب دیا ہے۔ ہیرالڈ بلوم، لیسی بریسمین، جان کولینڈزر وغیرہ نے اس نظم کو جان ملٹن سے متاثرہ نظم قرار دیا جبکہ انہیں شیکسپیئر کی تخلیقات نظر نہیں آئیں۔ حالانکہ کیٹس نے متعدد استعارے شیکسپیئر سے لیے ہیں۔ 1973 میں اسٹیوارٹ اسپیری نے اوڈ ٹو اے نائیٹنگل کو جان کیٹس کی شاعری کا شاہکار قرار دیا۔ پوئیٹ لاوری ایٹ اینڈ ریوموشن نے 1999 میں اس نظم کو احساس اور محسوسات سے مملوغمِ جاناں اور غمِ دوراں کا مرقع قرار دیا۔

اوڈ ٹو اے نائیٹنگل کے ساتھ کیٹس نے دیگر اوڈس بھی تخلیق کی تھیں۔ تاہم اس نظم میں اس نے حروف ندا کا بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ پی بی شیلے نے اوڈ ٹو اے اسکائی لارک میں بھی اسکائی لارک کا نغمہ سنا ہے۔ تاہم کیٹس کے یہاں یہ نغمہ جاں گسل اور موت کی یاد دلانے والا ہے۔ کیٹس نغمے سے متاثر تو ہے لیکن اس کی منطق اسے خبردار کرتی ہے کہ اس نغمگی کے سہارے غم و آلام سے نجات ممکن نہیں ہے۔ ایسے میں اسے موت ہی سارے غموں کا علاج نظر آتی ہے۔ تاہم وہ ایک ایسی موت کا خواہاں ہے جو کسی جسمانی کرب یا کشمکش کے بغیر خاموشی سے رونما ہو۔ دل ٹوٹ جانے کے بعد کیٹس کو دنیائے فانی میں کوئی کشش محسوس نہ ہوتی تھی اور اس نے اپنی نظم میں اس کا برملا اظہار اس طرح کیا ہے کہ 'اب موت کے سوا کوئی اور آرزو نہیں'، اس استعارے سے ہم

جان کیٹس کی زندگی اور اندازِ حیات پر نظر ڈالنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان واقعات اور سانحات نے اس کی پوری شخصیت اور شاعری کو متاثر کیا ہے اور اس نظم میں بھی ان کی واضح جھلک موجود ہے۔ کیٹس کے والد جب کیٹس کی عمر محض پانچ برس تھی، اس دار فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔ کیٹس کی والدہ بھی 14 برس کی عمر میں چل بسی تھیں۔ جان کیٹس کی پیدائش 31 اکتوبر 1795 کو لندن میں ہوئی تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد بڑے بھائی جارج کیٹس نے جان کیٹس اور ٹام کیٹس کی پرورش کی ذمے داری نبھائی۔ لیکن جلد ہی وہ غیر ملک سدھار گئے۔ جان کیٹس نے جیسے تیسے خود کو اور چھوٹے بھائی کو سنبھالا۔ ٹام کیٹس ٹی بی میں مبتلا ہو کر جلد ہی دنیا کو خیر باد کہہ گیا۔

کیٹس کے اس ذہنی کرب کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جس سے وہ خود گزر رہا تھا۔

سچائی یہ ہے کہ جان کیٹس کی یہ نظم غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک ایسا حسین مرقع ہے جس پر انگریزی ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ کیٹس کو ادبی دنیا میں عظیم ترین مقام پر فائز کرنے کے لیے یہی نظم کافی ہے۔

اگر اس اوڈ کے سرسری معنی پر نظر ڈالیں تو:

''شاعر کہتا ہے کہ میرے قلب و جگر میں ایک درد سا اٹھتا ہے اور غنودگی آمیز کسل میرے حواس پر حاوی ہو جاتی ہے گویا کہ میں نے دھتورے کا پیالہ پیا ہے یا پھر افیون کی چسکی لگائی ہے۔ شاعر خواہش کرتا ہے کہ کاش ایسے ہی ایک لمحے میں وہ یعنی شاعر وجود سے عدم میں پہنچ جائے۔ وہ اس نغمہ ریز پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے خوش گلو پرندے، یہ تیری پر مسرت نغمگی اور تیری آزادانہ زندگی سے حسد کر کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ مجھے تجھ سے حسد ہے، میں تو تیری خوشی میں خوش ہوں۔ ہاں، تیری پر مسرت حیات سے تھوڑی سی مسرت اور ترغیب حاصل کرنا چاہتا ہوں، مگر اس سے بھی کیا ہوگا۔ تو تو کسی نہ کسی قطعہ ارض میں درختوں کی شاخوں پر نغمہ ریز ہوگی۔

سرسبز درختوں اور چھاؤں میں، موسم گرما میں پوری آواز کے ساتھ کھلے گلے سے نغمہ سنج ہوگی۔ شراب کا ایک ایسا پیا جو کافی عرصے سے زمین میں دفن کر کے رکھا گیا ہو، جس میں اس خطّے کی نباتات کا اثر عرق بن کر اتر گیا ہو، اس علاقے کے رقص و سرود اور نغمے کے اثرات بھی اس میں موجود ہوں، سورج کی تمازت سے دمکتے ہوئے چہروں پر چمکتے ہوئے نور کے اثرات بھی ثبت ہوں۔ جس شراب سے پُر جام میں شراب کی سطح پر اٹھتے ہوئے بلبلے مجھے جام نوش کرنے کی ترغیب دے رہے ہوں، کاش میں ایسی شراب نوش کروں اور بڑی خاموشی سے اس دنیا کو خیرباد کہہ جاؤں، تیرے ساتھ اس جنگل میں گم ہو جاؤں اور ان تمام غم و آلام سے نجات حاصل کرلوں جن سے تو ان درختوں میں رہ کر کبھی نبردآزما نہیں ہوئی۔ وہ تکان، وہ بیتابی، وہ بے چینی، وہ بے قراری تجھے اس کا علم کیا۔ یہاں میری دنیا میں جہاں انسان بیٹھ کر ایک دوسرے کی کراہیں سننے پر مجبور ہیں، جہاں رعشہ کا مرض چند افراد کو لرزہ براندام رکھتا ہے اور ان کے سروں پر باقی ماندہ چند بال بھی ان کے ساتھ لرزہ براندام رہتے ہیں، جہاں نوجوان گھل گھل کر زرد ہو جاتے ہیں، ہڈیوں کا پنجر بن جاتے ہیں اور پھر جاں بحق ہو جاتے ہیں اور جہاں زندگی، سوا، اس کے اور کیا ہے کہ سوچو اور اُداس ہو جاؤ۔ بوجھل آنکھوں میں مایوسی کے ڈیرے ہیں، جہاں حسن بہت جلد اپنی برنائی کھو دیتا ہے، جہاں حسن کی آنکھوں کی چمک اور اس میں جگمگانے والی محبت بہت جلد دم توڑ دیتی ہے، میں اس دنیا سے تیرے ساتھ دور بہت دور پرواز کر جانے کا آرزومند ہوں، اس پرواز کے لیے شراب کا نشہ معاون نہیں بلکہ تخیل کے بال و پر درکار ہیں۔ ذہن جھٹکے لیتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے۔ میں تیرے ساتھ روانہ ہو چکا، رات ابھی نوخیز ہے، خوش باش چاند کی ملکہ اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے۔ اس کے گرد ستاروں کی شکل میں پریوں کا حلقہ ہے۔ تاہم جہاں میں کھڑا ہوں، یہاں روشنی معدوم ہے۔

خوشگوار بادِ نسیم کے جھونکے آرہے ہیں جو آس پاس کے درختوں پر لگی ہوئی کائی سے ٹکرا رہے ہیں۔ میرے قدموں میں بے شمار پھولوں کے پودے ہیں۔ میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے قاصر ہوں، شاخوں پر کیسی بھینی بھینی مہک ہے، یہ بتانے سے بھی قاصر ہوں کہ اصل میں کیا ہے تاہم موسم بہار کے تمام خوبصورت پھولوں کا تصور کر سکتا ہوں، ان کی مہک سے ان کی شناخت کر سکتا ہوں، گھاس، گھنا سبزہ، پھلوں سے لدے ہوئے درخت، جنگلی ناگ پھنی، چراگاہوں کے پھول، پتوں میں ڈھکے بنفشے کے پھول جو بہت جلد مرجھا جاتے ہیں اور وسط مئی میں کھلنے والا معطر گلاب، گرمیوں کی شام جس پر بیشار مکھیاں منڈلاتی ہیں، میں نے متعدد مرتبہ ایک ایسی خاموش موت کی تمنا کی ہے جو بے حد آسان ہو۔ میں نے اسے اپنی دلکش دھن میں آواز دی ہے کہ تو آ اور میری روح خاموشی سے قبض کر لے۔ اب موت کے سوا اور کوئی آرزو نہیں۔ میں نصف شب میں مکمل خاموشی سے موت کی آغوش میں سو جاؤں، اُدھر تو بے خود ہو کر نصف شب میں وارفتگی سے نغمہ سرا ہے۔ اس عالم میں میں دنیا کو خیرآباد کہنا چاہتا ہوں، تو اب بھی نغمہ سرا ہے۔ اے لافانی پرندے، تو فنا نہیں ہوگا۔ کوئی بھی ظالم تجھے مٹا نہیں سکے گا۔ یہ نغمہ جو میں نے گذشتہ رات سنا، از منہ قدیم کے فرماں روا بھی سنا کرتے تھے اور ان کے خدام بھی سنا کرتے تھے، شاید یہی نغمہ رُتھ کے دل سے بھی ٹکرایا تھا جب وہ وطن سے دور آنکھوں میں آنسو لیے جادوگر کے محل میں مقید تھی۔ گھر سے دور وطن سے دور اور وطن واپس آنے کے لیے جادوگر کے محل کے دریچے کے سامنے کھڑی تھی جس کے نیچے خوفناک سمندر چنگھاڑتا تھا، 'یکہ و تنہا' جادوگر کی قید میں یہ لفظ ایک گھنٹی کی طرح بجتا ہے اور مجھے تیرے تخیل کی دنیا سے حقیقی دنیا میں واپس کھینچ لاتا ہے۔ الوداع، تخیل بہت دیر تک ساتھ نہیں نبھاتا، قائم نہیں رہ پاتا، صرف خود فریبی میں مبتلا کرتا ہے۔ الوداع، الوداع، تیرا نغمہ بھی اب معدوم ہو گیا ہے۔ تو اب چراگاہوں سے پرے خاموش دریا پر سے گزرتی ہوئی آگے پرواز کر چکی ہے۔ پہاڑوں کی جانب رواں دواں ہے، اگلی وادی میں جا چکی ہے۔ کیا یہ کوئی خواب تھا جو میں نے دیکھا؟ وہ موسیقی خاموش ہو چکی ہے، میں بیدار ہوں یا محوِ خواب ہوں۔''

اگر جان کیٹس کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو شاید کیٹس کو بھی انگریزی ادب میں شیکسپیئر جیسا مقام حاصل ہوا ہوتا اور اس سے بھی کہیں زیادہ پذیرائی ملتی۔ کیٹس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کا محض مشاہدہ نہیں بلکہ ذاتی تجربہ بھی ہے۔ نظم کے درمیانی حصے میں اس نے بڑی خوبی سے اپنے چھوٹے بھائی کی علالت اور اس کی کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ پھر منظورِ نظر کی بے اعتنائی اور دنیا کی ناپائیداری کا تذکرہ بھی بڑے فلسفیانہ انداز میں کیا ہے۔ اس عمر میں اس قدر پختہ شعور شاید ان غم و آلام کا عطیہ تھا جس سے کیٹس خود دوچار ہوا تھا۔ بلاشبہ کیٹس کی یہ نظم عالمی ادب کی شاہکار نظم قرار دی جا سکتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود بھی کیٹس کے ساتھ حقیقی دنیا سے پرندے کے نغمے کے ساتھ تخیل کی دنیا میں پہنچ گئے تھے اور شاعر کے ساتھ ہم بھی تخیل کے پروں کے ساتھ پرواز کر رہے تھے۔ یہ نظم بجا طور پر غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا ایک حسین مرقع ہے اور جان کیٹس کی عظمت تسلیم کرانے کے لیے بہت کافی ہے۔ اوڈ ٹو اے نائیٹنگل میں شاعر کے محسوسات اور واردات قلبی بڑے متاثر کن انداز میں یکے بعد دیگرے سامنے آتے ہیں اور قاری بذاتِ خود اس دردِ نہاں کا احساس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو کبھی کیٹس نے کیا تھا۔ اوڈ ٹو اے نائیٹنگل حقیقت اور رومانس کے درمیان ایک حسین آویزش کہی جا سکتی ہے، ساتھ ہی ساتھ فطرت کا دامن بھی نہیں چھوٹتا۔ رچرڈ فوگلے کے الفاظ میں نظم کے اندر خاص زور اصل اور تمثیل کے درمیان ہونے والی کشمکش پر ہے۔ یہ نظم خوشی و غم کا مرقع ہے، تخیل کے ساتھ منطق و حواس کی بھی مثال ہے۔ تشنگی و تکمیل، ہمیشگی و تبدیلی کے اشارات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ انسان و فطرت کا ساتھ، حیات و فنون، آزادی و پابندی، خواب و بیداری کی مثال ہے۔ نائیٹنگل یا ''بلبل کا نغمہ اس نظم کا مرکزی خیال اور محرک آواز ہے۔ یہ پرندہ حسیت اور ستائش کا باعث ہے۔''

اگر جان کیٹس کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو شاید کیٹس کو بھی انگریزی ادب میں شیکسپیئر جیسا مقام حاصل ہوا ہوتا اور اس سے بھی کہیں زیادہ پذیرائی ملتی۔ کیٹس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کا محض مشاہدہ نہیں بلکہ ذاتی تجربہ بھی ہے۔ نظم کے درمیانی حصے میں اس نے بڑی خوبی سے اپنے چھوٹے بھائی کی علالت اور اس کی کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ پھر منظورِ نظر کی بے اعتنائی اور دنیا کی ناپائیداری کا تذکرہ بھی بڑے فلسفیانہ انداز میں کیا ہے۔ اس عمر میں اس قدر پختہ شعور شاید ان غم و آلام کا عطیہ تھا جس سے کیٹس خود دوچار ہوا تھا۔ بلاشبہ کیٹس کی یہ نظم عالمی ادب کی شاہکار نظم قرار دی جا سکتی ہے۔

■

Manzar Neyaz
Deputy Director, Press Information Bureau
NMC Building, New Delhi 410026

رفیع الدین ناصر

ماحول اور موسمی تبدیلی

تعارف

دور حاضر میں دنیائے انسانیت دو اہم مسائل سے دوچار ہے۔ ایک ہے ماحول کی بڑھتی ہوئی آلودگی اور دوسرا ہے کرۂ ارض پر حرارت میں غیر متوقع اضافہ جسے Global warming کہا جاتا ہے۔ 1994 کی اقوام متحدہ کی رپورٹ میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے مطابق دنیا کے سات شہروں میں سے پانچ شہر ایشیا کے ہیں جہاں سب سے زیادہ آلودگی پائی جاتی ہے۔ ان شہروں میں کولکتہ، ممبئی، دہلی، بیجنگ اور جکارتا شامل ہیں۔ دہلی اور ممبئی ان شہروں میں سے ہیں جہاں سب سے زیادہ آلودگی پائی جاتی ہے۔ بعد میں سنہ 2000 کی رپورٹ میں چنئی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ تازہ ترین رپورٹ کے مطابق دہلی کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ذرائع نقل وحمل میں روز افزوں اضافے نے اس شہر کی فضا کو تشویشناک حد تک آلودہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھا جس کی وجہ سے بیجنگ، قاہرہ اور میکسیکو جیسے آلودہ ترین دارالحکومتوں کے صف میں کھڑا کردیا ہے۔ ہوا میں شامل گرد وغبار، باریک ذرات جن کی پیمائش مائکرومیٹر میں کی جاتی ہے، ہوا میں دس مائکرومیٹر سے کم سائز کے پی ایم 10 کہلانے والے ذرات انسانی صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ عالمی ادارہ صحت عامہ WHO کے مطابق یہ انتہائی باریک ترین ذرات انسانی پھیپھڑوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہاں مستقل طور پر جم جاتے ہیں۔ اس سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں اموات واقع ہوتی ہیں۔ اس عالمی ادارے نے ہوا میں ان ذرات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بیس ذرات فی مکعب میٹر مقرر کی ہے۔ دہلی انتظامیہ نے سو ذرات فی مکعب میٹر کی قانونی حد مقرر کی تھی جبکہ اس شہر میں تین سو ذرات فی مکعب میٹر ناپے جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارا ماحول کس حد تک متاثر ہوا ہے۔

ماحول کیا ہے؟

ماحول (Ecology) لفظ Oikos = house اور Logos = study کا مجموعہ ہے جس کے لفظی معنی ہوتے ہیں Study of house جس سے مراد دنیا کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس اصطلاح کو سب سے پہلے Ernest Haeckel نے 1886 میں استعمال کیا۔ اس کی تعریف ہیکل نے یوں بیان کی کہ جانداروں اور ان کے اطراف کے حیاتی اور غیر حیاتی اجزا کا تعلق ہر چند کہ اس روئے زمین پر موجود تمام جانداروں کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ حیاتی اجزا سے قائم ہے۔ اسی بنیاد پر ہیکل نے ماحول کے مطالعے کی مختصر ترین تعریف ''دنیا کا مطالعہ'' کیا ہے۔

دراصل انسان اور اس کے اطراف کے حیاتی اور غیر حیاتی اجزا کو ماحول کہتے ہیں۔ ایسے حیاتی اور غیر حیاتی اجزا جن کا انسانی زندگی پر اثر ہوتا ہے، انھیں مشترکہ طور پر ماحول کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یوں بھی بیان کی جاسکتی ہے ''ایسا مسکن جس کا اپنا ماحولی نظام ہو ماحول کہلاتا ہے''۔

ہزاروں سال قبل جب سے اس کرہ ارض پر انسانی زندگی کا آغاز ہوا، انسان اپنے ہی اطراف کے قدرتی ماحول سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی بسر کرتا آیا ہے۔ انسان نے کھانے کے لیے درختوں کی پتیاں، پھل، جانوروں کا گوشت اور تن کو ڈھانپنے کے لیے درختوں کے بڑے بڑے پتوں کا استعمال کیا ہے۔ انسان چونکہ قدرت کا ایک بہترین شاہکار ہے اس لیے اس میں سوچنے، سمجھنے،

اچھے بُرے کی تمیز کرنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس نے انہی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی۔ انہی اوصاف نے اسے ترقی کا راستہ دکھایا اور یہ روز بروز نئے نئے تجربات کا خوگر ہوتا گیا۔ انسان نے ترقی کر کے جہاں تن کو ڈھانپنے کے لیے کپڑوں کی ایجاد کی وہیں کھانوں کے لیے نئے نئے ذائقے دریافت کیے۔ انسانی آبادی میں روز افزوں اضافہ ضروریات زندگی میں بھی اضافے کا متقاضی رہا۔ اس لیے اس نے زراعت کا طریقہ ایجاد کیا اور زمین سے اناج، سبزیاں اور پھل اگا کر اپنے خورد ونوش کا انتظام کرنے لگا۔ زراعت کے لیے کھاد اور پانی کی فراہمی اصل مسئلہ تھی جسے وہ قدرتی وسائل سے حاصل کیا کرتا تھا۔ مثلاً مویشیوں سے کھاد حاصل کر کے اپنی ضرورت پوری کرتا رہا۔ پانی کے لیے اس کا زیادہ تر انحصار بارش پر تھا۔ بارش کی کمی کی وجہ سے اگر کبھی پانی کی کمی ہوجاتی تو یہ کمی کنوؤں کے پانی سے پوری کی جاتی تھی۔

پچھلی تقریباً ایک صدی سے انسانی آبادی میں غیر متوقع اضافہ اس کی ضروریاتِ زندگی کے اضافے کی اصل وجہ ہے لہٰذا جن وسائل پر ہماری زندگی کا دارومدار تھا وہ ناکافی ہوتے جارہے تھے۔ جس سے انسان کا عرصہ حیات تنگ ہوتا نظر آرہا تھا۔ ایسی حالت میں انسان کا اپنے وسائل کے لیے ہاتھ پیر مارنا فطری تھا۔ انسان کے لیے قدرتی وسائل کی کمی نے تجربات کی نئی راہیں ہموار کردی اور یہ نئے نئے تجربات کرنے لگا۔ پچھلی ایک صدی سے خصوصاً ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک صحت اور غذا پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ نئی نئی اشیاء ایجاد ہورہی ہیں جن کا دن بہ دن استعمال بڑھتا جارہا ہے۔ نتیجے میں قدرتی ماحول میں مداخلت کا عمل روز افزوں بڑھتا جارہا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انسان اور اس کے اطراف کا ماحول ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں انسان کا وجود ہے وہیں اس کے ماحول کا بھی وجود ہونا لازمی امر ہے۔ انسان قدرت کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اس لیے اپنے پاکیزہ ماحول کی پاکیزگی یا آلودگی کی بھی پوری ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

علم ماحولیات (Ecology) دراصل یہ ایک ایسا علم ہے جس میں خاندان یا سماج یا گروہ اور اس میں رہنے والے ذی حیات کے درمیان باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس سے حاصل ہونے والے نتائج واثرات اور اس کے تدارک کی تدابیر پر غوروخوض کیا جاتا ہے۔ اسی سے ماحولیاتی سائنس (Environmenta l Science) کا وجود ہوا ہے۔ یہ سائنس کی ذیلی شاخ مانی گئی ہے جو ماحولیاتی مسائل کو وسیع پیمانے پر حل کرنے میں معاون ہوئی ہے۔ اس میں موسم اور آب وہوا کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

ماحول کے اقسام

ہمارا ماحول جاندار اور غیر جاندار اشیا کے باہمی عمل سے وجود میں آیا ہے اس لیے اسے ماحولیاتی نظام کہتے ہیں۔ ماحول کے بنیادی طور سے دو اقسام ہیں۔ 1: قدرتی ماحول اور 2: انسانی خود ساختہ ماحول۔

1: قدرتی ماحول: کرہ ارض پر اور اس کے اطراف میں پائے جانے والے مادے ٹھوس، مائع اور گیس کی شکل میں ہمیشہ سے اتنی مقدار میں موجود ہیں جتنی کہ قدرت نے عطا فرمائی ہے۔ نا تو اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ ہی زیادتی بلکہ حالات کے بدلنے سے ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ ٹھوس مائع میں، اور مائع گیس میں تبدیل ہوکر ہمارے اطراف ہوائی کرہ میں داخل ہوجاتی ہیں۔ بعض گیسیں کسی نا کسی طرح پھر زمین میں جذب ہوجاتی ہیں مثلاً پانی میں حل پذیر گیسیں تیزاب بناتی ہیں۔ یہ تیزاب زمین میں جذب ہوکر نئے مرکبات بناتے ہیں۔ یہ پودوں اور درختوں کی نشوونما میں معاون ہوتے ہیں۔ اس طرح مادے کی مقدار جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ اسی لیے قدرتی ماحول کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ''ماحول جو اپنی اصل شکل میں بغیر کسی انسانی مداخلت کے موجود ہو، قدرتی ماحول کہلاتا ہے،،۔

2: انسانی خود ساختہ ماحول: زمین پر انسان سب سے زیادہ ترقی یافتہ مخلوق ہے۔ اسے قدرت نے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے جس کی وجہ سے یہ اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لیے نئے نئے تجربات کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان اپنی ضروریاتِ زندگی کی حصولیابی کے پیش نظر اس سے ہونے والے نتائج کی پرواہ کیے بغیر اپنے ماحول میں تبدیلی کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔ آبادی کا دھماکہ اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے کارخانوں، فیکٹریوں اور دیگر صنعتی اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے قدرتی ماحول تیز رفتاری کے ساتھ تنزل پذیر ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے براہ راست انسانی مداخلت کی وجہ سے ماحول میں جو تبدیلی یا ردوبدل ہورہا ہے اس کو انسانی خود ساختہ ماحول سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قدرتی ماحول میں انسان کی مداخلت روز بروز بڑھتی جارہی ہے جس کی وجہ سے ماحول کی آلودگی میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کی زندگی سب سے زیادہ متاثر ہورہی ہے۔ صنعتی کارخانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، فیکٹریوں سے نکلنے والے آلودہ پانی سے ندیوں کی آلودگی اور ذرائع نقل وحمل میں اضافہ اور اس میں استعمال ہونے والے مختلف اقسام کے ایندھنوں سے فضائی آلودگی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ زراعتی زمینوں پر آبادکاری، فصلوں میں اضافے کے لیے مصنوعی کھاد اور جراثیم کش دواؤں کے کثرت سے استعمال نے ہمارے ماحول کو آلودہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ جراثیم کش دواؤں سے نا صرف انسانی زندگی متاثر ہوئی ہے بلکہ کرم خور پرندوں کی جانوں کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

ماحول کے اجزائے ترکیبی:

ہمارا ماحول چار کروں پر مشتمل ہے۔ 1۔ ہوائی کرہ، 2۔ آبی کرہ، 3۔ زمینی کرہ، 4۔ حیاتی کرہ۔

1۔ ہوائی کرہ: کرہ زمین کے اطراف ہوا کا ایک حفاظتی غلاف ہے جو سورج سے آنے والی شعاعوں کو براہ راست زمین تک آنے نہیں دیتا۔ اس کی وجہ سے زمین کے درجہ حرارت کا توازن قائم رہتا ہے۔ اس کے دو اہم اجزا آکسیجن اور نائٹروجن ہیں۔ جبکہ آرگان، کاربن ڈائی آکسائڈ اور دیگر گیسیں قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ آکسیجن حیوانات کے لیے جتنی ضروری ہے اتنی ہی کاربن ڈائی آکسائڈ نباتات کے لیے ضروری ہے۔ پودے شعاعی ترکیب کے ذریعے ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ

اپنے دہن خلیوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح نائٹروجن، امونیا گیس اور نائٹروجنی ترویجی بیکٹیریا بھی جانداروں کے لیے اشد ضروری ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ہوا کی آلودگی میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اضافہ اس کرہ ارض پر بسنے والے ذی حیات کے لیے مسلسل خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔

2۔ آبی کرہ : سمندر، تالاب، ندیاں، نہریں، چشمے، آبشار قطبی برفیلے علاقے اور زمینی پانی آبی کرے کے وسائل ہیں۔ ایک سروے کے مطابق آبشار اور قطبی برفیلے علاقے سے تین فیصد اور بقایا وسائل سے 97 فیصد پانی حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ صرف ایک فیصد پانی انسان کے خورد و نوش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پانی کا 30 فیصد حصہ آبپاشی کے لیے، 50 فیصد حصہ توانائی پیدا کرنے کے لیے، 13 فیصد حصہ کارخانوں میں استعمال کرنے کے لیے اور 7 فیصد حصہ گھریلو امور کے لیے استعمال میں آتا ہے۔ سمندروں سے غذائی وسائل جیسے مچھلیاں، جھینگے وغیرہ حاصل ہوتے ہیں۔ جبکہ پہاڑوں سے بہتے ہوئے پانی سے بجلی تیار کی جاتی ہے۔ ہم اپنی ضروریات زندگی کے ایک فیصد پانی کو بھی آلودہ کر دیں تو ہماری زندگی پر کتنے مضر اثرات پڑیں گے؟ اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

3۔ زمینی کرہ : ہماری زمین اور اس کی مٹی مختلف نامیاتی اور غیر نامیاتی مرکبات اور پانی پر مشتمل ہے۔ یہ زمینی کرہ ہمارے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہے اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ ہم اپنی ضرورت کی ہر چیز مثلاً غذا، معدنیات، نمکیات، پانی، لکڑی، کوئلہ اور ہر قسم کے نباتات اسی سے حاصل کرتے ہیں۔

4۔ حیاتی کرہ : زمینی کرے پر بسنے والے تمام جاندار، انسان، حیوانات، نباتات، خشکی و آبی کے ذی حیات، زمین میں رہنے والے حشرات اور خوردبینی اجسام حیاتی کرے کے اجزا ہیں۔ یہ ماحول کا سب سے اہم جز ہے جس کا دارومدار ہوائی، آبی اور زمینی کروں پر ہے۔ ان میں کسی بھی طرح کی ناخوشگوار تبدیلی حیاتی کرے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ماحول اور انسانی زندگی :

ہم جانتے ہیں کہ ماحول دراصل مختلف خولوں کا مجموعہ ہے۔ زمین کی اوپری سطح سے کچھ سو کلو میٹر تک کی دوری تک کے ایک خول میں جو بھی آتا ہے، وہ ماحول ہے۔ اس میں جاندار اور غیر جاندار بھی موجود ہیں۔ زمین کے اوپر کی ہوا، اس کی سطح اور اندر کے پانی اور پانی نما جیسے برف وغیرہ اس کے علاوہ زمین کے اوپر اور اندر کی مٹی سب ماحول میں شامل ہیں۔ اسی میں زندگی ہے اور زندگی کی علامتیں بھی ہیں۔ انسان اسی ماحول میں رہتا ہے جہاں سے وہ اپنے لیے پھل، پھول، اناج، کپڑے اور ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی اور اسی صلاحیت نے انسان کو ترقی یافتہ بنا کر اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ خوب ترقی کی، کمپیوٹر، موبائل، نیوکلیئر پلانٹ، لڑاکو جہاز سب کچھ تیار کیا اور ماحول کو آلودہ کرتا گیا۔

ماحولیاتی آلودگی :

اللہ تعالیٰ نے ہمارے ماحول میں مختلف وسائل انسان کے لیے رکھے ہیں لیکن انسان کی بے سوچی سمجھی ترقی، توانائی کی ضرورت اور اس میں جلانے کی وجہ، طرح طرح کی مشینوں کے بننے اور ان میں ایندھن کے استعمال نے وسائل کو خراب کیا ہے اور ماحول میں آلودگی بڑھائی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے نباتات، حیوانات، چھوٹے جانوروں، کیڑے مکوڑوں، پانی کے جانداروں کے ساتھ ساتھ ماحول پر بھی بہت خراب اثر ڈالا ہے جس کے نتیجے میں آدھے سے زیادہ قسم کے حیوانات اور نباتات ختم ہو چکے ہیں۔ اور جو موجود ہیں ان کا مستقبل بھی پریشانیوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہوا، مٹی، پانی، آسمان میں، پیڑ پودوں میں، تمام کیمیائی اشیا میں نامناسب اجزاء مل گئے ہیں جس سے وہ اب اتنے فائدہ مند نہیں رہ گئے ہیں، جتنے کہ وہ پہلے ہوا کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف آلودگی ہے۔ جدید ترقی یافتہ دور میں ہم سوچتے ہیں کہ ہم ترقی کر رہے ہیں لیکن یہ ہماری بھول ہے۔ آلودگی ترقی کی دین ہے اور یہ ترقی کو پیچھے لے جا رہی ہے۔ یہ آلودگی مختلف اقسام کی ہے جیسے کہ ہوا کی آلودگی، مٹی کی آلودگی، آواز کی آلودگی، صنعتی آلودگی، پانی کی آلودگی، درجہ حرارت بڑھنے کی وجہ سے آلودگی، اٹامک اور نیوکلیائی آلودگی، کیڑے مار دواؤں کی وجہ سے آلودگی وغیرہ۔ یہ آلودگی بڑھتی جا رہی ہے اور دنیا کا یہ اہم ترین مسئلہ بن گئی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر موسم کے بدلاؤ پر ہوا ہے۔

بدلتے موسم

ماحولیات میں تبدیلی ہم اپنی عقل سے لائے ہیں۔ اس وجہ سے موسم بھی بدلتے جا رہے ہیں۔ مگر یہ ہماری مرضی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے بدل رہے ہیں۔ موسم دھیرے دھیرے بدل رہے ہیں۔ جن لوگوں کی عمریں 50 سال سے زیادہ ہو گئی ہیں وہ لوگ اکثر کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ، سردی اس طرح پڑتی تھی، گرمی میں ہم لوگ یہ کہا کرتے تھے، بارش تو اتنی ہوتی تھی کہ دسیوں دنوں تک سورج کا دیدار ہی نہیں ہوتا تھا، لوگ گرمی دینے

والے سورج کے لیے دعائیں کرتے تھے۔اور جب بارش نہیں ہوتی تو نمازیں پڑھی جاتی تھیں۔فصلیں خراب ہوتی تھیں اور کسی سال اتنی بارش ہوتی تھی کہ ساری سڑکیں ڈوب جاتی تھیں۔ انسان نے جب سے حساب رکھنا شروع کیا، تو سب سے پہلے موسم کا ہی حساب رکھا۔ کچھ نہیں کیا تو بھی بس اتنا ہی یاد رکھا کہ بارش زیادہ ہوئی یا کم ہوئی۔ گرمی پڑی تو کتنی زیادہ ہوئی، دن رات برابر میں ہیں یا نہیں، درجہ حرارت زیادہ تو رہا مگر گرمی کم لگی، ہوا چل رہی تھی یا نہیں چل رہی تھی، سورج نکلنے کا وقت، ڈوبنے کا وقت وغیرہ۔ ماحول میں طرح طرح کے گیسوں کی وجہ سے، گرمی سردی میں فرق کی وجہ سے، بارش کی کمی زیادتی کی وجہ سے، ہوا کے تیز اور دھیمے ہونے سے، ہوا میں نمی کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے بہت فرق آیا ہے۔ بہت سے حیوانات اور نباتات ختم ہو رہے ہیں۔ بعض میں کچھ تبدیلیاں آرہی ہیں۔ یعنی کہ موجود تو ہیں لیکن بہت چھوٹے ہیں، عمریں گھٹ رہی ہیں، کوئی پیڑ اس وجہ سے ختم ہوگیا کہ اس کا بیج جب کوئی جانور کھالیتا تھا تو اس کی غلاظت سے جب پھر وہ واپس ہوا میں آتا تھا تو اس میں کچھ فرق آجاتا تھا جو کہ اس کے دوبارہ پنپنے کے لیے ضروری تھی۔ اور اس میں کونپل نکل آتی تھی۔ اب کسی اور وجہ سے وہ جانور یا چڑیا نہ رہی تو یہ بیج بھی پنپ نا سکا اور اس پیڑ پودے کی بھی نسل ختم ہوگئی۔ بہت سے جانور جیسے ڈیناسور اب باقی نہیں رہے۔ پہلے گدھ اور کوے بہت ہوتے تھے، اب تو یہ عالم ہے کہ گدھ تو شہروں، قصبوں میں ہی کیا گاؤں میں بھی دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ ہاں کوے دکھائی دیتے ہیں لیکن کم کم۔ مچھر بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ شہروں میں جنگلی ہاتھی یا چیتے کے بھاگ آنے کی خبریں آئے دن سننے کو ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہاتھی یا چیتے بہت زیادہ ہوگئے ہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں یہ رہتے تھے وہاں کے جنگل کٹ گئے ہیں۔ بھاری بھاری مشینوں سے سڑکیں اور دیگر کام اور انتظام ہو رہا ہے۔ ان کے گھروں پر آدمی قبضہ کر رہا ہے۔ تو یہ راستہ بھول کر شہروں کی طرف آجاتے ہیں۔

موسم میں روز بروز تبدیلیاں ہوتی جارہی ہیں جس کی وجہ سے مختلف اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ زمین کے درجہ حرارت میں اضافے کی وجہ سے گلیشیر پگھلنے لگے ہیں جس کی وجہ سے سمندر کی سطح میں 15 سینٹی میٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ اکیسویں صدی میں سمندری سطح میں 59 سینٹی میٹر کے اضافے کا امکان ہے جس کی وجہ سے سمندری کنارے غرقاب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ برف پگھلنے کی وجہ سے سمندر غیر متوازن ہوتا جارہا ہے۔ پچھلی کچھ دہائیوں میں اتھلے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑنے کی وجہ سے سمندر کی اوپر کی فضاء کا درجہ حرارت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے کئی سمندری جاندار تباہ ہوگئے ہیں اور تیز بارش کی وجہ سے کئی علاقوں میں سیلاب آیا ہے۔ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے انھیں 1970 کی بہ نسبت انٹارٹکا کے سمندر میں اضافہ ہوا ہے۔ آلودگی کی وجہ سے کرہ ارض کے درجہ حرارت میں اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے زمین پر مختلف ذی حیات کی زندگی متاثر ہوئی ہے۔

بدلتے موسم کے ذمہ دار ہم خود:

انسان نے اپنی ترقی کے لیے قدرتی ماحول میں بہت بگاڑ پیدا کیا ہے۔ حد سے زیادہ وسائل کا استعمال کیا ہے۔ اس نے سمندر کو اونچے اونچے پہاڑوں میں تبدیل کیا ہے، برفانی پہاڑوں کو سمندر میں تبدیل کیا ہے، ندیوں کو سکھایا، مٹی کو برباد کیا، زمین میں موجود پانی کو برباد کیا، زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ کیا، گلیشیر کو پگھلا کر سطح آب میں اضافہ کیا، اس کی وجہ سے موسم میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ راجستھان میں جہاں بارش کم ہوتی تھی، اب وہاں پر باڑھ آتی ہے۔ جبکہ میگھالیہ اور کیرلہ پانی کو ترستے ہیں۔ بہت سے جنگل اب بنجر ہو چکے ہیں۔ وہاں پانی بھی نہیں برستا اور مٹی بھی خراب ہوگئی ہے۔ کروڑوں اقسام کے پیڑ پودے، کیڑے مکوڑے ختم ہوگئے ہیں۔ انسان نے فیکٹریاں قائم کیں جس کے ذریعے کاربن ڈائی آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ، میتھین، کلورو فلورو کاربن کا اخراج ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں گلوبل وارمنگ ہو رہی ہے۔ اوزون کی پرت پتلی ہوتی جارہی ہے۔ پیڑ پودوں کو نقصان ہو رہا ہے۔ تیل، کوئلہ اور معدنیات کا ذخیرہ گھٹتا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ کیمیائی کھاد اور کیڑے مارنے والی دواؤں نے زمین کو برباد کردیا ہے۔ تیزابی بارش نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی ہے۔ انسانی صحت روز بروز متاثر ہوتی جارہی ہے۔ سانس کی، جلد کی، اور کینسر کی بیماریاں عام ہوگئی ہیں۔ شور نے نیند حرام کردی۔ بہرہ پن، جھنجھلاہٹ، نفسیاتی و دماغی امراض میں اضافہ ہوا ہے۔ صاف آکسیجن نہیں مل پارہی ہے اور انسانی زندگی بہت متاثر ہوگئی ہے۔

تدارک :

ہم آج بھی اگر سنجیدگی سے سوچیں تو ماحولیاتی آلودگی کو روک سکتے ہیں۔ بدلتے موسم کو روک سکتے ہیں۔ ہمارے ماحول کو صاف بنا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ہم کو سنجیدگی سے غور کر کے عملی طور سے کچھ اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جیسے شمسی توانائی کا استعمال روشنی کے لیے، کھانا پکانے کے لیے اور الیکٹرانک آلات کے لیے کرنا چاہیے۔ جتنے ہو سکے پیڑ لگائیں۔ تالاب بنائیں۔ پانی کو زمین کے اندر محفوظ کریں۔ زمین سے حاصل ہونے والی قدرتی دولت کا حسب ضرورت اور کم استعمال کریں۔ آبادی پر قابو رکھیں۔ پلاسٹک کا استعمال، کیمیائی کھاد اور کیڑوں کو مارنے والی ادویات کا استعمال ترک کردیں۔ ہم اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو صاف ستھرا اور خوشگوار رکھیں۔ سائیکل کا استعمال، کپڑوں کی تھیلیاں، قدرتی دواؤں اور ضروریات زندگی کا استعمال کریں۔ کیونکہ یہ چیزیں ہم کو قدرتی ذرائع سے مفت ملتی ہیں۔ ان سے پیار کریں۔ زمین سے، زمین کے گھومنے سے، صبح سے، شام سے، آسمان اور اس کے بدلاؤ سے، دھنک سے، زمین کے لوگوں سے، چڑیوں اور جانوروں سے، پھول سے، پھولوں کی مہک سے، صاف پانی سے، سورج سے، چاند سے، جھرنوں سے، ندیوں سے، پہاڑوں سے، پیڑوں کی چھاؤں سے، آم سے، آدمیوں سے، عقل سے، سچائی سے، ہندوستان سے، ہندوستانیوں سے اس طرح سے ہم لاکھوں سالوں تک اس زمین اور ماحول کو خوبصورت اور رہنے کے لائق پاتے رہیں گے اور ہمارے موسم جوں کے توں برقرار رہیں گے۔

> **موسم میں روز بروز تبدیلیاں ہوتی جارہی ہیں جس کی وجہ سے مختلف اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ زمین کے درجہ حرارت میں اضافے کی وجہ سے گلیشیر پگھلنے لگے ہیں جس کی وجہ سے سمندر کی سطح میں 15 سینٹی میٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ اکیسویں صدی میں سمندری سطح میں 59 سینٹی میٹر کے اضافے کا امکان ہے جس کی وجہ سے سمندری کنارے غرقاب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ برف پگھلنے کی وجہ سے سمندر غیر متوازن ہوتا جارہا ہے۔**

■

Mr. Rafiuddin Nasir
Maulana Azad College
Roza Bagh
Aurangabad - 431001 (MS)

ہندوستانی موسیقی میں پرانے فلمی نغموں کا مقام

نثار راہی

موسیقی کا شمار فائن آرٹ میں کیا جاتا ہے اور دنیا میں بے شمار لوگ موسیقی سنتے اور سر دُھنتے آرہے ہیں۔ کچھ لوگ (کہ جن میں عمر رسیدہ زیادہ ہوتے ہیں) ہندوستانی کلاسیکی موسیقی بہت شوق سے سنتے ہیں اور ملک کا نوجوان طبقہ انگریزی اور ہندی پاپ میوزک کا شوقین ہے۔ دیکھا جائے تو موسیقی ہندوستانیوں کے دلوں اور خون کی رگوں میں رچی بسی ہے کیونکہ صوبوں اور ریاستوں میں دیہات کے لوگ لوک گیت اور لوک سنگیت بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ کرناٹک، بنگال اور کشمیر کے لوک گیت اور سنگیت وہاں جب بجتے سنائی دیتے ہیں تو کانوں میں جیسے رس گھولتے ہیں۔

لیکن..... بڑی اہمیت ہے ہمارے پرانے فلمی گانوں کی چالیس سے لے کر ستر کی دہائی تک یعنی چالیس سال کے عرصے میں بننے والی فلموں سے نکل کر جو گانے آئے تھے وہ آج بھی بہت لوگوں کے دل و دماغ پر راج کر رہے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ برصغیر میں بے شمار لوگوں کو فلموں کے پرانے گانوں کا دیوانگی کی حد تک شوق ہے اور کیوں نہ ہو کہ ان پرانے گانوں میں کیا نہیں ہے۔ ان میں بھرپور نغمگی ہے، سرور ہے، مستی ہے، اور اس سے بھی آگے یہ کہ وہ دماغ کو تناؤ سے چھٹکارا دلا کر سکون عطا کرتے ہیں اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ پرانی فلموں کے گانوں کی یہ موسیقی دماغ کا علاج بھی ہے۔ شائقین کے لیے تو یہ موسیقی جادو ہے۔

اس دنیا میں یہ ایک جادو ہی تو ہوگیا کہ فلموں کی اس موسیقی کا جنم ہوا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے بڑے Genius موسیقار آئے اور فلموں کے لیے گانے بناتے گئے۔ وہ لوگ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں اچھے اچھے گانے بناتے گئے۔ خصوصاً پچھلی صدی کی پچاس سے ستر کی دہائی کا ایک دور تھا کہ اس دور میں جہاں اچھے موسیقار آئے وہیں بہت اچھے گلوکار بھی ممبئی آئے اور گانے بنتے ہی چلے گئے۔ اچھے گانوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، ہزاروں میں ہے۔ ہر گانہ اپنی جگہ لطف و سرور دیتا ہے۔

شروع کے موسیقاروں میں انل بسواس، حسن لال بھگت رام، پنکج ملک، آر سی بورال، کھیم چند پرکاش اور سجاد حسین وغیرہ تھے۔ آگے آنے والوں میں کچھ اور زیادہ Genius نوشاد علی، غلام محمد، شنکر جے کشن، ایس ڈی برمن، او پی نیر، سی رام چندر، مدن موہن، خیام، ہنس راج بہل، سلیل چودھری، وسنت دیسائی، ہیمنت کمار، روشن، ناشاد، چترگپت، آر ڈی برمن، لکشمی کانت پیارے لال وغیرہ آئے۔

یہ موسیقار لوگ تھے جنھوں نے بے شمار خوبصورت گانوں کی بارش کی جس سے ہلکی پھلکی موسیقی سننے والے شرابور ہوئے۔ ان موسیقاروں میں کون بڑا ہے اور کون چھوٹا یہ کہنا مشکل ہے کیونکہ خوبصورت گانے ان سبھی نے بنائے۔ پھر بھی تین یا چار موسیقار ایسے ہیں جنھیں فہرست میں اوپر رکھنا پڑتا ہے۔ پہلا نام تو موسیقار نوشاد ہی کا ہے جن کے سنگیت میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی یعنی راگ راگنیوں کی دھوم ہے۔ اب راگ راگنیوں والے گانوں اور ان کے موسیقاروں کو تو فہرست میں اوپر ہی رکھا جائے گا کیونکہ راگ اور راگنیاں ہندوستانی موسیقی کی روح ہیں۔ اچھی دُھن ان ہی سے بنتی ہیں جو لازوال ہیں۔ موسیقار ایس ڈی برمن کے بیشتر گانے بنگال اور آس پاس کے پہاڑی صوبوں کی لوک دھنوں پر مبنی ہیں۔ پھر آیئے موسیقار جوڑی: شنکر جے کشن پر جنھوں نے نہ صرف ہندوستانی اور انگریزی کلاسیکی موسیقی پر بے شمار گانے بنائے بلکہ ملک کے لوک گیتوں اور انگریزی پاپ موسیقی سے بھی فیض حاصل کیا اور بہترین دھنیں بنا کر عوام کے دل جیت گئے۔ اب آیئے موسیقار او پی نیر پر جن کی موسیقی ذرا الگ قسم کی ہے اور جنھوں نے کئی فلموں میں آشا بھوسلے کی آواز لے کر گانوں میں جادو سا بھر دیا تھا۔ لتا منگیشکر کی آواز کے بغیر وہ بہت کامیاب ہوئے۔ ان کے گانوں کی Rhythm میں بڑی مستی ہے۔ انھوں نے پنجابی لوک سنگیت سے فیض حاصل کیا۔ او پی نیر نے ایک بار وودھ بھارتی ریڈیو پر پروگرام دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستانی فلموں کے موسیقاروں کی فہرست میں سے تیسرے نمبر پر آنے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ بلاشبہ دو بڑے تو نوشاد اور شنکر جے کشن ہوئے لیکن تیسرے نمبر پر ایس ڈی برمن اور او پی نیر میں سے کسی ایک کو لانے میں میں خود ناکامیاب ہوا ہوں کیونکہ دونوں کی ٹکر یا اہمیت برابر کی ہے۔ تیسرے نمبر پر اگر میں ایس ڈی برمن کو لاتا ہوں تو او پی نیر کے ساتھ ناانصافی ہوجائے گی اور اگر او پی نیر کو تیسرے نمبر پر لاتا ہوں تو ایس ڈی برمن کے ساتھ ناانصافی ہوجائے گی۔ یہ فیصلہ تو آپ کیجیے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ فیصلہ تو آپ بھی نہیں کر پائیں گے۔

مندرجہ بالا چار موسیقاروں کے بعد فہرست میں پھر کسی کو بھی لاتے رہیے، سب ایک جیسی قابلیت کے لوگ ہیں اور بڑے اچھے ہیں۔ جیسے ہیمنت کمار، غلام محمد، ہنس راج بہل، مدن موہن، سی رام چندر، خیام، سلیل چودھری، روشن، جے دیو، این دتا (فلم سادھنا فیم)، وسنت دیسائی (جھنک جھنک پائل باجے فیم) وغیرہ۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ان کو فہرست میں اوپر رکھو یا نیچے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب برابر کے درجے کے ہیں اور سبھی بہت لائق اور شاندار ہیں۔ میں عموماً تین موسیقاروں کو اپنے موڈ کے حساب سے سنتا ہوں۔ زیادہ شنکر جے کشن کو، پھر او پی نیر کو۔ اور جس دن نوشاد کی

موسیقی سننے کا زبردست موڈ ہو تو پھر نوشاد ہی نوشاد کو سنتا ہوں اور تب لگتا ہے کہ نوشاد سے بڑا کوئی نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری پرانی فلموں کی موسیقی کا بادشاہ نوشاد ہی ہے۔ ششی کپور نے ایک بار کہا تھا کہ سب میں بہتر شنکر جے کشن ہیں۔ کوئی شک نہیں۔ وہ بہترین ہیں مگر نوشاد لاجواب ہیں اور او پی نیر کسی سے کم نہیں۔ اس بحث سے یہ ثابت ہوا کہ تیسرے نمبر پر رکھے جانے لائق او پی نیر ہی ہیں۔ ہاں جب کبھی موڈ ایس ڈی برمن کو سننے کا ہو تو سب دھرے رہ جاتے ہیں اور بڑے میاں کا جادو لتا منگیشکر کی آواز میں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ذرا پیئنگ گیسٹ، ابھیمان، عشق پر زور نہیں، دیوداس اور منزل (دیو آنند والی) کے گانے سن کر دیکھیے تو پتہ لگ جائے گا کہ موسیقی کے راجاؤں میں ایک بڑے راجہ ایس ڈی برمن صاحب بھی ہیں۔

ابھی تک میں نے ان موسیقاروں کے 'گانوں کی' بات نہیں کی ہے۔ اب کروں گا تو سوچنا پڑے گا کہ سب میں پہلے یعنی سب سے ٹاپ پر کون سا گانا آتا ہے لیکن یہ کام بھی مشکل ہے کیونکہ بے شمار پرانے گانوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس سلسلے میں گانوں پر آگے بات کرنے سے قبل اگر ہم گلوکاروں پر تھوڑی سی بات کرلیں تو بہتر ہوگا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں مرد گلوکاروں میں کے ایل سہگل، پنکج ملک، محمد رفیع، منا ڈے، مکیش، طلعت محمود، ہیمنت کمار، سی ایچ آتما، کشور کمار اور مہندر کپور سرفہرست ہیں۔ وہیں خواتین گلوکاروں میں لتا منگیشکر، آشا بھوسلے، گیتا دت، شمشاد بیگم، ثریا، نور جہاں اور مبارک بیگم اہم ہیں۔ خواتین گلوکاروں میں لتا منگیشکر اور مرد گلوکاروں میں محمد رفیع سب سے بہتر ہیں۔ بے شک سہگل صاحب اونچی چیز ہیں اور دیگر ساری آوازوں سے الگ ہٹ کر ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ محمد رفیع ان سے بازی مار لے گئے۔ سہگل کے سننے والے بہت ہی کم ہیں جبکہ رفیع کا دیوانہ ہر کوئی ہے۔ انھوں نے ہر رنگ اور ہر موڈ کے گانے گائے ہیں۔ دراصل سہگل کا مقابلہ کسی سے نہیں کیا جاسکتا کہ واقعی وہ بہت اونچی چیز ہیں۔ سی ایچ آتما اور پنکج ملک بھی خاص موڈ میں سننے کی چیز ہیں لیکن یہ تینوں آج کے وقت میں پیچھے رہ گئے جبکہ لتا منگیشکر، محمد رفیع اور منا ڈے سدابہار ہیں۔ خصوصاً لتا منگیشکر اور محمد رفیع کی آوازیں امر ہوچکی ہیں اور ممکن ہے کہ ایک ہزار سال بعد بھی سنی جائیں۔

اب گانوں پر بات کرتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ لتا منگیشکر کے کون سے گانے بہترین ہیں۔ سب ایک سے ایک اچھے۔ وہ سیب اور آم کے باغ کے لدے ہوئے پھلوں کی طرح ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ لتا جی نے فلم 'اُڑن کھٹولہ' میں اپنی بہترین آواز دی ہے۔ مورے سیاں جی اتریں گے پار... میرا سلام لے جا... حال دل میں کیا کہوں... ڈوبا تارا امیدوں کا سہارا چھوٹ گیا... وغیرہ۔ اس کے بعد فلم 'ناگن' کے گانے اور ناگن کے بعد فلم 'امر' کے گانے جو نوشاد ہی نے بنائے۔ ان کے اچھے گانوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ میں گناتے گناتے تھک جاؤں گا۔ چند کے نام سن لیجیے: اے دل ناداں (رضیہ سلطان)، بول ری کٹھ پتلی (کٹھ پتلی)، تو نے ہائے میرے زخم جگر کو چھولیا (نگینہ)، محفل میں جل اٹھی شمع (نرالا)، آجاؤ تڑپتے ہیں ارماں (آوارہ)، جو میں جانتی بسرت ہیں سیاہ (جوگن) سیاں پیارا ہے اپنا ملن (دو بہنیں)، پیاسی ہرنی بن بن ڈولے (دو دل)، رجنی گندھا پھول تمھارے (رجنی گندھا)، میرے پھولوں سے بھی پیار (ناستک)، آجا رے میں تو کب سے کھڑی اس پار (مدھومتی) وغیرہ۔ لتا منگیشکر کے گانوں میں سوز بھی ہے، سنجیدگی بھی ہے، مستی بھی ہے اور ان میں انگڑائیاں لیتی مدھ بھری جوانی بھی ہے۔

اسی طرح محمد رفیع کے اچھے گانے بھی بے شمار ہیں جو گنائے نہیں جاسکتے۔ آپ سنتے ہی رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا موسیقاروں کے گانوں میں خاص بات یہ ہوتی تھی کہ دُھنوں اور گانوں میں دل کو چھو لینے والی نغمگی تو ہوتی ہی تھی، سازوں کا بہترین جوڑ (سنگت) ہوتا تھا۔ گانا شروع ہونے سے پہلے کے ساز اور پھر مکھڑا گائے جانے اور انترا آنے سے قبل کے ساز اور ان کی آواز سے نکلی دُھن لاجواب ہوتی تھی۔ نہ جانے کیسے انھوں نے گانے کے شروع میں اور درمیان میں اتنے بہترین ساز بجائے کہ بہترین دھن بن گئی۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ سازوں میں کہیں ڈھیر سارے وائلن تو کہیں گٹار، کہیں مینڈولن، کہیں ستار، کہیں سرود، کہیں اکارڈین، کہیں جل ترنگ، کہیں طبلہ، کہیں کانگو ڈرم، کہیں بونگو ڈرم، کہیں پیانو، کہیں سیکسا فون، کہیں ٹرمپیٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ ان سازں کا سنگت اتنا لاجواب ہوتا تھا کہ یہ وہی قابل اور عظیم موسیقار کرسکتے تھے کہ جن کے نام میں نے اوپر گنائے۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ آپ شنکر جے کشن کا گانا 'بول ری کٹھ پتلی' اور فلم اناڑی' کے سارے گانے سن کر دیکھیے کہ گانے کے شروع میں اور پھر اندر سازوں سے دھن بجانے میں شنکر جے کشن کا جواب نہیں تھا۔ گانوں میں سازوں کی دُھنیں ان سے اچھی شاید کسی دیگر نے نہیں دیں۔ گانوں کے شروع میں اور اندر بہترین ساز بجانے میں او پی نیر کا مقام دوسرا ہے۔ ان کے ساز ہی تو دل و دماغ میں مستی پیدا کرتے ہیں۔ ممبئی کی لوکل ٹرین میں ایک زمانے میں پیسے مانگنے والے دو مٹھے بجا کر بڑی پیاری کھٹ کھٹ کی آواز نکالتے تھے۔ اس آواز کا استعمال او پی نیر نے کئی گانوں میں، خصوصاً نائٹ کلب کے ڈانس کے گانوں میں استعمال کیا اور کئی گانوں میں انھوں نے سارنگی بھی خوب بجوائی ہے۔ فلموں کے موسیقار لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے ساز اور آواز لائے جن کا انھوں نے اپنے گانوں میں استعمال کیا۔ اس طرح کے تجربے اور اتنے پیارے پیارے گانے اور کہاں مل سکتے ہیں۔ شاید کہیں نہیں۔ ایک گانے میں سب کچھ ہوتا ہے۔ پیارے ساز، پیاری دُھن اور پیاری آواز جو سننے والوں کے جذبات کو چھو کیے بغیر نہیں مانتی۔ جیسے کہ فلم 'سیما' کا شنکر جے کشن کا بنایا اور محمد رفیع کا گایا گانا 'کہاں جارہا ہے تو اے جانے والے' جیسے فلم 'بسنت بہار' کا منا ڈے کا گانا 'سرنا سجے کیا گاؤں میں' آج کی ٹیکنالوجی کے زمانے میں ساز تو بڑے اچھے اچھے آگئے ہیں مگر ان سے نغمگی، سرور اور مستی پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔

فلمی موسیقاروں کے کئی گانے راگ اور راگنیوں پر بھی مبنی ہیں۔ انھوں نے گانوں میں جابجا راگ بھیروں، راگ یمن اور دیگر کچھ راگوں کا خوب استعمال کیا ہے۔ نوشاد کی فلم 'بیجو باورا' اور شنکر جے کشن کی فلم بیشتر گانے ہندوستانی کلاسیکی موسیقی پر ہی مبنی ہیں۔ ایسے گانوں میں بلا کی نغمگی ہے جو دل کو چھو لیتی ہے۔ فلمی گانوں کو مؤثر بنانے میں بولوں یعنی شاعری کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ جیسے شاندار گانے شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، شیلندر، راجندر کرشن، حسرت جے پوری، راجہ مہدی علی خاں، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، قمر جلال آبادی، اور ایس ایچ بہاری وغیرہ نے بڑی کثرت سے مندرجہ بالا موسیقاروں کے لیے لکھے ویسے پھر کسی نے نہیں لکھے۔ پرانے گانوں کی کشش میں جہاں موسیقاروں کی قابلیت کو دخل ہے وہیں مندرجہ بالا شاعروں اور گیت کاروں کا بھی بڑا Contribution ہے۔

پرانے فلمی گانوں کے شائقین ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں بے شمار ہیں۔ ایسی موسیقی کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کلب ایسے ہیں جو کبھی کبھی پرانے فلمی گانوں کو نئے گلوکاروں کی آواز میں جب کبھی پیش کرتے ہیں تو بے شمار شائقین ان گانوں پر سر دھنتے ہیں۔ وہ گانے شائقین کے لیے ہماری پرانی فلموں کے موسیقاروں اور گائکوں کا بہت بڑا تحفہ ہیں۔

■

Nisar Rahi (Advocate)
P-44, B.D.A Colony
Teela, Jamal Pura
Bhopal - 462001 (MP)

اوم پرکاش سونی

پختون رہنما خاں غازی کابلی
محبِ ہند اردو شاعر اور صحافی

پختون رہنما خاں غازی کابلی ایک دل چسپ صحافی تھے۔ وہ عمر بھر مہاشہ کرشن ایڈیٹر روزنامہ پرتاپ لاہور کے حلقۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ ان کی سیاسی نظمیں اور مضامین بھی 'پرتاپ' کی زینت ہوتے تھے۔ حالانکہ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر روزنامہ 'زمیندار' لاہور میں اپنا ہدفِ قلم بناتے ہوئے ان کی شاعری پر سخت تنقید کرتے تھے۔ تاہم وہ اس نشتر زنی سے قطع نظر اپنی ڈگر پر رواں دواں رہتے۔

خاں کابلی سے میری ملاقات روزنامہ گردشِ ایام امرتسر کے دفتر میں ہوئی تھی۔ راقم شام کو چھپنے والے اخبار 'گردشِ ایام' امرتسر کا ایڈیٹر تھا جس کے ایڈیٹوریل کا تذکرہ آل انڈیا ریڈیو کے صبح 8 بجے نشر ہونے والے تراشے پروگرام میں کیا جاتا تھا اور مشہور صحافی جناب ستہ پرکاش شوق اسے مرتب کرتے تھے۔ مذکورہ پروگرام بے حد پسند کیا جاتا تھا اور جب کبھی اخبار گردش ایام جناب شوق کو نہ ملتا تو وہ فون پر اخبار نہ ملنے کی شکایت کرتے۔ چنڈی گڑھ میں مقیم معروف اخبار نویس جناب وشوا ناتھ طاؤس اخبار ہند میں چھپنے والے ایڈیٹوریل کے بڑے مداح تھے۔ فلمی اخبار نویس جناب طاؤس کا فلم ایکٹریس مدھوبالا پر لکھا گیا مضمون اولاً اسی اخبار کی زینت بنا تھا۔ یہ غالباً 1972 کا واقعہ ہے۔ جناب طاؤس نے راقم کے متعلق بھی ایک طویل مضمون قلمبند کیا جس کی اصل اب بھی میری تحویل میں ہے جو ایک یادگار مضمون کی حیثیت کا حامل ہے۔

پختون رہنما خاں غازی کابلی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے اور سر پر مشہدی لنگی

فرہاد و قیس سے نہیں کم میرا جوشِ عشق
کہتی ہے میرے نعروں کو دُنیا خروشِ عشق

خروشِ عشق

"ہند بھر میں خان غازی ایک ہی پشتون ہے"
آرہی ہے یہ صدا کابل سے اور چترال سے

خان غازی کابلی

سو رہی ہے دیش کی قسمت جگانا چاہیے
زور سے جے ہند کا نعرہ لگانا چاہیے

جے ہند

یعنی

حضرت خان غازی کابلی کا مجموعۂ کلام

ملنے کا پتہ
جے ہند پبلشرز رجسٹرڈ میدان بھاٹیاں لاہور

ان کی شان کو نمایاں کررہی تھی۔ نمستے علیکم کہتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے کہ میں قادیان میں اپنے رفقا سے ملاقات کرنے گیا تو سوچا کہ امرتسر کے اخبار نویسوں سے مل لوں۔ اتنا کہتے ہوئے انھوں نے اپنے جھولے سے پختون تحریک کی حمایت میں چھپے ہوئے تین چار پمفلٹ میز پر رکھ دیے اور کہا کہ پختون تحریک کے بارے میں بھی کچھ خامہ فرسائی کریے۔

پختون رہنما خاں غازی کابلی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے اور سر پر مشہدی لنگی ان کی شان کو نمایاں کررھی تھی۔ نمستے علیکم کہتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے کہ میں قادیان میں اپنے رفقا سے ملاقات کرنے گیا تو سوچا کہ امرتسر کے اخبار نویسوں سے مل لوں۔ اتنا کہتے ہوئے انھوں نے اپنے جھولے سے پختون تحریک کی حمایت میں چھپے ہوئے تین چار پمفلٹ میز پر رکھ دیے اور کہا کہ پختون تحریک کے بارے میں بھی کچھ خامہ فرسائی کریے۔

خاں غازی کابلی چائے نوشی اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے کے بعد دہلی کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ اب بھی روزنامہ پرتاپ سے وابستہ تھے جو اب لاہور کی بجائے نئی دہلی سے شائع ہورہا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد خاں غازی نے خط وکتابت شروع کردی۔ پندرہ پیسے کے پوسٹ کارڈ پر اوم جے جگدیش ہرے لکھنے کے بعد اصل عندیہ لکھتے۔ مذکورہ خطوط اب بھی میرے پاس ہیں۔

خاں غازی کابلی کا اصلی نام حبیب الرحمٰن تھا۔ ان کی پیدائش 1885 بمقام دراگی ضلع خوسنت پاکتا افغانستان میں ملک عبدالرحیم خاں کے ہاں ہوئی۔ 1915 میں جب افغانستان میں ہندوستان کی عارضی حکومت مہاراجہ مہندر پرتاپ کی صدارت میں قائم ہوئی تو خاں غازی کو ہندوستان کی آزادی دلانے کی جدوجہد سے دل چسپی ہوگئی اور اسی مقصد کی تکمیل وحمایت کے لیے وہ ہندوستان آئے۔ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا جبکہ سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں بھی مہاتما گاندھی اور کانگریس پارٹی کے حلیف تھے۔ سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار مولانا ابوالکلام آزاد کے بے حد مداح تھے۔ وہ خصوصی طور پر مولانا کا اخبار 'الہلال' کلکتہ آمد پر دوسرے کانگریسی اخبار پڑھا کرتے تھے۔ جبکہ انگریزی سرکار کی افسر شاہی ان اخبارات کے سخت خلاف تھی۔ وہ کئی بار خاں صاحب کو ان اخبارات کے نہ پڑھنے کی تلقین کرتی۔ تاہم سرحدی گاندھی بصد اشتیاق ان اخبارات کے مطالعہ میں مصروف رہتے۔ خاں غازی کابلی نے سرحدی گاندھی کی صحبت سے جو فیضان حاصل کیا۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ انھوں نے لاہور میں مہاشہ کرشن کے کثیرالاشاعت اخبار پرتاپ میں ملازمت اختیار کرلی۔

وہ روزنامہ 'پرتاپ' کے لیے سیاسی نظمیں اور مضامین لکھتے۔ مہاشہ کرشن بھی ان کی بڑی قدر اور حوصلہ افزائی کرتے کہ خاں غازی محبّ ہند ہیں۔

1935 میں جب شہید گنج مسجد کی واگزاری تحریک شروع ہوئی تو غازی نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعد ازاں وہ مجلس احرار ہند کے اخبار مجاہد لاہور میں بھی جزوقتی طور پر لکھنے لگے۔ وہ دلی طور پر کانگریس کی تحریک آزادی کے حامی تھے۔ ایک مرتبہ مہاشہ کرشن نے ایک اداریہ قلمبند کیا جس کا عنوان تھا 'ہٹلر کے خلاف ہٹلر شاہی'— خان غازی نے اس عنوان پر سخت اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ہٹلر کے خلاف ایڈیٹوریل کا مطلب یہ ہوگا کہ روزنامہ پرتاپ لاہور کو سرکار کی طرف سے ماہوار امداد ملتی ہے جیسا کہ کچھ اخباروں کو یہ امداد برابر مل رہی ہے۔ ہٹلر ہماری آزادی کے دشمنوں سے لڑرہا ہے اور ہم اس کے خلاف کیونکر لکھیں؟ مہاشہ جی نے خاں کابلی کا مشورہ قبول کرتے ہوئے اس ایڈیٹوریل کا رخ ہی بدل دیا اور خاں غازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ تم نے ایک بہت بڑی لغزش سے بچالیا۔ اگر مذکورہ ایڈیٹوریل چھپ جاتا تو پرتاپ کے وقار کو کاری ضرب لگنے کا احتمال تھا جبکہ پرتاپ آج تک حکومت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ انھوں نے گرجدار الفاظ میں کہا کہ ہمارا سر تو کٹ سکتا ہے لیکن جھک نہیں سکتا— چنانچہ مذکورہ عنوان کے تحت مہاشہ کرشن نے جو لیڈنگ آرٹیکل لکھا اس سے بڑی دھوم مچ گئی۔ سر سکندر حیات وزیراعظم پنجاب نے (ان دنوں وزیراعلیٰ نہیں وزیراعظم ہی لکھا جاتا تھا) مہاشہ کرشن کو کئی بار مدعو کیا لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کیا، سر سکندر حیات خاں نے اسے اپنی امانت خیال کرتے ہوئے اخبار پرتاپ پر سنسر بٹھا دیا لیکن مہاشہ کرشن نے سر سکندر کی سنسر لگانے کی مطلق پروانہ کی اور پرتاپ کی شان برابر برقرار رکھی۔

خاں غازی بنیادی طور پر انقلاب پسند اور آزادیِ ہند کے طالب تھے۔ ان کی ایک نظم تھی جان وطن گاندھی۔ اس کا ایک شعر تھا:

کہے یارب سلامت باکرامت
کہ ہے جانِ وطن گاندھی ہمارا

ان دنوں مہاتما گاندھی نظر بند تھے۔

روزنامہ 'پرتاپ' لاہور میں خان غازی کی ایک نظم چھپی تھی جس میں انھوں نے واشگاف طور پر انگیزی سرکار کو اس طرح للکارا تھا:

کہہ دو انگریزوں سے اب ہندوستان خالی کرو
مہمانی ہوچکی ہے میرا مکان خالی کرو

ان کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

ہم ایسے باغ میں گلگشت کو ذلت سمجھتے ہیں
نہ ہو جس کی زمیں اپنی نہ جس کا آسماں اپنا

مجموعی طور پر وہ آزادیِ ہند کی تحریک کے حامی تھے اور ان کی شاعری بھی سیاست سے مملو تھی۔ آزادی کے بعد وہ دہلی میں مقیم ہوگئے اور اخبار پرتاپ سے تواتر کے ساتھ اپنی گرویدگی قائم رکھی۔ حکومت ہند نے انھیں پانچ سو

”**پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا جبکہ سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں بھی مہاتما گاندھی اور کانگریس پارٹی کے حلیف تھے۔ سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار مولانا ابوالکلام آزاد کے بے حد مداح تھے۔ وہ خصوصی طور پر مولانا کا اخبار 'الھلال' کلکتہ آمد پر دوسرے کانگریسی اخبار پڑھا کرتے تھے۔ جبکہ انگریزی سرکار کی افسر شاھی ان اخبارات کے سخت خلاف تھی۔ وہ کئی بار خاں صاحب کو ان اخبارات کے نہ پڑھنے کی تلقین کرتی۔ تاھم سرحدی گاندھی بصد اشتیاق ان اخبارات کے مطالعہ میں مصروف رھتے۔**“

روپے ماہانہ پنشن سے نوازا۔ غازی نے اپنی خودنوشت ارسال کی تھی جواب خستہ حالت میں میرے پاس ہے۔

ایک روز ان کی اہلیہ کا خط ملا کہ 'غازی' سیڑھیوں سے پھسل کر راہیِ ملکِ عدم ہوگئے ہیں۔

■

Om Parkash Soni
H. No.: 151-B st3, Vijay Nagar
Near Millan
Place Batala Road
Amritsar - 143502 (Punjab)

کمپیوٹر

ایم ایس۔آفس کیا ہے؟
What is MS-Office?

ایم ایس۔آفس آج کل عام طور پر سبھی پرسنل کمپیوٹروں، یعنی پینٹیموں پر پایا جانے والا مقبول عام اپلی کیشن پیکج ہے۔ اس کا پورا نام مائکرو سوفٹ آفس پروفیشنل (Microsoft Office Professional) ہے۔ اس کا سب سے زیادہ استعمال کیا جانے والا ورژن ایم ایس۔آفس 2007 ہے۔ اس کتاب میں ہم سبھی جانکاری، تصویر وغیرہ ایم ایس۔آفس 2007 ورژن کے مطابق ہی دیں گے اور اسے مختصراً ایم ایس۔آفس کہہ کر پکاریں گے۔

ایم ایس۔آفس ونڈوز کے تحت کام کرتا ہے۔ اس میں کسی دفتر کے تقریباً سبھی کاموں کا کمپیوٹرائزیشن کرنے کے لیے تین بنیادی پروگرام شامل ہوتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(1) ایم ایس-ورڈ (MS-Word) یا ورڈ (Word)
(2) ایم ایس-ایکسل (MS-Excel) یا ایکسل (Excel)
(3) ایم ایس- پاور پوائنٹ (MS- Power Point) یا پاور پوائنٹ (Power Point)

ایم ایس۔آفس کے یہ سبھی پروگرام بنیادی طور پر الگ الگ قسم کے کاموں کو کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں، لیکن ان سبھی کا کام کرنے کا طریقہ لگ بھگ ایک جیسا ہے، جس سے ایک پروگرام پر کام کرنا سیکھنے کے بعد دوسروں کو سیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، ایم ایس-آفس کے ایک پروگرام سے دوسرے پروگرام میں کوئی تصویر، اشیا یا اطلاعات لانا لے جانا بہت ہی آسان ہے۔ اس لیے ان سے ہر قسم کے ملے جلے کام کا بھی کمپیوٹرائزیشن کیا جا سکتا ہے۔

ایم ایس۔آفس کے سبھی پروگراموں کو ہارڈ ڈسک میں انسٹال کرنے کے لیے لگ بھگ 70 میگا بائٹ اسپیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ضرورت ونڈوز کی ضرورت کے علاوہ ہے۔ اگر آپ ان سبھی پروگراموں کو انسٹال نہ کرنا چاہیں تو صرف چنے ہوئے پروگراموں کو انسٹال کر کے کم جگہ میں بھی کام کر سکتے ہیں۔

ایم ایس۔آفس کے درج بالا اہم پروگراموں کا مختصر تعارف نیچے دیا گیا ہے۔

ایم ایس۔ ورڈ (MS-Word)

یہ ایک ورڈ پروسیسنگ پیکج ہے، جس میں عام خط و کتابت سے لے کر ڈیسک ٹاپ پبلشنگ سطح تک کے سبھی کام آسانی کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں آپ متن (Text) ہی نہیں، تصویر یا گرافک (Graphics) بھی آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔

ایم ایس-ورڈ کو مختصراً ورڈ (Word) بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں روایتی مینو اور کی بورڈ کے شارٹ کٹس (Shortcuts) کے ساتھ ہی ربن (Ribbon) کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ ربن میں سات ٹیب (Tab) ہوتے ہیں۔ ہوم (Home)، انسرٹ (Insert)، پیج لے آؤٹ (Page Layout)، ریفرنسز (References)، میلنگس (Mailings)، ریویو (Review) اور ویو (View)۔ جن میں سے ہر ایک کسی خاص ہدایت کے برابر ہوتا ہے۔ ہر ایک ٹیب میں ایک ہی کام سے متعلق آپشن شامل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر Home ٹیب میں ٹیکسٹ ٹائپ کرنے اور مواد کو سجانے کے آپشن ہیں، Insert ٹیب میں ٹیکسٹ میں تصویر، جدول (ٹیبل)، ہیڈر-فوٹر وغیرہ جوڑنے کے آپشن ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ڈیسک ٹاپ پبلشنگ سے متعلق کاموں میں ایم ایس-ورڈ بہت کارآمد ہوتا ہے، کیونکہ یہ عنوان (Headings)، مشمولات (Table of Contents)، ضمیمہ Index) وغیرہ بہت تیزی سے بنا سکتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ بھی ہے کہ جب بھی آپ کوئی لفظ ٹائپ کرتے ہیں، تو وہ اس کے ساتھ اسپیلنگ کی جانچ (Check) کرتا رہتا ہے اور غلط پائے گئے الفاظ کو لال سیاہی سے خط کشیدہ (Underline) کر دیتا ہے۔ یہی نہیں اگر کوئی لفظ یا جملہ (Phrase) اِملا (Spelling) کے حساب سے صحیح ہو، لیکن رموزِ اوقاف (Punchtuation) کے حساب سے غلط ہو، تو اسے ہری سیاہی سے خط کشیدہ کر دیا جاتا ہے۔ اس میں یکساں معنی والے الفاظ کی لغت (Thesarus) کی سہولت بھی دستیاب ہے۔ ایم ایس-ورڈ کی آٹو فارمیٹ (Autoformat) خصوصیت آپ کے مواد کی جانچ کر کے، اسے اچھی طرح فارمیٹ کر کے تیار کر دیتی ہے۔

ایم ایس-ورڈ میں لفافے چھاپنے اور میل-مرج کرنے (ایک ہی پتہ کو بہت سے لفافوں پر چھاپنے) کی سہولت بھی موجود ہے، جو آپ کے کام کو اور زیادہ آسان بنا دیتی ہے۔

اس حصہ میں آپ ایم ایس-ورڈ کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

ایم ایس- ایکسل (MS-Excel)

یہ ونڈوز پر مبنی ایک اسپریڈشیٹ پیکج ہے۔ ایم ایس۔آفس کا حصہ ہونے کے سبب یہ ایم ایس-ورڈ سے بہت یکسانیت رکھتا ہے۔ اس کا ربن اور زیادہ ترتیب بھی ایم ایس-ورڈ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے ایم ایس-ورڈ پر کام کرنا سیکھنے کے بعد اس پر کام کرنا بہت ہی آسان ہوتا ہے۔ دیگر اسپریڈشیٹ پیکج کی طرح اس میں فعل (Function) کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ اس میں مختلف قسم کے چارٹ اور گراف صرف کچھ بٹنوں کو کلک کرکے بنائے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ اسپریڈشیٹوں میں دوسرے پروگراموں کے ذریعے بنائے گئے یا درآمد (Import) کیے گئے فوٹوگراف، ڈرائنگ، کلپ آرٹ، لوگو (شناختی نشان) وغیرہ بھی جوڑ سکتے ہیں۔

ایم ایس-ایکسل میں ایک ہی فائل میں کئی ورک شیٹ ہوسکتی ہیں۔ ایسا کرنا تب مفید ہوتا ہے، جب ایک ہی قسم کی ورک شیٹ میں متعدد محکموں یا اکائیوں کا ڈاٹا بھر کر اسے یکجا (Consolidate) کرنا ہو، یعنی جوڑنا ہو۔ ایم ایس-ایکسل میں یہ کام چٹکیوں میں کیا جاسکتا ہے۔

ایم ایس-ایکسل میں محدود طور پر ڈاٹا بیس کی سہولت بھی موجود ہے۔

ایم ایس-ورڈ سے اسپریڈشیٹ کا کوئی بھی حصہ ایک ایم ایس-ورڈ پاور پوائنٹ کے ڈاکیومنٹ میں آسانی سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ایم ایس-ایکسس کے ساتھ ڈاٹا کا لین دین بھی کیا جاسکتا ہے۔

ایم ایس-ایکسل کے بارے میں آپ حصہ 4 میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

ایم ایس- پاور پوائنٹ (MS-PowerPoint)

اس پروگرام کے ذریعے سیمناروں، مجلسوں، سمپوزیم وغیرہ میں پیش کرنے کے لیے سلائڈوں پر مبنی مواد تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ذریعے کئی سلائڈیں تیار کی جاتی ہیں، جنھیں پیش کش کے لیے کسی بھی ترتیب اور اسٹائل میں لگایا جاسکتا ہے۔ سلائڈوں سے آپ پمفلٹ یا ہینڈ آؤٹ (Handout) اور نوٹس (Notes) بھی چھاپ سکتے ہیں۔ اس پروگرام میں پیش کش کی کئی اسٹائلیں پہلے سے موجود ہیں، جن میں سے آپ اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی اسٹائل چن کر اس کا استعمال کرسکتے ہیں یا اس کو بہتر کرکے استعمال میں لاسکتے ہیں۔ آپ اس میں اپنی الگ خاص اسٹائل بھی بناسکتے ہیں۔

پاور پوائنٹ میں پیش کش کی مشق یا ریہرسل کمپیوٹر پر کی جاسکتی ہے۔ اس میں آپ ہر ایک سلائڈ کا وقت بھی سیکنڈوں میں طے کرسکتے ہیں تاکہ اتنی دیر میں آپ اس سلائڈ سے متعلق موضوع پر بول سکیں۔ آپ کسی سلائڈ پر لگائے گئے مواد پر متعدد قسم کے اینی میشن اثر بھی ڈال سکتے ہیں۔

پاور پوائنٹ کا ربن بہت سے ٹیب ایم ایس-آفس کے دوسرے پروگراموں سے بہت ملتے جلتے ہیں، اس لیے اس پر کام کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔

پاور پوائنٹ کی پیش کش میں میں آپ ایم ایس-ورڈ، ایم ایس-ایکسل وغیرہ دوسرے پروگراموں سے بھی مواد لاسکتے ہیں۔ اس میں آواز (Sound) کی پیش کش کی بھی سہولت موجود ہے۔ آپ پاور پوائنٹ کے مواد (یعنی سلائڈوں) کو ایم ایس-ورڈ کی دستاویز (Documents) میں بھی بھیج سکتے ہیں۔

پاور پوائنٹ کے بارے میں باب 5 میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے۔

ایم ایس- آفس کے پروگرام چلانا (Starting MS-Office Programs)

ہم بتا چکے ہیں کہ ایم ایس-آفس عام طور پر ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے کنٹرول میں چلتا ہے۔ اس آپریٹنگ سسٹم کے بارے میں آپ باب 2 میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ اگر آپ کے کمپیوٹر میں ایم ایس-آفس انسٹال ہوچکا ہے، تو اس میں ایم ایس-آفس کا بھی ایک فولڈر ضرور ہوگا، جسے آپ ونڈوز ایکس پلورر کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں۔

ایم ایس-آفس کے کسی پروگرام کو شروع کرنے کے لیے اسٹارٹ بٹن کو کلک کرکے اسٹارٹ مینو میں آئیے۔ اس مینو میں 'All Programs' آپشن پر کلک کرتے ہی 'All Programs' کے تحت مینو نظر آتا ہے۔ اس مینو میں 'Microsoft Office' کا ایک الگ گوشہ ہوتا ہے، جس پر کلک کرتے ہی ایم ایس-آفس کا مینو تصویر WD-1.1 کی طرح دکھائی دیتا ہے، جس میں ہر ایک پروگرام کا آئیکان دیا ہوتا ہے۔

ایم ایس-آفس کے جس پروگرام کو آپ شروع کرنا چاہتے ہیں، اس کے آئیکان کو کلک کردیجیے۔ اس سے وہ پروگرام شروع ہوجائے گا۔ اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ پر ایم ایس-آفس کے کسی پروگرام کا شارٹ کٹ بنا ہوا ہے، تو آپ اس کو ڈبل کلک کرکے براہِ راست بھی وہ پروگرام شروع کرسکتے ہیں۔ ایم ایس-آفس کے سبھی پروگرام اپنے آپ میں آزاد ہوتے ہیں، لہٰذا آپ اپنی ضرورت کے مطابق ان میں سے کسی کو بھی شروع کرسکتے ہیں۔ اور ان پر کام کرسکتے ہیں۔ ان سبھی پروگراموں کو ایک ساتھ چلانا ضروری نہیں ہے۔

ایم ایس- آفس کے کسی پروگرام کو بند کرنے کے لیے دیگر عام پروگراموں کی طرح یا تو بند (Close) بٹن 'X' کو کلک کیجیے یا دوسری طرح سے بند کردیجیے۔ آگے کے ابواب میں آپ ایم ایس-ورڈ کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

قومی اردو کونسل کی کتابیں

کلیات فراق (جلد اوّل و دوم)

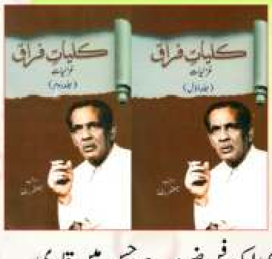

مرتب: جعفر رضا

صفحات: 556 (جلد اوّل)، 576 (جلد دوم)

قیمت: 520 روپے (سیٹ)، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فردوس بانو فلاحی، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

تبصرہ نگاری گرچہ کوئی صنف نہیں ہے تاہم پھر بھی ایک فن ضرور ہے جس میں قاری کتاب کے مطالعے کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار اپنے خاص اسلوب و نقطۂ نظر کے مطابق کرتا ہے۔ بسا اوقات اس اظہار کی نوعیت طویل و مختصر تعارف کی ہوتی ہے تاکہ شائقین کتب تک مزید ایک کتاب کی اطلاع پہنچ جائے اور قارئین ایک نئے مصنف وتصنیف سے واقف ہو جائیں۔ کہنہ مشق مصنفین کی کتابوں پر تبصرے کا مقصد معروف مصنف کی تصنیف کی حصولیابی ہے۔

تبصرے کی دوسری نوعیت مبصر کے مزاج کے مطابق کتاب کے تعارف کے ساتھ ساتھ کتاب کے موضوع و مواد پر تنقیدی نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔ یہاں پر 'تنقیدی نقطۂ نظر' سے مراد مبصر کے تنقیدی نقطۂ نظر اور صاحب کتاب کے تنقیدی نقطۂ نظر سے ہے۔ تاہم بہر صورت وہ اظہار رائے متن اساس ہوتا ہے۔ جہات جس قدر بھی ہوں۔

نثری تصنیفات کے موضوع و مواد قدرے واضح ہوتے ہیں اس لیے تبصرہ و تعارف نیز تنقید و تحقیق میں اظہارِ خیال کی آسانی ہوتی ہے۔ رہی بات شاعرانہ تخلیق و تصنیف کی تو اس میں شاعر اپنے خیالات و جذبات، مشاہدات و قلبی واردات کو استعارے و کنائے کی زبان میں ادا کرتا ہے۔ اس لیے مبصر یا تنقید نگار کے لیے دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے۔ لفظوں کے متداول معانی سے ہٹ کر شاعر کے مرادی معنی کا ادراک کار دشوار بلکہ ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔ شاعر کے نکتہ تخلیق تک نارسائی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ متن یا شعر کے اندر لفظی رعایت کے پوشیدہ کئی پہلو سامنے آتے ہیں جو لفظوں کے مروجہ و معروف معانی سے نسبت رکھتے ہیں۔ اگر تخلیق کار نابغۂ روزگار و عبقری ہے، منطق و فلسفہ کے رموز و نکات سے واقف ہے تو اس کی تخلیقات و کلیات پر تبصرے کا مقصد اظہار رائے و تنقید نہیں بلکہ تعارف و اطلاع فراہمی ہے۔

فراق گورکھپوری کے کلیات پر تبصرے کا منشا بھی مشتاقانِ فراق کو کلیات فراق کا مژدہ سنانا ہے تاکہ وہ اسے حاصل کر کے اپنے ذوق شعر و شاعری کی تسکین کر سکیں۔ مزید شاعری کے نکات و رموز سے اپنے فکر و فن کو صیقل کر سکیں۔

کلیاتِ فراق کی ترتیب و تدوین اور تہذیب و تنقیح کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ اس عرصہ جانکاہ میں قدم رکھنا ہر کسی کے بس کا کام نہیں تھا۔ اس کام کی تزئین و توقیر کے لیے اسی شخص کی ضرورت تھی جو اس راستے سے گزرا ہو، اس کے پیچ و خم سے باخبر ہو۔ فراق کی صحبت سے گزرا ہو۔ تخلیقات فراق اور فراق کے متعلق سوچنے والا قاری جب یہاں تک پہنچتا ہے تو اس کی نظر پروفیسر جعفر رضا پر ٹھہرتی ہے کیونکہ ماضی میں جعفر رضا نے مجموعہ 'گلبانگ' کی ترتیب و پیش کش میں جس جانفشانی و عرق ریزی کا ثبوت فراق گورکھپوری کے سامنے دیا تھا، کلیات فراق کی ترتیب و تدوین کے مستحق وہی ہوتے ہیں کیونکہ پروفیسر جعفر رضا کی دیانت داری و لگن کا اعتراف 'گلبانگ' کی ترتیب کے وقت خود فراق نے کیا تھا۔ بقول فراق گورکھپوری:

''میں اپنا یہ مجموعہ ہرگز مرتب نہ کر پاتا اگر ترتیب و انتخاب میں شروع سے آخیر تک قدم قدم پر ڈاکٹر جعفر رضا نے میرا ہاتھ نہ بٹایا ہوتا... یہ تمام فرائض نہایت ذمہ داری، دیدہ ریزی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انھوں نے انجام دیے جس کا میں دل سے ممنون ہوں۔ (فراق، کلیات فراق، مقدمہ، ص xx)

پروفیسر جعفر رضا نے فراق گورکھپوری کے 17 مجموعوں پر مشتمل کلام نیز غیر مطبوعہ کلام کو چار ادوار میں تقسیم کر کے دو حصوں میں کلیات کی ترتیب و تدوین کی اور قومی اردو کونسل نے فراق گورکھپوری کے کلام کو دو جلدوں میں کلیات کی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ دونوں جلدیں کافی ضخیم ہیں۔ پہلی جلد 556 صفحات کو محیط ہے جبکہ دوسری جلد 576 صفحات پر مشتمل ہے۔

فہرست سے قبل کونسل کے سابق ڈائرکٹر کا دو صفحے پر مشتمل پیش لفظ ہے۔ ان دو صفحات میں ڈائرکٹر نے کلیات کی ترتیب و تدوین کے مراحل نیز اس کے مقصد و غایت کو بیان کیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے محقق و ناقد پروفیسر جعفر رضا کی محنت شاقہ و ریاضتِ پیہم اور سعی مسلسل کا حوالہ دیتے ہوئے ان 57 غزلوں کا ذکر کیا ہے جو فراق کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہیں لیکن وہ اب کلیات کا حصہ ضرور ہیں جنھیں پروفیسر مشتاق نقوی نے پروفیسر جعفر رضا کے حوالے کی تھیں۔ کلیات فراق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں غزلوں کا اندراج تاریخی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر کے ساتھ ساتھ غزل نمبر بھی درج کیا گیا اور ہر غزل کے اختتام پر سنہ اشاعت و مجموعہ کلام کا نام و صفحہ نمبر درج کر دیا گیا ہے جس سے اصل ماخذ تک رسائی میں سہولت بہم پہنچا دی ہے۔ یہی اصول کلیات کے دونوں حصوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ اس طرح حصہ اول میں 295 غزلیں شامل ہیں جبکہ غزلوں کے اختتام پر تضمینات کا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں فراق کی مطبوعہ تضمینات نیز غیر مطبوعہ تضمینات کو شامل کلیات کیا گیا ہے جن کے عنوانات خود فراق کے طے کیے ہوئے ہیں مثلاً گلکاریاں، ہفت رنگ، صد رنگ۔ پروفیسر جعفر رضا کا مقدمہ کافی طویل ہے تاہم پھر بھی فراق جیسے شاعر کی زندگی بھر کی سعی و کاوش کے اعتبار سے 46 صفحات کے مقدمے کی حیثیت ایک پاسنگ کی ہے۔ گویا پروفیسر جعفر رضا نے کوزے میں سمندر سمونے کی کوشش کی ہے تاکہ اس اجمال سے تفصیل تک رسائی حاصل کی جا سکے۔

آخر میں اشاریہ غزلیات کے عنوان سے بالتاریخ غزلوں کا اشاریہ دیا ہے جو 26 صفحے کو محیط ہے۔ بعض غزلیں کئی کئی مجموعوں میں درج ہیں۔ ان کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے تاکہ قارئین حضرات کو پریشانیوں سے بچایا جائے۔

کلیات فراق حصہ دوم کا پیش لفظ حصہ اول ہی کا ہے لیکن غزلوں کے اندراج کے مطابق مقدمے کی نوعیت بھی مختلف ہے اور مقدمہ نہایت وقیع ہے۔ یہ مقدمہ 21 صفحات پر مشتمل ہے لیکن فراق کی شاعری کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر پر گفتگو بڑی واضح ہے نیز

شاعری کے محرکات پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں صفحہ 31 سے ضمیمہ کے تحت عنوان ''چند باقی ماندہ غزلیات وتضمینات درج ہے، اس ضمن میں دس تخلیقات درج ہیں۔

فراق گورکھپوری کا کلیات دراصل پروفیسر جعفر رضا کی برسوں عرق ریزی کا ثمرہ ہے جسے قومی اردو کونسل نے شائع کر کے اردو کے شائقین کے لیے ایک بہت بڑا کام سرانجام دیا ہے جس سے فراق پر تحقیق وتدقیق کرنے والے طلبا واساتذہ کو قدرے سہولت ہوگی۔

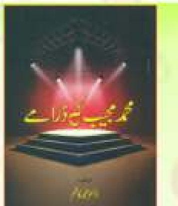

محمد مجیب کے ڈرامے

مرتب: ڈاکٹر محمد کاظم

صفحات: 394، قیمت: 197 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: عابد انور، ڈی 64، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

ہر انسان فطرتاً ڈرامہ نگار ہوتا ہے اور بچپن سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک کسی نہ کسی شکل میں زندگی اور سماج کے سامنے اپنے ہنر کو پیش کرتا ہے اور لوگ اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ گاؤں دیہات کے بچے بطور کھیل کئی طرح کی اداکاری کرتے ہیں اور ڈائیلاگ بولتے ہیں۔ اس کے بعد اسکول کالج اور مختلف مرحلے میں وہ اسے پیش کرتے ہیں۔ دراصل بچوں کا یہ کھیل جسمانی، دماغی اور صحت کی نشو ونما میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ مجھے کئی طرح کی برائیوں سے بھی بچ جاتے ہیں۔ بچپن میں بچے چور سپاہی کا کھیل کھیلتے ہیں، نقالی کرتے ہیں، ایک دوسرے کے کام، آواز اور لہجے کی نقل کرتے ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب کی شناخت ایک مورخ، معلم اور دانشور کی حیثیت سے ہے۔ تاریخ ان کا خاص موضوع ہے مگر اردو ادبیات کے باب میں بھی ان کی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انہوں نے ادب وثقافت پر مضامین کے علاوہ افسانے اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ تراجم اور اصطلاحات سازی میں بھی ان کا اہم رول رہا ہے۔ انگریزی، روسی، فرانسیسی اور جرمن جیسی زبانوں سے واقف پروفیسر محمد مجیب نے نہ صرف ان زبانوں کے ڈراموں کا مطالعہ کیا ان سے متاثر بھی ہوئے۔ اردو میں ڈرامہ پر تنقید لکھی اور طبع زاد ڈرامے بھی تحریر کیے جن میں حبہ خاتون اور خانہ جنگی کو خاصی شہرت ملی۔ پروفیسر محمد مجیب کی وابستگی جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے سے تھی۔ وہ 25 سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 'پدم بھوشن' سے سرفراز کیا تھا۔

زیر تبصرہ کتاب 'محمد مجیب کے ڈرامے' میں سات ڈرامے 'کھیتی، انجام، خانہ جنگی، حبہ خاتون، ہیروئن کی تلاش، دوسری شام اور آزمائش شامل ہیں۔ مقدمے کے بعد اس کتاب کا آغاز 'آؤ ڈراما کریں' سے ہوتا ہے جس میں پروفیسر مجیب نے ڈراما کے بارے میں سمجھایا ہے کہ ڈراما کیا ہے، کردار کیسے ہوتے ہیں، اسٹیج کیا ہے، کردار کی ادائیگی کیسے ہوتی ہے۔ اس کو مکالمے کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد کاظم ہیں جو شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ ڈراما اور تھیٹر ان کی تحقیق وتنقید کا نہ صرف موضوع ہے بلکہ اس سے ان کی عملی وابستگی بھی ہے وہ کئی ڈرامے میں نہ صرف حصہ بطور ڈائرکٹر حصہ لیا ہے بلکہ اداکاری بھی کی ہے ڈراما ان کا اوڑھنا اور بچھونا رہا ہے۔ انہوں نے اردو ڈرامے اور اسٹیج کو خاص طور سے اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ ایم فل، پی ایچ ڈی میں بھی ڈرامے ہی پر کام کیا ہے۔ ڈرامے پر ان کی تحریر اور مقالات کتابی شکل میں آچکی ہیں۔ ان میں 'آج کل کے ڈرامے'، 'ہندوستان نکڑ ناٹک اور اس کی سماجی معنویت' اور 'بنگال میں اردو نکڑ ناٹک' شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ 1931 میں لکھا گیا ڈراما 'کھیتی' گیارہ اوم کرداروں کے ذریعہ پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما چار ایکٹ اور گیارہ سین پر مشتمل ہے۔ اکتوبر 1956 میں پروفیسر مجیب کا شائع ہونے والا ڈراما 'دوسری شام' کے پشت پر شائع اشتہار یوں ہے۔ اس ڈرامے میں نام نہاد قومی رہنماؤں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کی نظر میں ہندوستانی سماج اور اس کے بدلتے سیاسی حالات پر گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ اس ڈرامے میں اس دور کے ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے مذہبی رونماؤں کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مفاد پرست لوگوں کی شناخت کرنے میں مددمل سکتی ہے۔

اسی طرح خانہ جنگی میں مغلیہ خاندان کی زوال پذیر داستان کو بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈراما خانہ جنگی میں شاہ جہاں اورنگزیب اور بھائیوں کے درمیان کشمکش کو بہت ہی مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت دارا اور شاہجہاں کے درمیان مکالمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھائیوں کے درمیان کس طرح تعلقات تھے۔ شاہ جہاں دارا سے کہتے ہیں، میں ہرگز نہیں چاہتا۔ میں نے تم کو اپنے پاس تخت پر بٹھایا ہے۔ اپنا وارث بنایا ہے۔ مگر تم میری کوئی بات نہیں مانتے۔ اورنگ زیب نے مصلحت سے مشہور کیا ہے کہ میں گرفتار کرلیا گیا ہوں، تم نے حقیقت میں مجھے بے بس اور مجبور کردیا ہے۔ میں انصاف کرنا چاہتا ہوں، تم لڑنے پر تلے ہوئے ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ اورنگزیب کے امرا کو معلوم ہوا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تو وہ سب قدم بوسی کے لیے حاضر ہوجائیں گے۔ ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے ورغلانے سے میرے خلاف ہوجائے۔ دارا شاہ جہاں سے کہتے ہیں خداوند عالم! اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنا حق حاصل کرسکوں، مجھے وہی ملے گا جو آپ اس نمازی کی خوشامد کر کے مجھے دلوائیں۔ اسی وجہ سے تو میں اصرار کر رہا ہوں کہ مجھے اورنگ زیب سے طاقت آزمائی کرنے دیجیے، اگر میں جیت گیا تو مجھے اور آپ کو بھی یقین ہوجائے گا کہ میں سلطنت کا حق دار ہوں۔ اگر میں ہار گیا تو آپ دیکھ لیں گے کہ وہ سانپ جس کی پرورش آپ نے کی ہے مجھے اور آپ کو کس طرح ڈستا ہے۔ تب آپ افسوس کریں گے کہ آپ نے ایک زہریلے کیڑے کو جس کا سر کچل دینا چاہیے تھا، نام اور مروت کا سزاوار سمجھا۔ شاہ جہاں (سر پکڑ لیتا ہے) بھائی کو بھائی سے ایسی نفرت!...

ڈاکٹر محمد کاظم نے پروفیسر مجیب کے ڈرامے کو ترتیب دے کر نہ صرف اردو ڈرامے کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اردو کے ڈراما نگار کو ڈراما لکھنے کی ترغیب وتحریک اور حوصلہ دے گی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کتاب کو شائع کر کے ڈراما کے فن کو آگے بڑھایا ہے۔ سماجی اور معاشرتی واقعات اور سانحات سے بھرپور کتاب 'محمد مجیب کے ڈرامے' کی طباعت عمدہ ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ھیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ھیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق تنقید

اوراق زریں

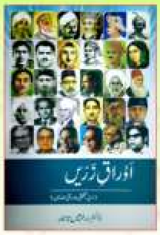

مصنف: ڈاکٹر درخشاں تاجور
صفحات: 336، قیمت: 193، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: مرزا محمد خضر
بلاک نمبر 11، ماڈل کالونی، متصل: حمایت نگر، اورنگ آباد، بہار

'اوراق زریں' محترمہ ڈاکٹر درخشاں تاجور صاحبہ کی نویں کتاب ہے جو اسم با مسمیٰ ہے۔ یہ کتاب کیا ہے، تاریخ اور اردو ادب کے مہر و ماہ اپنے آنچل میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا ہر باب فکر انگیز بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ تاریخ اور ادب کا رشتہ تاریخ و ادب کے دور آغاز سے بہت دل آویز ہے جسے ہم ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ ہر زبان کے ادب میں تاریخ کا پرتو جلوہ فگن ہوتا ہے جس میں سماجی، سیاسی اور نفسیاتی زندگی کے خد و خال نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی بات ڈاکٹر درخشاں تاجور کے ہر باب میں نظر آتی ہے۔ شاید اسی لیے ٹی ایس ایلیٹ نے کہا'' آج کا وقت اور گزرا ہوا کل دونوں مستقبل کے وقت میں شامل ہوتے ہیں اور مستقبل کا وقت بھی شاید ماضی کے وقت میں موجود رہتا ہے۔ ماضی کے وقت کی بازیافت کو مستقبل سے مربوط کرنے کی کوشش ہی دراصل تاریخ کا ادراک کہلاتی ہے۔ اگر اندازِ تحریر میں جمالیات ہو تو وہ ادب کا دلکش شہ پارہ بن جاتی ہے۔ یہی دلکشی درخشاں صاحبہ کے اکثر ابواب میں جھلکتی ہے۔ جیسے علامہ شبلی نعمانی کے سیاسی افکار میں مولانا آزاد نے شبلی نعمانی کی وفات پر اپنے درد و غم کے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا حالی کے درج ذیل شعر کا حوالہ دیا تھا۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں

''علامہ شبلی یقیناً اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اپنے ہم عصروں میں جو خوبی انھیں ممتاز بناتی ہے وہ ان کی عصری حسیت، قومی و ملی دردمندی اور ان کی حب الوطنی تھی۔ انھیں اگر ملت اسلامیہ سے محبت تھی تو اپنے وطن سے بھی بے پناہ عقیدت تھی۔''

علامہ اقبال کی کئی نظموں اور افکار پر ابھی تک بہت کچھ ہر پہلو اور ہر انداز سے خیال آرائی ہوئی ہے۔ اقبال کی وطن پرستی پر ان کی نظمیں 'ہمالیہ'، 'نیا شوالہ'، شعاع امید' بچوں کا قومی گیت 'ترانہ ہندی' وغیرہ مانند گوہر تاب ہیں۔ محترمہ درخشاں تاجور کی ان کی قومی بیداری کے تعلق سے قلم کی گوہر افشانی دیکھیے:

''ملک میں قومی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اردو شعرا نے جو خدمات انجام دیں وہ قابل فخر اور لائق تحسین ہیں۔ اقبال کا شمار بھی ایسے وطن پرست اور قوم پرور شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری عوام کے خوابیدہ سیاسی شعور کو پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے غلامی کے ذلت آمیز بندھنوں میں جکڑے ہوئے عوام کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا انھیں ملک و قوم کی عظمت کا احساس دلا کر اس کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کا حوصلہ دیا۔''

اسی انداز سے اپنے افکار کو صفحۂ قرطاس پر مضمون ریشمی رومال تحریک، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، پنڈت رام پرساد بسمل، تلوک چند محروم اور پریم چند کی تخلیقات میں جدوجہد آزادی کو سمجھایا ہے۔

اوراق زریں کا پہلا باب حیدر علی اور دوسرا باب ان کے فرزند ٹیپو سلطان پر ہے۔ اپنی فکر درخشانی سے دونوں وطن کی آزادی اور عظمت پر بے پناہ کاوشوں اور مہمات کو سرفروشانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انگریز ہندوستان پر مکر و فریب سے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔

محترمہ ڈاکٹر درخشاں نے جس انداز میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس سے ان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

کسی قوم کی شعوری بیداری حال و مستقبل سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ ان میں قومی تاریخ سے گہری واقفیت و احساس کا ہونا کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا ایک روشن باب ہے جس میں علماء کرام اور حکمرانوں کی قربانی و ایثار بھی بے مثال ہے۔ ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے خلاف کاوشوں و مہمات کو نہایت دل چھو لینے والے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ٹیپو سلطان کی سیاسی بصیرت، ان کے مرہٹوں اور نظام سے معاہدے، فرانسیسیوں اور ترکی کے خلیفہ سے عسکری مدد۔ یہ تمام باتیں ٹیپو سلطان کو عظیم سیاسی مدبر ثابت کرتی ہیں۔ 'اوراق زریں' میں کل 39 فکر انگیز و ایمان افروز مضامین ہیں۔ اس کتاب کا اکیسواں مضمون اشفاق اللہ خاں پر ہے جو دل کو چھو لیتا ہے۔

مصنفہ نے اشفاق اللہ خاں کی آرزو کا اظہار انھیں کے الفاظ میں اس طرح کیا ہے:

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

جب اشفاق اللہ خاں کو فیض آباد جیل میں 19 دسمبر 1927 کو پھانسی کے لیے لے جایا جانے لگا تو انھوں نے کسی قسم کے غم و اندوہ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پھانسی کے پھندے کو بوسہ دے کر اسے اپنے گلے میں خوشی خوشی ڈال لیا جیسے وہ پھانسی کا پھندہ نہ ہو بلکہ پھولوں کا ہار ہو۔ اس کے بعد انھوں نے یہ شعر پڑھا:

تنگ آکے ہم بھی ان کے ظلم سے بیداد سے
چل دیے سوئے عدم زندانِ فیض آباد سے

اس طرح کے مضامین سے درخشاں تاجور نے حب الوطنی کے تاریخ و ادب سے مربوط کر کے دلکش بنا دیا ہے۔ 'اوراق زریں' کے تمام مضامین خواہ وہ سرسید پر ہوں یا خواتین کا جنگ آزادی میں کردار یا مولوی سرفراز علی یا خان بہادر خان یا مختلف کتابوں پر تبصرے ہر باب اپنے اندر جدت و ندرت لیے ہوئے ہے۔

اردو خود نوشت نگاری پر ایک نظر

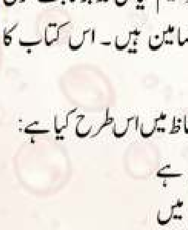

مصنفہ: نازمین
صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: نور پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: زبیر احمد بھاگلپوری، اردو سکشن، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ

اردو زبان میں 'خود نوشت' کا سلسلہ یوں تو صدیوں پرانا ہے لیکن اس کا حقیقی شباب 1950 کے بعد ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حالیہ دنوں اردو کی ایک نوخیز قلم کار نازمین کی اس موضوع پر ایک اہم کتاب بعنوان 'اردو خود نوشت نگاری پر ایک نظر' منظر عام پر آئی ہے، جو کئی جہات سے وقیع اور قابل قدر ہے۔ اس کے خام مواد کی دستیابی کے لیے مصنفہ نے کس حد تک تلاش و جستجو کی ہے، اس کا اندازہ ماخذات اور مصادر کی طویل فہرست سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ مقدمہ کے علاوہ کتاب کی موزوں ابواب بندی سے ہی ان کی تصنیفی خوش اسلوبی اور سلیقہ مندی کا پتہ چلتا ہے۔

باب اوّل میں انھوں نے 'خودنوشت' کی تعریف اور ادبی و معاشرتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کے تاریخی پس منظر پر بھی مختصراً مگر انتہائی سادے اور سلیس زبان میں بحث کی ہے۔ 'آپ بیتی' یا خودنوشت کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے دیگر دانشوروں کے کئی اقتباسات بطور حوالہ پیش کیے ہیں، لیکن اس سلسلے کی خود ان کی توضیحات بھی مربوط، سہل الفہم اور پر مغز ہیں۔ اس باب میں خودنوشت کے تین اہم ترین عناصر ترکیبی 'سچائی'، 'شخصیت' اور 'فن' کو بجا طور پر لازمی قرار دیتے ہوئے اور ایک کامیاب خود نوشت کے پیمانے کے طور پر برتتے ہوئے انہوں نے مشمولہ خودنوشتوں اور مختلف سوانحی ہیئتوں کی معیار بندی کی مخلصانہ کوشش ہے۔ دوسرے باب میں خودنوشت نگاری کی روایت کے مختصر تذکروں کے ساتھ ساتھ بلا ترتیب زمانی جن خودنوشتوں کی ادبی، سماجی اور ثقافتی اہمیت بیان کی گئی اور فنی اعتبار سے قدر شناسی کی گئی ہے، ان میں شاد عظیم آبادی کی 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' (1958)، عبدالغفار بدھولی کی 'ایک طالب علم کی کہانی' (1965)، بیگم انیس قدوائی کی 'آزادی کے چھاؤں میں' (1974)، ڈاکٹر آزاد حسین کی 'میری دنیا' (1965)، ڈاکٹر یوسف حسین خان کی 'یادوں کی دنیا' (1967)، عتیق صدیقی کی 'یادوں کے سائے' (1974)، جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی بارات' (1974)، جعفر تھانسیری کی 'کالا پانی' (1886)، اور آل احمد سرور کی 'خواب باقی ہیں' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

مصنفہ نے ان تمام خودنوشتوں کے موضوعاتی امتیازات (Thematic features) کا احاطہ عام فہم زبان میں موثر طریقہ سے کیا ہے۔ ان کے تجزیے اور تلازمے کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف ان خودنوشتوں کے محاسن کا دیانتدارانہ ذکر کیا ہے بلکہ ان کے معائب پر بھی بڑی بے باکی سے غیر جانبدارانہ بحث کی ہے۔ ان کے بے لاگ تجزیے کے سبب خودنوشت مطبوعات کی فہرست میں ان کی کتاب غیر معمولی امتیاز حاصل کرگئی ہے۔ انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ جعفر تھانسیری کی 'کالا پانی' کو خودنوشت کی بجائے جیل ڈائری کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسی طرح بیگم انیس قدوائی کی 'آزادی کی چھاؤں میں' کو ایک رپورتاژ قرار دیا ہے۔

باب سوم کے تحت اردو کی دیگر اصناف مثلاً مکاتیب، سفرنامے، روزنامچے اور سوانحی ناول میں جو انھوں نے سوانحی عناصر کی نشاندہی کی ہے، وہ موضوع کے حوالے سے ان کی ژرف نگاہی اور دیدہ ریزی کی واضح علامت ہے۔ چوتھے باب میں عصمت چغتائی کی خود نوشت 'کاغذی ہے پیرہن' کے تنقیدی جائزے کے لیے ایک علاحدہ باب قائم کرکے اسے خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ ایک نامکمل خودنوشت کی مختلف ادبی وسماجی جہات کی قدر شناسی کے لیے اسے اہمیت دینے کے پیچھے کا محرک عصمت کا ماضی قریب کے ادبی افق پر جاہ و جلال یا نسائی ادب میں خواتین کا نمائندہ ہونا ہوسکتا ہے۔ واضح ہو کہ وارث علوی نے بھی اس خودنوشت کو نامکمل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک مکمل آپ بیتی میں عموماً پیدائش سے لے کر دم تحریر تک کے واقعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ کتاب کا زمانی وقفہ عصمت کے گریجویٹ ہونے اور اسکول میں ملازمت اور 'لحاف' پر مقدمہ کے زمانے تک یعنی صرف چند برسوں پر مشتمل ہے''۔ اس خودنوشت پر خاص فوکس کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نامکمل ہونے کے باوجود اس میں نہ صرف عصمت کی زندگی کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ اس دور کی معاشرتی، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی امیجری کے زاویہ نظر سے بھی یہ خاصی اہمیت کی حامل ہے۔

اظہار حقیقت حوصلے کا متقاضی ہوتا ہے۔ خصوصاً انتقادی اخلاص کے لیے تو اس کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے۔ نازمین کی تنقیدی روش کے حوالے سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ متذکرہ کتاب میں شامل مواد کے تجزیے اور تنقید کے دوران انہوں نے سفید و سیاہ کے بے باکانہ اظہار میں بے انتہا جرآت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ سادہ اور سہل زبان میں مافی الضمیر کی ادائیگی کا میکانزم ان کے بیانیہ میں غضب کی ترسیلی قوت (Communicability) پیدا کرتا ہے۔

خودنوشت، سوانح، روزنامچہ اور یاد داشت جیسی خواہری اصناف (Sister genre) کے درمیان کے باریک خطِ امتیاز کی صراحت انہوں نے انتہائی موثر انداز میں کی ہے۔ بطور مثال 'خودنوشت' اور 'سوانح عمری' کی داخلی تفریق کے حوالے سے نازمین کا درج ذیل اقتباس:

''سوانح عمری میں کسی دوسری شخصیت کا محاسبہ ہوتا ہے جبکہ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے اور خود ہی کو تختۂ مشق بناتا ہے۔ سوانح نگار سوانح عمری کو اپنے زاویئہ نگاہ سے لکھتا ہے۔ دو مختلف سوانح نگار ایک شخص کی سوانح عمری مختلف رنگوں کی آمیزش سے کینوس پر اتارتے ہیں۔ خودنوشت نگار کی زندگی کی داستان ایک ایسی تحریر ہے جسے خود مصنف سے پہلے کسی نے نہیں پڑھا۔ اس کے حالات و واقعات سے کوئی دوسرا واقف نہیں۔ سوانح عمری میں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ ایک صاحب سوانح کو دو مختلف سوانح نگار اپنا موضوع بنا سکتے ہیں جبکہ خودنوشت میں اس بات کی گنجائش نہیں ہوتی۔''

مصنفہ نے 50 کی دہائی اور اس کے بعد کی تقریباً تمام اہم اردو خودنوشتوں کو محتویات میں شامل کرنے میں ضرور کامیابی حاصل کی ہے لیکن یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ اردو کی اس صنف ادب کے معیار کی تفہیم کے لیے دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی اعلیٰ اور معتبر خودنوشت سے فنی و تکنیکی سطح پر تقابلی تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوتیں تو یقیناً کتاب ضخیم تر ہونے کے ساتھ ساتھ وقیع تر بھی ہوتی۔ تاہم اپنی پہلی ہی تصنیف کے ذریعہ انہوں نے جس تخلیقی عزائم (Creative determinations) کا اظہار کیا ہے، اسے اردو نسائی ادب کے لیے خوشگوار نوید کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور آج جب کہ نسائی تخلیقیت کے حوالے سے اردو زبان 'قحط النساء' کے نازک دور سے گزر رہی ہے، نازمین کی یہ قابل قدر کاوش امید کی ایک کرن لے کر آئی ہے۔

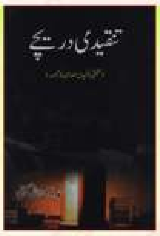

تنقیدی دریچے

مصنف/ ناشر: محمد وصی اللہ حسینی

صفحات: 216، قیمت: 133 روپے، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

محکمہ اعلا تعلیم حکومت جموں و کشمیر

'تنقیدی دریچے' کوئی یک موضوعی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ محمد وصی اللہ کے تنقیدی (کچھ کچھ تحقیقی اور تاثراتی بھی) مضامین کا ایک حسین گلدستہ ہے، جو انھوں نے پچھلے چند برسوں میں سپرد قلم کیے ہیں۔ جس طرح غزل کا ہر شعر جداگانہ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی ان اشعار کی اپنی اندرونی ایک Link ضرور ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح اس کتاب میں شامل یہ بھی مضامین ضرور الگ الگ ادبی موضوعات پر لکھے گئے ہیں، مگر فاضل مصنف کا طرزِ بیان، ان کی ادائیگی اور ان کا طریقۂ تنقید انہیں آپس میں کسی نہ کسی طریقے سے جوڑتا ہے۔ زیادہ تر مضامین میں ادبی شخصیات کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کیا گیا ہے اور ان میں مشترکہ بات یہ ہے کہ اکثر شعرا و ادباء کا تعلق ایک ہی دور سے رہا۔ یعنی بیسویں

صدی کے اول تا آخر۔اس لیے یہاں کہیں کہیں جنگ آزادی، ترقی پسندی، بٹوارہ، قومی یکجہتی اور کچھ جدیدیت وغیرہ کے اُردو ادبی مسائل ور جحانات کو چھیڑا گیا ہے۔..... مگر موصوف مصنف کبھی بھی کہیں بھی کسی مخصوص نظریے کے شکار نہیں لگتے ہیں، بلکہ وہ فن تنقید کے لوازمات کو مدِ نظر رکھ کر ادیب کی آئیڈیالوجی اور اس کے ادب کا تجزیہ کرتے ہیں۔

خیر اس کتاب کے متن پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں، تو مختصراً 'عرض حال' کے بعد ہماری نظر پہلے 'وحیدالدین سلیم کی علمی و ادبی خدمات' عنوان کے مضمون پر پڑجاتی ہے۔ جہاں موصوف 'وضع اصطلاحات' کے علاوہ بھی ان کے دیگر کارناموں کو اُجاگر کرتے ہیں۔اسی طرح 'علامہ سید سلیمان ندوی کے شعری کمالات' میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کا مجموعی خاکہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ان کے بعد قاضی عدیل عباسی، مولوی جعفر علی نقوی، علی برادران کی شخصیات سازی میں بھی اماں کا کردار جیسے مضامین میں شخصیات (مجاہدیں آزادی) کی سوانح کے ساتھ اس دور اور جنگ آزادی کے گوشہ گمنامی میں پڑے مختلف واقعات کو یاد کیا جاتا ہے۔

ترقی پسند شعرا میں کیفی اعظمی .... جان نثار اختر ..... شکیل بدایونی پر مضامین لکھ کر ان کی شاعری (بشمول ان کی فلمی شاعری) کا مجموعی طور پر محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔اس کتاب میں ایسے ادبا و شعرا پر بھی مضامین لکھے گئے ہیں جنھیں ہمارے ادبی مورخیں یا الگ الگ اصناف پر کام کرنے والے ناقدیں اور محققین بھول ہی جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ چلتے چلتے ان کا صرف وہ لوگ نام لیتے ہیں، ان میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ....ولی انصاری.... خمار بارہ بنکوی... والی آسی، ڈاکٹر اختر بستوی، شاطر حکیمی خاص نام شامل ہیں۔

کسی چھوٹے بڑے ادیب پر لکھنے کے دوران محمد وصی اللہ تنقید کے ساتھ ساتھ پوری طرح سے ادبیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ایک مختصر سے مضمون کو تیار کرنے کے دوران اس موضوع پر (یا اس شخص پر یا اس شخص کی بہت ساری کتابیں) ڈھیر ساری کتابیں مدِ نظر رکھتے ہیں۔ پھر ان سے اہم معلومات یا حوالہ جات اخذ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انٹرنیٹ سے بھی کچھ جانکاری حاصل کرلیتے ہیں۔اس طرح ان کا ایک ایک مضمون ہمیں متعلقہ شخص یا موضوع پر اور غور وفکر کرنے یا لکھنے کے لیے دعوت دیتا ہے۔ ہر مضمون معلومات کا خزانہ ہوتا ہے۔

ملک زادہ منظور احمد پر اس کتاب میں دو مضامین شامل ہیں۔ایک مضمون 'ادبی اڈے کے حوالے سے ہے۔ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور جنیوا رائے پر دو مضامین ہیں۔ اسی طرح دو اور اہم مضامین جنگ آزادی میں بستی کے مسلمانوں کا حصہ اور دانش محل: کتابوں کا تاج محل عنوان سے ہے۔ اُردو زبان و ادب میں خواتین کا حصہ ایک وسیع موضوع کا پورا Main Index ظاہر کرتا ہے۔کتاب میں شامل آخری مضمون ''صنعت غیر منقولہ'' کے عنوان سے ہے۔

المختصر ''تنقیدی دریچے نام کی یہ کتاب، عام قارئیں کے ساتھ ساتھ ہمارے طلبہ اور ریسرچ اسکالرس کے لیے بہت معنوں میں بڑی سودمند ثابت ہوسکتی ہے، کیونکہ I۔اس کی زبان و بیان درست ہے۔ II۔طریقۂ تحقیق وتنقید کے لیے یہ ایک نمونہ ہے۔ III۔ یہاں ادبی تنقید میں طومار بازی کم بلکہ معلومات زیادہ ہے۔ IV۔موضوع کے لیے مواد کی صحیح ترتیب دے دی گئی۔ V۔اس کتاب کی قیمت آج کے دَور کے مطابق، بہت کم ہے جس کا سہرا قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کو جاتا ہے۔ کیونکہ مصنف کو اس ادارے نے یہ کتاب شائع کرنے کے لیے مالی تعاون بھی فراہم کیا تھا۔

آئینہ ادراک

مصنف: حسن مثنیٰ

صفحات: 264

ناشر: انعام پبلی کیشنز، رانچی، جھارکھنڈ

مبصر: اسعداللہ، 1444/45، فیاض گنج، آزاد مارکیٹ، دہلی 6

زیر تبصرہ کتاب 'آئینہ ادراک' حسن مثنیٰ کے مختلف مضامین کا گلدستہ ہے، جوکہ مختلف اخبارات ورسائل اور سمینار کی زینت بن چکے ہیں۔اب ان مضامین کو افادۂ عام کے لیے یکجا کر دیا گیا ہے۔اس مجموعہ میں کل اکیس مضامین شامل ہیں سب سے پہلا مضمون احتشام حسین کی تنقید پر ہے۔جس میں قابل مصنف نے ترقی پسند تنقید کے حوالے سے مکمل جائزہ پیش کیا ہے لکھتے ہیں''جس طرح اردو تنقید کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں مولانا الطاف حسین حالی کا خیال کوند جاتا ہے ٹھیک اسی طرح ترقی پسند مصنّفین کا ذکر آتے ہی پروفیسر احتشام حسین ہمارے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔یعنی پروفیسر احتشام حسین کا ذکر کیے بغیر ترقی پسند تنقید کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہے۔'' آگے کے صفحات میں ان کی اکثر کتابوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں''جب تک ادب تخلیق کیا جاتا رہے گا سماج کا وجود باقی رہے گا کیوں کہ ادب سماج کا آئینہ تو ہے ہی، یہ سماج ہی ادب کی آماجگاہ بھی ہے''۔آل احمد سرور کی تنقید نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے انہیں تخلیقی تنقید کا معمار قرار دیا ہے اور آل احمد سرور پر جو بھی اعتراضات مخالفین کے ذریعہ پیش کیے گئے ہیں ان کا مدلل جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں''سرور صاحب کی تنقید تخلیقی وتعمیری ہے نہ کی تخریبی، تخریبی کارروائی میں بڑا شور وشر ہوتا ہے جب کہ تخلیقی وتعمیری کام خموشی سے، سکون سے کیے جاتے ہیں کیونکہ یہاں ایسی محنت وریاضت درکار رہوتی ہے جس سے بڑے بڑوں کی آزمائش ہوئی جاتی ہے''۔محمد حسن کو ترقی پسندی کا سرمایہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں''محمد حسن کسی تنگ نظر یا متعصب ناقد کی طرح کسی بھی ادبی تخلیق کو کسی خاص نظریا عینک کے سہارے نہیں دیکھتے یا کسی خاص فلسفۂ حیات کے پیمانے میں اسے جانچتے پرکھتے ہیں بلکہ ان کی نظر میں تحریر کے کیف وانبساط کا اصل منبع وماخذ متن ہی میں پوشیدہ ہوتا ہے''۔میر انیس کے سفر عظیم آباد پر قابل مصنف نے انتہائی مدلل انداز میں محفل مراثی کا جائزہ پیش کیا ہے جب کہ دبستان عظیم آباد کے حوالے سے شاد کو معمار اول قرار دیا ہے اور جن نکات کی طرف اس مضمون میں اشارہ کیا گیا ہے اس سے ان لوگوں کو جو صرف دبستان دہلی اور لکھنؤ کو ہی مرکزیت دیتے ہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

چکبست کی شاعری کو قومی یکجہتی کے آئینہ میں لا کر مصنف نے وحدت میں کثرت کا جلوہ قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔مزید برآں مکتوبات جوہر کی تاریخیت کو تاریخی حوالوں اور دلائل کے ساتھ مفصل انداز میں پیش کرتے ہوئے مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں''حق تو یہ ہے کہ انہوں نے تا زندگی مجاہدانہ عمل جاری رکھا اور تاریخ میں نام کر گئے سرفروشی کے اس جذبہ کو سلام کرنا ہمارا فریضہ اولین ہے''۔مولانا آزاد کا پیغام امن وآشتی اس ضمن میں مصنف نے ان کی کتابوں اور ان پر لکھے گئے مضامین سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ''انہوں نے مذہب اسلام، ہندوستانی متحدہ قومیت اور تحریک آزادی سبھی کو اپنی زندگی میں انگیز کر لیا تھا''۔اس کے علاوہ بیدی کو افسانوی ادب کا اہم ستون گردانتے ہوئے راجندر سنگھ بیدی کی تخلیقات میں نئی جہتوں کو کامیابی سے تلاش کر کے متعارف کروایا گیا ہے۔خواجہ احمد عباس کو ان کے مشہور زمانہ کالم'' آزاد قلم'' کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔جب کہ رضا نقوی واہی کے منظوم خطوط پر جو انھوں نے بڑی

شخصیات کے نام قلمبند کیے ہیں اس پر بھی کارآمد باتیں پیش کی گئی ہیں۔مثنوی نگاری کے فن کا احاطہ کرتے ہوئے 'عاشق وصنم' کا ناقدانہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ 'صالحہ عابد حسین اور خاکہ نگاری' ان کے خاکہ 'جانے والوں کی یاد آتی ہے' کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔اور ممتاز شیریں کے تنقیدی موقف کی وضاحت بہت ہی اچھے پیرایہ میں کی گئی ہے۔جبکہ اصول تحقیق وترتیب متن''، پر تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں''دراصل حقائق کی بازیافت ہی تحقیق کا اہم مقصد ہے''۔آگے لکھتے ہیں''انگریزی یا دیگر ادبیات عالم کی بات کی جائے تو ان زبانوں میں اس خاص موضوع پر عمدہ کتابیں دستیاب ہیں لیکن اردو میں اس پائے کی کتابیں تقریباً ناپید ہیں اور اگر کہیں کہیں کچھ ہے بھی تو اسے کئی کتابوں کا چربہ یا اخذ شدہ مواد ہی کہنا چاہیے۔'' شمیم کرہانی کے شعری منشور کا جائزہ 'تلاش سحر' کے حوالے سے لیتے ہوئے ان کے اشعار کو پیش کرتے ہوئے اپنی بات کو مدلل کیا گیا ہے یہ شعر ملاحظہ ہو

نہ شمیم غنچۂ دل کھلا، نہ ملی حیات کو روشنی
یہ سحر تو ہے کسی اور کی، یہ سحر ہماری سحر نہیں

اس کے علاوہ اس کتاب کے اندر جو دیگر مضامین شامل ہیں ان میں 'آرزو جستجو کا مغنی: جاں نثار اختر'، 'کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے: کلیم عاجز'، 'صدیق مجیبی کی شاعری میں استعارات کربلا'، 'کیف کی شاعری میں سرور کی مترنم جہتیں'، 'بہت ہی اچھے مضامین ہیں۔کل ملا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین و مقالات تحقیقی نوعیت کے ہیں اور مصنف نے اپنی بات کو بغیر کسی دلیل کے نقل نہیں کیا ہے اور تمام موضوعات کے ساتھ انصاف برتا ہے۔اور پینی نگاہ سے ان کو نقد کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی مقبولیت روز افزوں ہوگی اور یہی مصنف کے لیے سب سے بڑا تمغۂ امتیاز ہوگا۔کتاب کی طباعت اور سرورق دیدہ زیب ہے۔پروف ریڈنگ کی غلطیوں سے بہت حد تک مبرا ہے۔

فراق گورکھپوری: شخصیت، شاعر اور شناخت

مرتب: عزیز نبیل

صفحات: 775، قیمت 400 روپے

مبصر: محمد عمران

گیسٹ فیکلٹی، ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو، نئی دہلی 67

زیر تبصرہ کتاب فراق گورکھپوری پر تحریر کیے گئے مضامین ومقالات کا مجموعہ ہے جسے عزیز نبیل نے مجلس فخر بحرین برائے فروغ اردو کے سالانہ مشاعرے میں بیاد فراق کی مناسبت سے ترتیب دی ہے۔اس میں 5 عنوان کے تحت 54 تنقیدی مضامین کے علاوہ فراق گورکھپوری کے انٹرویو، اہم تاریخی خطوط نثری اور شعری تحریروں کے انتخابات شامل ہیں۔مشمولہ مضامین ومقالات مختلف النوع موضوعات کے حامل ہیں جسے اردو کے اہم ناقدین اور دانشوروں کے ذریعے ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔چند مضامین ان کے ہم عصروں اور احباب کے ذریعے تحریر کردہ ہیں۔ان مضامین سے فراق صاحب کی علمی شخصیت اور شاعری کے متنوع وخدوخال کی تشریح وتعبیر ہوتی ہے۔

پہلے عنوان نادر ونایاب: سہل تم نے فراق کو جانا کے تحت، فراق گورکھپوری: مختصر سوانحی خاکہ، شجرہ نسب، دستخط، ڈاک ٹکٹ اور عکس تحریر، نادر ونایاب تصاویر کے انتخاب میں عزیز نبیل نے بڑی دانش مندی اور ذہانت کا ثبوت فراہم کیا ہے، ان تصاویر پر نظر ڈالنے سے فراق کی پروقار دیدہ زیب شخصیت کے علاوہ علمی وعملی میدان میں ان کی سرگرمیاں واضح ہوجاتی ہیں، ساتھ ہی اردو کے عظیم دانشوروں، مفکروں اور شاعروں سے ان کے مراسم خاص بھی ظاہر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ حکومت ہند کے ذریعے ان کے نام سے جاری کردہ ڈاک ٹکٹ سے ان کی قدر ومنزلت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

دوسرے عنوان یادیں، ملاقاتیں خاکے: یادیں آکے رہ گئیں بھولی ہوئی کہانیاں کے تحت آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، دوارکا داس شعلہ، رمیش چند دویدی، ملک زادہ منظور احمد، سید احمد آفاق سیتاپور، شمیم حنفی کے علاوہ دیگر حضرات نے فراق گورکھپوری کو اپنی بھولی بسری یادوں کے جھروکوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔تیسرا عنوان: تذکرہ و تبصرہ میں فراق کی شخصیت پر جامع مضامین ہیں۔کتاب کا سب سے اہم حصہ چوتھا عنوان فراق فہمی: تحقیق وتنقید ہے جن میں دانشور نقاد فراق گورکھپوری، جمیل جالبی، فراق کی شعریات، حامدی کاشمیری، فراق گورکھپوری نئی شعری روایت کے بانی، حسن عابدی، فراق کی نثر نگاری، زیب النسا سعید، کافر منزل اور فراق، سید احتشام حسین، فراق کی غزل گوئی، کلیم الدین احمد، فراق آفتاب علم ودانش، مالک رام اردو شاعری میں فراق کی آواز: محمد حسن عسکری، فراق: مغربی اور ہندوستانی حسیت کا حسین امتزاج، محمد علی صدیقی، جوش وفراق: تضاد اور مماثلتیں، مظفر حنفی، یوپی کا ایک ہندو شاعر، نیاز فتح پوری، فراق کی رباعی گوئی، سیدہ جعفر، کلام فراق کے لفظی پیکر، ناصر عباس نیر کے علاوہ دیگر ممتاز قلمکاروں کے مضامین ومقالات ہیں جو زیر تبصرہ کتاب کی اصل روح ہیں۔پانچواں اور آخری عنوان فراق نامہ میں فراق کے انٹرویو، اہم خطوط نثری اور شعری تحریروں کے انتخاب سے کتاب کی قدر وقیمت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

کتاب کے مختلف النوع مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں فراق کی شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں وہاں ان کی علمی صلاحیتوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔یہ کتاب فراق گورکھپوری کی شخصیت اور تخلیقی کارناموں پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے جس کا مطالعہ اساتذہ وطلبا کے لیے ہی نہ صرف معاون ومددگار رہوگا بلکہ ہر اس شخص کے لیے مفید اور کارآمد ہوگا جو تھوڑی بہت بھی اردو شعر وادب سے دلچسپی رکھتا ہے۔

بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

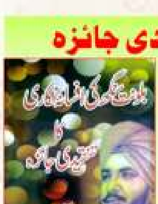

مصنف: ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری

صفحات: 186، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: مبشر عالم

6/275، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔ 110092

بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری کی کتاب ہے جس میں بلونت سنگھ کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں بلونت سنگھ کی شخصیت کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔دوسرا باب اردو افسانے کی روایت پر مبنی ہے اس میں ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک کے افسانہ نگاروں اور افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح باقی ابواب میں بلونت سنگھ کے افسانے اور ان کے مختلف موضوعات کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔آخری باب میں بلونت سنگھ کے معاصر افسانہ نگاروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔آزادی کی بعد کے اردو فکشن میں ایک نمایاں نام بلونت سنگھ کا بھی ہے۔بلونت سنگھ کا

روحانی تعلق پنجاب سے ہے۔ وہ دلی بھی آئے تو دل پنجاب میں رہا۔ وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں میں پنجاب کو جس طرح ڈسکور کرتے ہیں وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ صرف پنجاب کی خوشبو بلونت سنگھ کے ناول اور افسانے کے موضوعات نہیں ہیں، بلکہ پنجاب کے مسائل کے ساتھ ان کی آنکھیں ان دریچوں کو بھی کھولنے میں کامیاب ثابت ہوتی ہیں، جو در بچے پنجاب میں رہنے والے افسانہ نگار بھی نہیں کھول پائے۔

شہر میں مکان کے مسئلے کے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ اب مشترکہ خاندان کا تصور ٹوٹتا جا رہا ہے اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی یونٹیں اب خاندان کی صورت میں شہروں میں اپنے مکان لے کر رہتی ہیں اور کئی نئے مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر امتیاز صاحب نے بلونت سنگھ کے افسانوں کا جائزہ لینے میں کافی محنت کی ہے۔ مگر یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ بلونت سنگھ کے افسانوں میں کوئی ایسی بات دریافت نہیں کر سکے جو پہلے نہیں کہی گئی ہو۔ بلونت سنگھ پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ 'آجکل' اردو اور کئی رسائل نے بلونت سنگھ پر خاص نمبر بھی شائع کیے تھے۔ بلونت سنگھ اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کا اعتراف کیا جا چکا تھا۔ 'جگا' جیسی کہانی نے بلونت سنگھ کے ادبی قد کو بلند کیا تھا۔ مصنف نے بلونت سنگھ کے شہری مزاج کے افسانوں کا بھی جائزہ لیا ہے، مگر اس طرح کی کتابوں کے ساتھ سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ریسرچ اسکالر اکثر دوسروں کے اقتباسات نقل کرنے میں رہ جاتے ہیں اور ان کی اپنی بات اگر سامنے آتی بھی ہے تو وہ ان اقتباسات کے درمیان گم ہو جاتی ہے۔ مصنف نے صرف افسانوں کو حوالہ بنایا ہے۔ مگر بلونت سنگھ کی ایک بڑی دنیا ان کے ناول بھی ہیں۔ کالا کوس، رات، چاند اور چوران کے شہرۂ آفاق ناولوں میں گنے جاتے ہیں۔ وہ حوالہ کے طور پر ہی سہی، اگر بلونت سنگھ کے ناولوں کا بھی تذکرہ کرتے تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ بلونت سنگھ کے کسان کئی معاملوں میں پریم چند کے کسان سے مختلف ہیں۔ کتاب سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

ان سب باتوں کے علاوہ بلونت سنگھ کی ایک اور خصوصیت کردار نگاری ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار، خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں بسنے والے فرضی کردار نہیں ہیں۔ بلکہ پنجاب کی مٹی سے ابھرے سیدھے سادے، زندہ دل اور دلیر انسان ہیں۔ وہ ہر طرح کے حالات سے واقف ہیں۔

ان کے یہاں زیادہ تر کسان کردار ہیں لیکن کسانوں کے علاوہ دوسرے کرداروں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان کے کردار شہری بھی ہیں، اس لیے آج کا سکھ ان کے افسانوں میں صرف کسان ہی نہیں بلکہ ڈاکٹر، انجینئر، فوجی افسر، پروفیسر اور کلرک سبھی کچھ ہے۔ ان کے کردار وہی بولیاں بولتے ہیں۔ جو ان کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اور لہجہ بھی وہی ہوتا ہے۔

تصورات کی سی رنگینی، فکر کی گہرائی اور سادگی بلونت سنگھ کے یہاں یہی تمام باتیں تقسیم سے پہلے کے افسانوں میں تھیں اور تقسیم کے بعد کے افسانوں میں بھی ہیں۔ اس دور میں انھوں نے جو چند افسانے لکھے، ان میں وہ ماضی سے حال اور مستقبل کے فنکار نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'جگا' ہے، جس میں سب سے پہلے اردو افسانے میں سکھوں کی معاشرت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملیں۔

نئے ریسرچ اسکالرس کی کتاب پڑھتے ہوئے کئی بار ایسا لگتا ہے کہ کاش۔ کچھ اور محنت کی ہوتی تو کچھ اہم نکات اور کھل کر سامنے آتے۔ افسانوں کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے وہ سرسری طور پر ایک عہد کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 1975 کے بعد کے جن افسانہ نگاروں کا نام لیتے ہیں ان میں صرف مشرف عالم ذوقی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ 1975 سے اب تک یعنی 43 برس کا عرصہ کافی ہے، جس میں بہت سے نئے لوگ بھی سامنے آئے ہیں۔ ان 43 برسوں کا جائزہ لیا ہی نہیں گیا۔ جبکہ 1975 کے بعد کا دور اردو افسانے کے لحاظ سے کافی اہم تصور کیا جاتا ہے۔

بہر کیف، بلونت سنگھ پر ابھی بھی کم لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کا استقبال کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری بلونت سنگھ کے افسانوں کے مطالعہ کے لیے اپنے قاری کے اندر تجسس کو جگانے میں کامیاب ہیں۔ کتاب حالی پبلشنگ ہاؤس نے شائع کی ہے۔

سفرنامہ

مغرب کی وادیوں میں

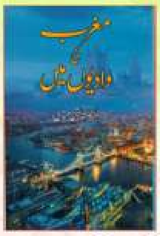

مصنف: ڈاکٹر تابش مہدی

صفحات: 144، قیمت: 150 روپے

ناشر: ادبیات عالیہ اکادمی، نئی دہلی

مبصر: محمد حسین

B-552، گلی نمبر 22، ذاکر نگر، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

زیر تبصرہ کتاب اپنے نام سے ہی پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کے نام سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کتاب سفرنامہ ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی ایک معروف قلم کار ہیں جو اسلامی، ادبی، صحافتی موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ مسلسل ادبی وفکری مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر تابش مہدی ایک شاعر اور نعت خواں بھی ہیں اور نعت خوانی کے پروگرام میں انہیں ہندوستان بھر سے اور بیرون ہند سے بھی دعوتیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کتاب در اصل نعت خوانی کے سلسلے میں برطانیہ کے متعدد اسفار کا نتیجہ ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر تابش مہدی نے برطانیہ کے چار سفر کا چار صفحات میں مختصراً ذکر کیا ہے۔ مصنف نے خود کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب کوئی مستقل سفرنامہ نہیں ہے بلکہ اس کتاب کو ان کے پانچویں سفر برطانیہ کی ڈائری/یادداشت سمجھا جا سکتا ہے۔ مصنف اکتوبر 2014 میں برطانیہ کے پانچویں سفر پر روانہ ہوئے۔ تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، اسلامک مشن یو کے اور مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ کی سرگرمیوں کے حوالے اور جماعت سے وابستہ نمائندہ شخصیات کے تذکرے بھی اس کتاب میں جا بہ جا ملتے ہیں۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے متعدد مقامات کے اجلاس میں نعت سرائی اور نعتیہ مشاعروں میں شرکت کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تابش مہدی نے لندن، شیفلڈ، اولڈھم، برنلے، راچ ڈیل، کیتھلے، گلاسگو (اسکاٹ لینڈ) برمنگھم وغیرہ کا سفر کیا ان تمام اسفار کا ذکر شامل کتاب ہے۔ نعت کی محفلوں کے علاوہ ڈاکٹر تابش مہدی نے سفر برطانیہ میں یوم اقبال اور جلسۂ شہدائے کربلا میں بھی شرکت کی۔ برمنگھم میں الہجرہ لائبریری کے زیر اہتمام یوم اقبال کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں متعدد دانشوروں نے اقبال کی شاعری اور ان کے فکر وفن پر عالمانہ گفتگو کی۔ ڈاکٹر تابش مہدی لکھتے ہیں کہ "میں نے اقبال کی شاعری، ان کے کلام کی عصری معنویت اور اس میں پائے جانے والے خالص اور واضح اسلامی افکار ونظریات پر تفصیلی گفتگو کی۔ اس ذیل میں اقبال کے مخالفین یا ناقدین کے معاندانہ رویے اور اقبال پسندوں کے مبالغہ آمیز رویے اور غیر متوازن انداز واسلوب کو بھی موضوع گفتگو بنایا"

ڈاکٹر تابش مہدی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں جو ادب، صحافت، اسلامیات اور تصوف وغیرہ پر درجنوں کتاب کے مصنف ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر تابش

مہدی شاعر بھی ہیں۔ نعت کے علاوہ غزلیں بھی کہتے ہیں۔ برطانیہ کے اسفار میں انھوں نے متعدد محفلوں اور مشاعروں میں نعت سرائی کی۔ اور متعدد ریڈیو اسٹیشن پر اپنے کلام پیش کیے۔ شیفڈ کی ایک محفل میں نعتیہ کلام پیش کرنے کے بعد انھوں نے چند غزلیہ اشعار بھی سنائے جن میں سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

پہلے آپ اپنا دل آئینہ کیجیے
پھر کسی سے امید وفا کیجیے
مسئلے خود بہ خود ختم ہو جائیں گے
اپنی اپنی حدوں میں رہا کیجیے

کتاب کے نام سے محسوس یہ ہو رہا تھا کہ کتاب ہمیں مغربی ممالک کے سفر کے تجربات کے ساتھ وہاں کی ثقافت اور متحرک زندگی سے روبرو کرائے گی لیکن کتاب ایک طرح کی یادداشت اور ڈائری تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جس میں مصنف کے متعلقین اور ان کے پروگرام کی روداد ہی نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک صفحہ پر عنوان ہے 'آکسفورڈ'۔ ظاہر ہے اس عنوان سے کسی بھی قاری کا تبادر ذہنی عالمی شہرت یافتہ دانش گاہ آکسفورڈ یونی ورسٹی کی طرف جائے گا۔ مجھے بھی ایسا لگا کہ شاید مصنف ہمیں آکسفورڈ یونی ورسٹی کی سیر کرائیں گے لیکن معاملہ آکسفورڈ یونی ورسٹی کے ایک پٹرول پمپ پر کچھ لمحے کے لیے وقفے بھر کا تھا۔

کتاب خوبصورت سرورق کے ساتھ نفیس طباعت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر تابش مہدی نے برطانیہ میں تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور جمعیت اہل حدیث کی سرگرمیوں کا بخوبی احاطہ کیا ہے اور اس سے وابستہ شخصیات کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ برطانیہ کو دنیا Modernity اور چکاچوند زندگی کی رعنائیوں کی وجہ سے جانتی ہے۔ لیکن صاحب کتاب نے ہمیں برطانیہ کو ایک دوسرے آئینے سے دکھایا کہ برطانیہ جیسے مذہب بیزار ملک میں بھی مذہبی و اسلامی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ دینی جلسے، مشاعرے اور نعت کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔

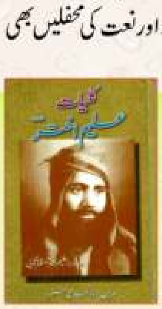

کلیات علیم اختر

مرتب: ڈاکٹر محمد مستمر

صفحات: 728، قیمت: 600 روپے

ناشر: تخلیق کار لکشمی نگر، دہلی 92

مبصر: ڈاکٹر ذکی طارق، 506 کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک، غازی آباد، یوپی

اُردو غزل ہندوستان میں اپنی ابتدا سے بیسویں صدی کے وسط میں جدید شعرا کے دور میں داخل ہوئی۔ یہ جدید شعراء فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی اور فراق گورکھپوری وغیرہ تھے۔ اس دور میں غزل کو بہت عروج حاصل ہوا۔ ہندوستان کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جہاں کثیر تعداد میں غزل کے شعرا موجود نہ ہوں۔ دہلی اور یوپی ایسے بہت سے ممتاز شعرا کا مرکز تھی جہاں غزل کے خوبصورت پیرایہ میں شعرا نے اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ پھر بھی بہت سے شعرا صلاحیت اور اس دور میں ممتاز ہونے کے باوجود شعرا کی گروپ بندی اور ادبی چپقلش کا شکار ہو گئے اُن میں ایک نمایاں اور ممتاز نام جناب علم اختر مظفرنگری کا بھی ہے جو 6/جون 1914 کو پیدا ہوئے اور 21/اپریل 1972 کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ انھوں 18/برس کی عمر میں جب کہ وہ درجہ نہم کے طالب علم تھے طلبہ کے ایک طرحی مشاعرہ میں شرکت کرکے اول انعام حاصل کیا۔ ابتداءً وہ اپنے تعلیمی استاد جناب الم مظفرنگری سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ غزلیں علامہ سیماب اکبرآبادی صاحب کو بھی دکھائیں اس طرح وہ داغ اسکول سے منسلک ضرور ہوئے مگر ذہنی طور پر وہ حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں چنانچہ ان دونوں شعرا کا رنگ ان کے کلام میں دیکھنے کو بھی ملتا ہے۔

کلیات 'علیم اختر' 728/صفحات پر مشتمل ہے جس میں علیم اختر صاحب اوّل مجموعہ کلام 'نکہت گل' اُن کے نعتیہ مجموعہ 'انوارِ حرم' اور 'بوئے جمال' جس میں 1957 میں 'نکہت گل' کے شائع ہونے کے بعد والا کلام جو اپریل 1972 تک یعنی وفات سے قبل تک کا کلام ہے شامل کیا گیا ہے۔ 'انوارحرم' اور 'بوئے گل' کو ابتدائی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کلیات کے ابتدا میں ڈاکٹر محمد مستمر نے تقریباً 40/صفحات پر جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ قابل توجہ ہے جس کے ذریعہ مرتب نے علیم اختر صاحب کی زندگی اور شاعری کا بھرپور جائزہ لیا ہے جو مستمر کی علمی بصیرت، تحقیقی صلاحیت اور فکر ونظر کا آئینہ دار ہے۔ 'نکہت گل' میں شائع شدہ مضامین جگر، فراق، سید اعجاز حسین اور مانی جائسی کے علاوہ خود علیم اختر صاحب کا اپنا مضمون 'کچھ اپنے تعلق سے' بھی جہاں کلیات کی زینت بنا ہے وہاں پروفیسر کرامت علی کرامت کا مضمون 'علیم اختر مظفرنگری: یادوں کے آئینہ میں' علیم اختر صاحب کی شاعری اور اُن کے مزاج کو سمجھنے میں قاری کے لیے معاون ہے۔ 'نکہت گل' میں 62 غزلیں، 9 نظمیں، 9 قطعات اور 10 متفرق اشعار ہیں۔ اس کے بعد اُن کے نعتیہ کلام جو 'انوارحرم' کے نام سے شائع ہو چکا تھا اور جس پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا شامل کیا گیا ہے۔ 'انوارحرم' پر علیم اختر صاحب کے بڑے بیٹے صاحبِ طرز ادیب جناب عظیم اختر نے بھی بعنوان مجھے کہنا ہے کچھ......'' 2 صفحات قلم بند کیے ہیں۔ اُس کے بعد 'بوئے جمال' شعری مجموعہ ہے۔ جو 150 غزلوں، 23/نظموں، قطعات متفرقات اور دیگر اصناف سخن سے مزین ہے اور آخر میں 'مشاہیر کی نظر میں' وہ اقتباسات شامل کیے گئے ہیں جو محمد مستمر کی کتاب 'علیم اختر مظفرنگری کی شاعری' ایک مطالعہ پر مختلف نقادوں کے ذریعہ پیش کیے گئے تھے۔

اگرچہ اس کلیات کے شائع ہونے میں 44 برس بیت گئے لیکن پھر بھی اس میں باسی پن کا نہیں تازگی کا احساس موجود ہے۔ اور اس تازگی کی وجہ ہے علیم اختر صاحب کا حسن وعشق کا پاکیزہ تصور اور وہ لطیف احساس جمال جس کے ذریعہ اُن کے کلام میں روانی، برجستگی اور تغزل اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اور قاری کے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

علیم اختر صاحب نے غزل کے علاوہ نظمیں اور قطعات بھی کہے ہیں، غزلوں کے مقابلہ اُن کی تعداد اگرچہ کم ہے پھر بھی انھوں نے اپنی نظمیہ شاعری کو فکر وخیال کے چراغ سے جس طرح آراستہ کیا ہے وہ اُن کے وسیع مطالعے کی دین ہے۔ اُن کی نظموں میں بھی وہ جمالیاتی آہنگ اور فطری غنائیت موجود ہے جو اردو غزل کا تہذیبی رویہ ہے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے مشاہدہ کی وسعت، فکر کی روشنی، جذبے اور احساس کی شدت، لب ولہجہ کی سادگی اور حلاوت سے خوبصورت اور نازک تراکیب استعمال کی ہیں وہ قابل داد ہیں اور شاذ ونادر ہی شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ ان نظموں کی موسیقیت، منظرنگاری، ترنم کی لے اور تخیل کی کارفرمائی اُن کو معاصرین کی صف سے الگ کرتے ہوئے ناقدین کو اُن کے منفرد رنگ اور لب ولہجہ کی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ بلکہ یہ بھی باور کراتی ہیں کہ غزل گو شاعر ہونے کے باوجود اُن کی نظموں میں بھی تغزل بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اپنی نغمگی، پیکرتراشی، پندو نصائح، تشبیہات و استعارات سے مزین یہ نظمیں قاری کو جمالیاتی کیف وسرور میں ڈبو کر اس کی روح کو سرشار کر دیتی ہیں۔

کلیات کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جناب علیم اختر

مظفر نگری کی شاعری اپنے معاصرین کے ہجوم میں یقیناً انفرادیت رکھتی ہے اور جو مرتبہ ان کو ادب میں ملنا چاہیے وہ نہیں مل سکا ہے۔ ڈاکٹر محمد مستمر نے اپنے مقدمہ میں جناب علیم اختر صاحب کی شخصیت اور ان کے فن پر بڑی جانفشانی کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور اُن کے ہمعصر شعرائے کرام کے ساتھ اُن کے اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے اُن کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مستمر کی یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی اور اہل نظر اب اس پر خصوصی توجہ دیں گے اور علیم اختر مظفر نگری کے مقام و مرتبہ کا احاطہ کریں گے۔

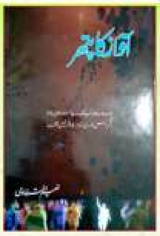

آواز کا پتھر

مصنف/ شاعر: نعیم اختر خادمی

صفحات: 112، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2018

مبصر: امان الحق بالاپوری

جعلی بیس، اوڈسٹی، بالاپور، ضلع اکولہ، مہاراشٹر

’آواز کا پتھر‘ نعیم اختر خادمی کا 112 صفحات پر مشتمل غزلیہ شاعری کا ایک خوبصورت و دیدہ زیب مجموعہ ہے جس پر پروفیسر ڈاکٹر اشفاق انجم، ڈاکٹر محمد شفیع صفی، ڈاکٹر راحت اندوری اور ظفر صہبائی جیسے ماہرینِ فن کے لکھے مضامین کتاب کے معیار کو مزید بلندی عطا کر گئے ہیں۔

نعیم اختر خادمی سادہ سہل طریقے سے شعر کہنے پر قادر ہیں۔ ان کی شاعری ہر دور کی عکاسی، ہر نظریۂ فکر کی بازگشت اور عام انسانی زندگی کی ترجمان ہے۔ موجودہ دور میں سیاسی منافقت، ریاکاری، چاپلوسی، جھوٹ کی علمبرداری، سماجی عدم مساوات، غاصبانہ استحصال، احباب کی منافقت شاعری کے اہم موضوعات ہیں لیکن نعیم اختر خادمی نے مسائلِ حیات کے سبھی گوشوں کو چھوا ہے اور ان پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ انھوں نے جدید شاعری کے ساتھ ساتھ روایتی شاعری سے بھی ناتا نہیں توڑا، شعر روایتی انداز کا ہو یا جدید طرز کا اچھا شعر بہرحال اچھا ہوتا ہے۔ نعیم اختر خادمی کی شاعری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر رومانی لہریں بھی ابھرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رات کس نے مری تنہائی کو مہکایا ہے
بوئے گل آئی تھی یا تیرا خیال آیا تھا
مری رودادِ دل کی ابتدا تم انتہا بھی تم
تمھارا تذکرہ کیسے برائے نام لکھوں گا
ہوجائے نہ میلی ترے رخسار کی چاندی
یہ سوچ کے ہم ہاتھ لگایا نہیں کرتے

کہتے ہیں شاعر کا احساس ہی اس کی سب سے بڑی دولت ہے جس کے ذریعے وہ نوبہ نو مضامین فنکارانہ انداز میں پیکرِ شعری میں ڈھالتا ہے۔ سیاست آج کے دور کا سب سے سلگتا موضوع ہے اس کی منافقت آج کی محافلِ شعر و ادب کا اہم حصہ بن گئے ہیں۔ ایسے میں ایک حساس طبع شاعر کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ نعیم اختر خادمی اس موضوع پر اپنے جذبات اور احساسات کی زنبیل کچھ اس طرح کھولتے ہیں۔

اے تپتے ہوئے دن کے مسافر نہ ادھر جا
وہ پیڑ سیاست کے ہیں سایہ نہیں کرتے
یہ سیاست فسادات کی اور کب تک رچی جائے گی
ہم کو بے بس کیا جائے گا ان کو تلوار دی جائے گی

اور جب وہ سیاسی ریاکاری دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔

ارتقا کے سبھی راستے بند پہلے کیے جائیں گے
بعد میں ساری پسماندگی ہم سے منسوب کی جائے گی

جب ان میں اپنی قوم و ملت کی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ جب قوم کے پیروکاروں کی بڑھتی ہوئی غفلت دیکھتے ہیں تو یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

سلطنت جائے تو جائے دشمنوں کے ہاتھ میں
صاحب عالم کہیں اٹھتے ہیں چوسر چھوڑ کر
کھولیے آنکھ ظلِ سبحانی
پائے مسند وزیر کھینچتا ہے

نعیم اختر خادمی کا حساس دل قوم کی بے سروسامانی اور ان میں انتشار دیکھتا ہے تو انھیں متحد ہونے کا پیغام ان اشعار سے دیتا ہے۔

یہ جان لے ہمیں ٹکڑوں میں بانٹنے والے
کبھی جو ہوگئے ہم ایک جاں تو کیا ہوگا
بکھرے تو پھر زمانے کی ٹھوکر میں آگئے
اور متحد ہوئے تو زمانے پہ چھاگئے

ساتھ ہی وہ اپنے گردوپیش کے سماجی و معاشرتی نشیب و فراز پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ ان کے کئی اشعار زندگی کے روزمرہ معمولات اور عہدِ جدید سے بڑی حد تک ہم آہنگ اور مربوط پائیں گے۔

ایک اک لب ہے وہی پیاس کی تصویر لیے
تم تو کہتے تھے بڑے زور کی برسات ہوئی
کچھ گرد تو ملے گی ہی دیوار و فرش پر
گھر ہے یہ کوئی آئینہ خانہ تو ہے نہیں
ہمیں اپنے مسائل دیر تک سونے نہیں دیتے
ہمارے گھر کوئی دن شام سے بستر نہیں لگتا
جس گونگی سیاست کا جہانگیر ہو بہرہ
انصاف وہاں مانگنے جایا نہیں کرتے

نعیم اختر خادمی موجودہ عہد کے ایک مثبت و تعمیری رجحانات کے علمبردار فنکار ہیں جن کی شاعری میں ہماری اخلاقی روایات کی شمع فروزاں نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار تاریخی سچائیوں اور اخلاقی رفعتوں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کا کلام ہماری نئی نسلوں کے لیے چراغِ رہ گزر بن سکتا ہے۔ ان کے اشعار۔

بنا کے اپنا راستہ جو بھیڑ سے نکل گیا — ترقیوں کی راہ میں اسی کا زور چل گیا
ابھی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہیں — موجودہ انتشار سے گھبرا نہ اے نعیم
اتنا اڑنے کے لیے پر نہیں تولا کرتے — فاصلہ کتنا ہے اس ڈالی سے اس ڈالی کا

ان کی شاعری میں ایسے نہ جانے کتنے اشعار ہیں جنھیں وہ اپنی آواز کا پتھر بن کر قوم کی بیداری کے لیے پھینکتے رہے۔ ان کے اس شعر پر مضمون ختم کروں گا کہ۔

نہ جانے اور کب تک بے خبر سوتا یہ سناٹا
اگر اس کو مری ’آواز کا پتھر‘ نہیں لگتا

نعیم اختر خادمی کا مجموعہ ’آواز کا پتھر‘ یقیناً لائقِ ستائش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی علمی و ادبی سطح پر پذیرائی ہوگی جس کی ادائیگی کے لیے ایک سو پچاس روپے بارِ گراں نہیں۔ ■

امریکہ میں شاعری مقبول، نثر سے توجہ ہٹتی ہے

واشنگٹن: ایک تازہ ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ امریکی شہری شاعری کی جانب راغب ہوتے جارہے ہیں اور نثر میں ان کی دلچسپی کم ہورہی ہے۔ امریکہ کے نوجوان طبقے میں شاعری اور دیگر جمالیاتی فنون کو زیادہ پسند کیا جارہا ہے۔ امریکی عوام کے ادبی رویوں اور ذوق کے حوالے سے نئی ریسرچ واشنگٹن حکومت نے مرتب کرائی ہے۔ اس ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ عام لوگوں میں نثر یعنی ناول یا فکشن پڑھنے کا رجحان کسی حد تک زوال پذیر ہے اور شاعری کے علاوہ نوجوان طبقے کی پرفارمنگ آرٹس میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ سروے رپورٹ سنہ 2002 سے 2017 کے عرصے پر محیط رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے مکمل کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق نثر یا فکشن پڑھنے کی شرح 45 فیصد سے کم ہوکر 42 فیصد پر پہنچ گئی ہے۔ شاعری پڑھنے والوں کی تعداد 7 فیصد سے بلند ہوکر 12 فیصد کے قریب ہوگئی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ میں انسٹاگرام پر مقبول نوجوان شاعروں کی کتب کو خاصی تعداد میں خریدا گیا ہے۔ ان میں زوپی کور اور ٹیلر نال گریکسن خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اس رپورٹ کے

تناظر میں امریکی ادارے NEA کی سربراہ ایمی اسٹرول کا کہنا ہے کہ آن لائن پلیٹ فارم اور سوشل میڈیا کی وجہ سے فکشن پڑھنے کے رجحان میں کمی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ایمی اسٹرول کا مزید کہنا ہے کہ ان کے ادارے کی جانب سے اشاعتی اداروں اور کتابوں کی تشہیر کے اداروں کو مالی مراعات دی جاتی ہیں اور مصنفین کے اسکولوں میں طلبا سے ملاقات کے پروگراموں کی سرپرستی ایک ایسا تخلیقی سلسلہ ہے کہ اس سے شعرا کی قدرے مناسب انداز میں پذیرائی ممکن ہوسکی ہے۔ ایمی اسٹرول کے مطابق شاعری کی مقبولیت کی ایک اور وجہ ایسے پروگراموں کا تواتر سے منعقد کرانا ہے، جن میں بلند آواز میں شاعری حاضرین کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ ریسرچ کے مطابق ایسی تقاریب میں طلبا کی شرکت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 14 ستمبر 2018

امریکی محکمہ خارجہ کی اردو سے محبت

واشنگٹن: امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان ہیلینا وائٹ نے اردو میں گانا گنگنا کر مداحوں کے دل موہ لیے۔ اردو سے محبت کرنے والی اور صاف اردو بولنے والی امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان ہیلینا وائٹ نے اردو زبان میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بالی ووڈ کے پرانے گانے بہت پسند ہیں، اپنی گفتگو کے دوران انھوں نے ایک پرانا گانا بھی گنگنایا۔ قبل ازیں ان کا کہنا تھا کہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے واضح کردیا کہ دنیا میں امن وسلامتی ہی امریکہ کی ترجیحات ہیں۔ واضح رہے کہ امریکی محکمہ خارجہ نے اردو بولنے والی امریکی خاتون کو ترجمان تعینات کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اکتوبر 2018

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نئے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اردو کے معروف ادیب و نقاد

ستیہ وتی کالج دہلی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا تقرر کیا ہے۔ اعلانیے کے مطابق ان کی مدت کار تین سال پر محیط ہوگی۔ 28 ستمبر کو انھوں نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں بحیثیت ڈائرکٹر چارج سنبھال بھی لیا۔ اس موقعے پر سابق ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور کونسل کے دیگر اہلکار بھی موجود تھے۔ قومی اردو کونسل کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اردو کی معروف اور فعال شخصیت ہیں اور موجودہ ادبی منظرنامے میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں جن میں غزل کا عبوری دور، ادب اسطور اور آفاق، فن تضمین نگاری، مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس، ادب اور جمالیات، پریم چند فکشن کے فنکار اور شکیل الرحمٰن قابل ذکر ہیں۔ ان کے تحقیقی مقالات ہند اور بیرونِ ہند کے مؤقر مجلّات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہندی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں مضامین لکھے ہیں۔ مختلف قومی سمیناروں میں وہ اپنے مقالات پیش کر چکے ہیں اور کئی جگہ انھوں نے صدارتی خطبات بھی دیے ہیں۔ ان کی نگرانی میں کئی اسکالرس پی ایچ ڈی بھی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو، ٹیلی ویژن دوردرشن کے پروگراموں میں بھی ان کی شرکت ہوتی رہی ہے۔ گولڈ میڈل کے علاوہ بہت سے ایوارڈ سے سرفراز بھی ہو چکے ہیں۔ کئی مؤقر اداروں کے ممبر بھی ہیں او رانھیں طویل انتظامی تجربہ بھی ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا تعلق بہار کے موتیہاری ضلع سے ہے۔ انھوں نے بہار یونیورسٹی مظفرپور سے بی اے اور دہلی یونیورسٹی سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ نئے ڈائرکٹر نے قومی اردو کونسل کے دفتر میں منعقدہ استقبالیہ تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں اردو کی ترقی کے لیے پابند عہد ہوں۔ میں ہندوستان کے ہر ایک گاؤں میں اردو زبان کو پہنچانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد اردو کے بنیادی تعلیمی ڈھانچے کو مضبوط کرنا ہے۔ اردو کاز کے لیے میں ہمہ وقت تیار ہوں۔ اس کے لیے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے گا ضرور کروں گا۔

استقبالیہ تقریب میں سابق ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر ابن کنول (صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر ماجد احمد تالی کوٹی، ڈاکٹر ترون اور ڈاکٹر ایم رحمت اللہ نے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کو ڈائرکٹر بننے پر مبارکباد دی اور نیک خواہشات پیش کیں۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ کمل سنگھ نے انجام دیے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28/ستمبر 2018

قومی اردو کونسل اردو زبان کے فروغ کے لیے مبسوط لائحہ عمل تیار کرے گی

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے اردو کی تعلیم اور زبان کی سطح پر جمود کی کیفیت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل اردو کی تعلیم اور زبان کے فروغ کے لیے ایک مبسوط اور مربوط لائحۂ عمل تیار کرنے جارہی ہے اور اس سلسلے میں زبان کے ماہرین سے تجاویز اور مشورے بھی طلب کرے گی تاکہ ہندوستان کے طول وعرض میں قائم اسکولوں اور مدارس میں اردو کی بنیادی تعلیم کو مضبوط کیا جائے اور اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ ان علاقوں سے جوڑا جائے جہاں اس کے فروغ کے امکانات ہیں۔ انھوں نے اردو سے محبت کرنے والے افراد سے اپیل کی کہ اپنے علاقے میں فروغ اردو کے لیے چھوٹی چھوٹی تنظیمیں قائم کریں اور اس کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے کام کریں۔ اس سلسلے میں قومی اردو کونسل ان کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔ ڈاکٹر شیخ عقیل نے اسکول اور مدارس کے تعلیمی منہج اور معیار کا جائزہ لینے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسکولوں اور مدارس میں اردو کی تعلیم صحیح طور پر دی جارہی ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو اسکول اور مدارس سے جوڑیں تاکہ اقلیتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کیا جاسکے۔ اردو زبان کے فروغ اور تعلیم میں کچھ مشکلات پیش آتی ہیں یا کچھ مسائل ہیں تو ان کا حل اپنی سطح پر تلاش کریں اور اس سلسلے میں قومی اردو کونسل سے کسی طرح کی رہنمائی یا مدد کی ضرورت ہو تو قومی اردو کونسل ہر ممکنہ مدد کے لیے تیار ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ قومی اردو کونسل کا تاسیسی مقصد اردو زبان کا فروغ ہے جس پر قومی اردو کونسل خصوصی توجہ دے گی۔ اس کے علاوہ قومی اردو کونسل کی بہت سی اسکیمیں ہیں جن سے عوام فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اقلیتی طلبا ان اسکیموں کے ذریعے اپنا کریئر بہتر بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپیل کی کہ محبانِ اردو قومی اردو کونسل کے ویب سائٹ پر جاکر ان اسکیموں کا مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے بتایا کہ قومی اردو کونسل کی نگرانی میں پورے ہندوستان میں کمپیوٹر کے تربیتی مراکز اور فاصلاتی تعلیم کے سینٹر چل رہے ہیں جن سے طلبا کی ایک بڑی تعداد فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اب یہ ان علاقوں

کے محبان اردو کی ذمے داری ہے کہ ان سینٹرز کا معائنہ کریں اور جائزہ لیں کہ سینٹر صحیح طور پر چل بھی رہے ہیں یا نہیں اور یہ بھی بتائیں کہ کن علاقوں میں ایسے سینٹرز کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر وہ علاقے جو تعلیمی پسماندگی کے شکار ہیں ان علاقوں میں ترجیحی طور پر ایسے مراکز قائم کیے جائیں گے۔ انھوں نے تمام محبانِ اردو سے اپیل کی ہے کہ فروغ اردو کے تعلق سے اپنے تجاویز اور مشورے بھیجیں تاکہ اس کی روشنی میں فروغ اردو کے کام کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں میں ایسے طبقات بھی ہیں جو اردو زبان سے ناواقف ہیں اور تعلیمی اعتبار تعلیمی اعتبار سے پسماندہ۔ تو ایسے طبقات کی نشاندہی کریں تاکہ قومی اردو کونسل ان کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کچھ کوشش کرسکے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے انھیں مبارکباد دینے والے تمام محبانِ اردو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے مجھے جو ذمے داری سونپی گئی ہے میں اسے بہتر طریقے سے نبھانے کی کوشش کروں گا لیکن یہ کام محبانِ اردو کی مدد، تعاون اور مشوروں کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے خاص طور سے یہ بھی کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے محبانِ اردو قومی اردو کونسل کو پہلے اپنے قیمتی مشورے اور تجاویز بھیجیں اور ان پر عمل نہ ہونے کی صورت میں ہی مخالفت کریں کیونکہ مخالفت سے مسائل حل نہیں ہوتے جبکہ بہتر مشوروں سے بند راستے بھی کھل جاتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں یہ بھی کہا کہ محبانِ اردو میرے ذاتی ای میل یا فون پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں اور اردو کے فروغ کے لیے تجاویز بھیج سکتے ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8/ اکتوبر 2018

مالی تعاون

کرکٹ کی دنیا میں اردو صحافت

سری سادات: موضع حضرت نگر گڑھی میں بابر شگفتہ سمیتی کے ذریعے چل رہے ایل کے ایم انٹر کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے 'کرکٹ کی دنیا میں اردو صحافت' کے موضوع پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں ہندوستان کی مشہور ہستیوں نے شرکت کی۔ سمینار کا آغاز قاری شاہ عالم نے تلاوتِ قرآن پاک سے کیا۔ نعت پاک کا نذرانہ حکیم ماجد حسین نے پیش کیا۔ صدارت سادات ڈگری کالج کے بانی پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین جعفری اور نظامت ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی نے کی۔ مقررین نے 'کرکٹ کی دنیا میں اردو صحافت' کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر ڈاکٹر شریف احمد قریشی رضا ڈگری کالج رام پور، شفیق الرحمٰن برکاتی سادات ڈگری کالج سری سادات، ڈاکٹر ایم اے معروف ایل پی بی کالج حسن پور امروہہ، یامین برکاتی، ڈاکٹر شاہ عالم جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی دہلی، ڈاکٹر راشد خاں اور ڈاکٹر فیروز خاں نے کرکٹ کی دنیا میں اردو صحافت پر اپنے خیالات پیش کیے۔ آخر میں کالج کے منیجر مظاہر حسین نے سب کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3/ اکتوبر 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

وزیراعظم کی کتاب 'ایگزام واریرز' کے اردو ترجمے کا اجرا

نئی دھلی: امتحان کی تیاریوں اور امتحان کے دوران ذہنی تناؤ سے بچنے کا 'منتر' بتانے والی وزیراعظم نریندر مودی

کی تحریر کردہ کتاب 'ایگزام واریرز' کے اردو ترجمے کا اجرا ہوا۔ یہاں منعقد ایک شاندار تقریب میں انسانی وسائل کے فروغ کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر، اقلیتی امور کے وزیر مختار عباس نقوی، وزیراعظم دفتر میں وزیر مملکت ڈاکٹر جتندر سنگھ، فلم ہدایت کار مظفر علی، معروف اداکار رشی کپور اور انو کپور، سنی جمعیت علماء کیرالہ کے جنرل سکریٹری مفتی شیخ ابوبکر اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے اس کتاب کا اجرا کیا۔ اصل کتاب ہندی میں ہے جس کا اب تک پندرہ زبانوں میں ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ مسٹر جاوڈیکر نے کہا کہ وزیراعظم مودی دنیا کے ایسے پہلے وزیراعظم ہیں جنھوں نے امتحان کی وجہ سے طلبہ کو ہونے والے ذہنی تناؤ کے موضوع پر کتاب لکھی ہے۔ مسٹر مودی کے اندر ایک ٹیچر چھپا ہوا ہے اور ان کی کوششوں سے تعلیم کے معیار اور ریسرچ پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب صرف طلبہ نہیں بلکہ ٹیچروں اور سرپرستوں کے لیے بھی ہے۔ کیونکہ امتحان کے دنوں میں سرپرست 'ٹنشن' زیادہ لیتے ہیں اور زیادہ ٹنشن دیتے بھی ہیں۔ انھوں نے تعلیم کے فروغ اور طلبہ کی مدد کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے کیے جانے والے متعدد اقدامات کا بھی ذکر کیا۔ مسٹر نقوی نے کہا کہ وزیراعظم سب کا ساتھ سب کا وکاس کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور وہ نوجوانوں کو ترقی کا حصہ دار بنانا چاہتے ہیں۔ مسٹر نقوی نے اس موقعے پر کئی اشعار بھی پیش کیے۔ انھوں نے مسٹر مودی کے حوالے سے یہ شعر سنایا۔

میرے جنوں کا نتیجہ ضرور نکلے گا
اسی سیاہ سمندر سے نور نکلے گا

ڈاکٹر سنگھ نے کہا کہ اردو میں ترجمے کے بغیر وزیراعظم مودی کی اس کتاب کا اصل مقصد ادھورا رہ جاتا ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں دلی جذبات کا اظہار جتنا آسان ہے، دوسری زبانوں میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا اثر اردو سے ہی جھلکتا ہے۔ رشی کپور نے اپنے فلمی کیریئر کے سلسلے میں اعتراف کیا کہ انھوں نے فلموں سے اردو سیکھی ہے اور اردو کے ذریعے ہی انھیں فلموں میں کامیابی ملی ہے۔ انھوں نے کہا کہ والدین بچوں پر اچھے مارکس لانے کے لیے دباؤ بناتے ہیں جس کی وجہ سے بچے تناؤ میں آجاتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے طلبہ کو تناؤ سے بچنے کے طریقوں کا علم ہوگا۔ انھوں نے بچوں سے مخاطب ہوکر کہا "آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایسی کتاب مل رہی ہے، جو زندگی میں کام آئے گی" ہمارے وقت میں تو کوئی ایسا وزیراعظم نہیں تھا جو اس طرح کی کتاب لکھتا۔ انو کپور کا کہنا تھا کہ اردو اس ملک کی اہم زبان ہے اور اسے کسی مذہب سے نہیں جوڑنا چاہیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اگست 2018

'نیا دور' کے خصوصی نمبر کا اجرا

لکھنؤ: ریاستی گورنر رام نائک نے محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش کے اردو ادبی ماہنامہ 'نیا دور' کے خصوصی نمبر کا اتوار کو راج بھون میں اجرا کیا۔ اگست 2018 کا اس خصوصی نمبر میں سابق وزیراعظم آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کی ادبی خدمات پر ایک گوشہ شائع کیا گیا ہے جس میں ان کی نمائندہ نظموں کا ترجمہ اور ان پر لکھے گئے مضامین کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ رام نائیک نے رسم اجرا کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کی نظموں کا اردو ترجمہ ایک اچھی پہل اور قابل تعریف کام ہے۔ اس شمارے میں غیر مسلم شعرا و ادبا کو شامل کرکے اس بات کی وضاحت کی بہترین کوشش کی گئی ہے، اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ پورے ملک میں ہندی کے بعد اردو سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ حقیقت میں اردو ہندی چھوٹی بہن ہے۔ انھوں نے کہا کہ سماج میں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ زبانیں ایک دوسرے کو آپس میں جوڑنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ کے ڈائرکٹر اجول کمار نے کہا کہ نیا دور کافی مقبول رسالہ ہے اور اس کی تقریباً 3500 کاپیاں ہر ماہ شائع کی جارہی ہیں۔ سابق وزیراعظم آنجہانی اٹل بہاری پر مرکوز یہ شمارہ اردو ریسرچ اسکالرس کی تحقیق میں ان کا معاون ثابت ہوگا۔ ماہنامہ 'نیا دور' کے ایڈیٹر سہیل وحید نے کہا کہ اردو میں روایتی طور پر غیر مسلم شعرا و ادبا کی تعداد خاصی رہی ہے جن میں سے اکثر مشاہیر کا درجہ رکھتے ہیں اور کچھ کو اردو ادب کا لعل و گہر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 ستمبر 2018

اقلیتی طلبا کے لیے 'نیشنل اسکالرشپ موبائل ایپ' کا آغاز

نئی دہلی: اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے نئے پروگراموں کو متعارف کرانے والے مرکزی وزیر برائے

اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے اب اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے طالب علموں کے لیے جدید پہل کی ہے۔ مسٹر نقوی نے اقلیتی طلبہ کے لیے 'نیشنل اسکالرشپ موبائل ایپ' کا آغاز کیا ہے تاکہ اسکالرشپ کی تقسیم میں شفافیت لائی جاسکے اور یہ زیادہ سے زیادہ طلبہ تک براہِ راست پہنچ سکے۔ ایپ کا آغاز کرتے ہوئے مسٹر نقوی نے کہا کہ اس نیشنل اسکالرشپ موبائل ایپ سے غریب اور کمزور طبقوں کے طلبہ کے لیے آسان اور معقول اسکالرشپ کا انتظام ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ سبھی اسکالرشپ، نیشنل اسکالرشپ پورٹل کے ذریعے 'ڈائریکٹ بینی فٹ ٹرانسفر' کے حوالے سے براہِ راست طالب علموں کے بینک اکاؤنٹ میں دی جارہی ہیں جس سے ڈپلی کیشن اور لیکج کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ 'نیشنل اسکالرشپ پورٹل موبائل ایپ' طالب علموں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اسکالرشپ کو شفاف طریقے سے پہنچانے میں مزید مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس ایپ کے ذریعے طالب علم اسکالرشپ کے لیے درخواست گھر بیٹھے دے سکیں گے، ضروری کاغذات اپلوڈ کرسکیں گے، طلبا کا اسٹیٹس معلوم کرسکیں گے اور دوسری قسم کی معلومات حاصل کرسکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ موبائل ایپ کے ذریعے دور دراز حلقوں کے طالب علموں کو مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ مودی حکومت کے 'اپیزمنٹ کے بغیر بااختیار' بنانے کے عہد کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ سوا چار سال میں مختلف اسکالرشپ کے منصوبوں سے غریب، کمزور اقلیتی سماج کے ریکارڈ تقریباً 3 کروڑ طالب علم مستفید ہوئے ہیں جن میں تقریباً ایک کروڑ 63 لاکھ طالبات شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مودی حکومت کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مسلم لڑکیوں کا اسکول ڈراپ آؤٹ ریٹ جو پہلے 70 سے 72 فیصد تھا، اب کم ہوکر 35 سے 40 فیصد رہ گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم اسے زیرو فیصد کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ اس کام میں آسان اور معقول اسکالرشپ نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گذشتہ تقریباً ایک سال میں ملک بھر میں مدرسوں سمیت سبھی اقلیتی طبقوں کے ہزاروں تعلیمی اداروں کو 'ٹی تھری یعنی ٹیچر، ٹفن، ٹائلٹ' سے جوڑ کر انھیں مین اسٹریم کے تعلیمی نظام میں شامل کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2018

الور میں عالمی معیار کے تعلیمی ادارے کا سنگ بنیاد

نئی دہلی: راجستھان کے ضلع الور میں عالمی معیار کے تعلیمی ادارے کا سنگ بنیاد مرکزی وزیر برائے اقلیتی

امور مختار عباس نقوی کے ذریعے رکھا گیا۔ الور کے کشن گڑھ باس تحصیل میں منعقدہ تقریب میں مسٹر نقوی نے اعلان کیا کہ اس کی تعمیر کا کام 2020 تک مکمل کرلیا جائے گا۔ انھوں نے تعلیمی ادارے کے علاوہ کئی دیگر منصوبوں کا سنگ بنیاد رکھا اور کچھ اداروں کا افتتاح بھی کیا۔ مسٹر نقوی نے کہا کہ اس تعلیمی ادارے پر ایک ہزار کروڑ روپے خرچ کرنے کا منصوبہ ہے لیکن اگر اس سے زیادہ کی بھی ضرورت ہوگی تو اس پر خرچ کیا جائے گا نیز اس ادارے کی تعمیر میں پیسے کی کمی نہیں آنے دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ جب اس تعلیمی ادارے کو شروع کرنے کی بات آئی تو ہمارے پاس مشورے آئے تھے کہ کیرالہ میں کھولا جائے، بہار، اتر پردیش، مدھیہ پردیش میں کھولا جائے لیکن ہم نے میوات کے حالات دیکھے اور یہاں کا جائزہ لیا جس کے بعد فیصلہ ہوا کہ پہلا عالمی تعلیمی ادارہ یہاں تعمیر کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس ادارے کی تعمیر پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ یعنی پی پی پی ماڈل کے تحت کی جائے گی اور اس سلسلہ میں تعلیمی اداروں کے ساتھ بات چیت چل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا یہ جو تعلیمی ادارہ ہوگا اس میں پرائمری سے لے کر ہائر ایجوکیشن تک اور اس کے ساتھ ہی میڈیکل، انجینئرنگ، ایم بی اے کے علاوہ اسکل ڈیولپمنٹ کے پروگرام شروع کیے جائیں گے تاکہ نوجوانوں کو روزگار بھی مل سکے۔ انھوں نے کہا کہ کشن گنج باس میں جو ادارہ تعمیر کیا جائے گا وہ سنگاپور میں واقع تعلیمی ادارے کی طرز پر ہوگا جہاں ہوائی جہاز سے لے کر ٹرین اور دیگر اسکلز ہوتے ہیں۔

مسٹر نقوی نے کہا کہ اقلیتی وزارت اور مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے سہ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو جلد اس کا خاکہ پیش کرے گی اور اس کے بعد اس کی تعمیر کا کام شروع ہوجائے گا۔ اس موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے چیئرمین سراج الدین قریشی، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے خزانچی شاکر حسین، اجمیر درگاہ شریف کمیٹی کے ناظم پیرزادہ، رکن سالم حسین، سیف اللہ، مقامی رکن اسمبلی اور متعلقہ وزارت کے افسران اور فاؤنڈیشن کے دیگر اراکین نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2018

مجروح سلطانپوری حیات وکمالات

ممبئی: ترقی پسند تحریک کے اہم ستون، مشہور شاعر اور فلمی نغمہ نگار مجروح سلطانپوری کی سالگرہ کا صد سالہ جشن مناتے ہوئے 'مجروح سلطانپوری: حیات وکمالات' کے

عنوان سے ممبئی یونیورسٹی میں قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔ یہ 2 روزہ سمینار مجلس فخر بحرین، آئیڈیا کمیونی کیشنز اور ممبئی یونیورسٹی کے مشترکہ تعاون سے منعقد کیا گیا ہے جس میں ملک کے طول وعرض سے دانشوران، ادبا وشعرا اور محبان مجروح نے شرکت کی۔ افتتاحی سیشن کی صدارت معروف قانون داں، رکن راجیہ سبھا اور مجروح صاحب کے قریبی رہے مجید میمن نے کی جبکہ کلیدی خطبہ مشہور شاعر، اسکرپٹ رائٹر اور نغمہ نگار جاوید اختر نے دیا۔ افتتاحی سیشن میں مہمان خصوصی مرکزی وزیر برائے کامرس اینڈ انڈسٹری سریش پربھو تھے جبکہ ممبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سہاس پیڈنیکر بنفس نفیس موجود تھے۔ دو دنوں پر مشتمل اس قومی سمینار کے پہلے دن افتتاحی سیشن سے خطاب کرتے ہوئے مجلس فخر بحرین کے سرپرست شکیل صبرحدی نے مجروح کی شاعری کو پورے برصغیر کی شاعری قرار دیا اور کہا کہ اردو کسی مخصوص فرقے یا علاقے کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ اس پورے خطے کی زبان ہے اور اب عالمی طور پر تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ مہمانِ خصوصی مرکزی وزیر سریش پربھو نے مجروح سلطانپوری کے گیتوں اور فلمی نغموں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم جیسے لوگ ان کی شاعری کو سنتے سنتے ہی بڑے ہوئے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے نغمے ایسے نہیں ہیں کہ کوئی انھیں بھول سکے۔ ممبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سہاس پیڈنیکر نے مجروح کی شاعری اور اس کی عصری معنویت پر مختصر لیکن پرمغز خطاب کیا۔ صدارتی خطبے میں معروف قانون داں مجید میمن نے مجروح صاحب کی ذاتی زندگی اور ان سے اپنی قربت کا بطور خاص ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجروح صاحب کے قریب رہنا میری زندگی کا ایک اہم باب ہے جسے میں جب بھی دیکھتا ہوں خوشگوار یادیں مجھ سے جڑ جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ اس سیشن سے قبل برج نارائن چکبست پر کتاب کا اجرا بھی کیا گیا جس میں معزز مہمانان نے شرکت کی۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے مشہور شاعر ونغمہ نگار جاوید اختر نے نہ صرف اس کا حق ادا کر دیا بلکہ مجروح کو شاعری کا وہ ستون قرار دیا جس کے بغیر نہ اردو کی تاریخ لکھی جا سکے گی اور نہ شاعری پر کوئی بات ہو سکے گی۔ اس سیشن کی رسم شکریہ ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ پروفیسر صاحب علی نے ادا کی جبکہ سمینار کے کنویز آصف اعظمی نے جلسہ کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ دوسرا سیشن معروف نقاد وادیب پروفیسر شافع قدوائی کی صدارت میں منعقد کیا گیا جس میں معروف ماہرین تعلیم ابوصالح انصاری اور اسلم فقیہ مہمانان اعزازی تھے۔ اس سیشن میں ڈاکٹر عبداللہ امتیاز، ڈاکٹر جمال رضوی، سینئر شاعر اعجاز ہندی، معروف صحافی اور انقلاب (نارتھ) کے مدیر شکیل حسن شمسی، پروفیسر راکیش پانڈے نے اپنے پرمغز مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2018

فارسی زبان وادب اوراس کے خادمین

نئی دھلی: شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے رواں تعلیمی سال کا پہلا توسیعی خطبہ بعنوان 'ہندوستان میں

فارسی زبان وادب اور اس کے خادمین' شعبۂ تاریخ کے سمینار ہال میں منعقد کیا گیا۔ خطبے کا آغاز شکیل الرحمٰن بی اے سال دوم کے طالب علم نے تلاوت کلام پاک سے کیا، جبکہ استقبالیہ کلمات توسیعی خطبات سیریز کے کوآرڈی نیٹر اور اس خطبے کے ناظم ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے ادا کیے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے باعث فخر ہے کہ ایران کے بہت بڑے تاریخ داں، ادیب، دانش مند پروفیسر محمد رضا نصیری ہمارے درمیان ہیں۔ پروفیسر نصیری نے موضوع کے متعلق کہا کہ ہندوستان کے اساتذہ، محققین، ادیب وشعرا ودانشمندوں کی فارسی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر نصیری نے بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر وغیرہ کو ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا مربی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ حضرات ادب دوست، ادب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی ادیب وشاعر تھے۔ ساتھ ہی آپ نے پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر امیر حسن عابدی اور پرفیسر نبی ہادی کی خدمات کو سراہا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایران کی فارسی تاریخ بغیر ہندوستان کے مکمل نہیں ہوسکتی، جبکہ ہندوستان کی فارسی تاریخ بغیر ایران کے مکمل ہوسکتی ہے۔

خطبے میں مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر وہاج الدین علوی، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شرکت کی۔ پرفیسر علوی نے کہا کہ فارسی زبان ہماری اساس ہے ہماری ہندوستانی زبان میں اکثر فارسی الفاظ موجود ہیں۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ جب بھی ہم ہندوستان میں فارسی کا ذکر کریں تو نول کشور کی خدمات کو فراموش نہ کریں کیونکہ نول کشور نے اپنے چھاپہ خانے کے ذریعے ہندوستان میں فارسی ادب کی آبیاری کی ہے۔ اس خطبے کے صدر پروفیسر عبدالحلیم صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات کے دوران کہا کہ ہمیں آج بہترین خطبہ سننے کو ملا کیونکہ اس طرح کے دانشور و محققین سے ہمیں حتی الامکان استفادہ کرنا چاہیے۔

پروفیسر نصیری کی شخصیت صرف ایران تک محدود نہیں بلکہ تاریخ وادب کے حوالے سے وہ پوری دنیا میں اپنی نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ پروفیسر نصیری ایک طرف پیام نور یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر ہیں تو دوسری جانب فرہنگستان فارسی زبان وادب تہران، ایران کے جنرل سکریٹری بھی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 ستمبر 2018

آبروئے غزل

نئی دھلی: اردو شاعری کو ایک بڑی دنیا سے روشناس کرانے کے لیے فلم میکر اور صحافی تبسم فاطمہ اور فلم میکر اونیش راجونشی نے یوٹیوب پر آبروئے غزل کی پہلی قسط لانچ کی۔ شاہ حاتم، مرزا جان جاناں، ولی دکنی سے لے کر پروین شاکر تک 52 شاعروں کو اس پروگرام میں جگہ دی گئی ہے۔ اردو غزلوں کے اس پروگرام میں اردو شاعری سے محبت کرنے والے اپنے محبوب شاعروں کا مکمل تعارف بھی حاصل کریں گے اور ملک کے مشہور سنگر کے ذریعے گائی غزلوں کا لطف بھی اٹھائیں گے۔ اردو غزلوں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے جب ہم نے غزلوں پر منتخب پروگرام آبروئے غزل کی مارکیٹنگ کرانے کا ارادہ کیا تو

’اردو-ہندی کے لسانی رشتہ‘ کے موضوع پر منعقدہ سمینار

امید نہیں تھی کہ اچھے نتائج سامنے آئیں گے، لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب نتیجے امید سے کہیں زیادہ آئے۔ یہ اردو شاعری کی مقبولیت ہے۔ صحافی، ادیب اور پروڈیوسر ڈائرکٹر تبسم فاطمہ نے پروگرام کی لانچنگ کے بعد ملنے والی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ غیر ممالک سے بھی پیغامات آنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے، جو ہمارے اس تجربے کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ فلم میکر اونیش راجونشی نے اردو کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس شیریں زبان کو آج بھی کچھ لوگ مسلمانوں کی زبان کہہ کر اس کا دائرہ محدود کر دیتے ہیں۔ اس لیے پروگرام کے ساتھ ایسے پرومو بھی لانچ کیے گئے جن میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ راجونشی نے آگے بتایا کہ یہ پہلا پروگرام ہے جس میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں اور ساتھ ہی رومن اور ہندی میں ہر شعر کو صحیح تلفظ کے ساتھ بھی فوکس میں رکھا گیا ہے تاکہ کسی کو شعر کے مطلب سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 14 ستمبر 2018

دھلی:

اردو-ہندی کا لسانی رشتہ

نئی دھلی: موجودہ دور میں قومی سطح پر اردو اور ہندی میں وہ دشمنی نہیں ہے جو ملک کے آزاد ہونے کے بعد سامنے آئی تھی۔ ہمیں اردو اور ہندی کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے کیونکہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کی دو سگی بیٹیاں ہیں۔ اس بات کا اظہار اردو کے معروف پروفیسر محمد صادق نے کیا۔ وہ غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام حکیم عبدالحمید کی یاد میں ’اردو ہندی کے لسانی رشتہ‘ لیکچر کے موقعے پر خطاب کر رہے تھے۔ تقریب میں اپنے صدارتی خطاب میں غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اردو کا سب سے بڑا حسن اس کی ہندوستانیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں زبانوں کا مسئلہ کافی الجھا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو کو ہمارے ملک میں صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ بات بالکل درست نہیں ہے کیونکہ اردو ہندوستان میں ہی پھلی پھولی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب میں جو مسلمان رہتا ہے وہ پنجابی بولتا ہے، کیرالہ میں رہنے والا مسلمان ملیالم بولتا ہے، تمل ناڈو میں رہنے والا مسلمان تمل بولتا ہے، تقریب کے آغاز میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری عقیل احمد نے سبھی مہمانان کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمید کی زندگی اور اردو کی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 16 ستمبر 2018

رضیہ سجاد ظہیر صدی پر خصوصی لیکچر

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں رضیہ سجاد ظہیر صدی تقریبات کے سلسلے میں خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے رضیہ سجاد ظہیر کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے پُر مغز خطبہ پیش کیا۔ سینٹر آف انڈین لینگویجز کے سابق چیئر پرسن پروفیسر انور پاشا نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ رضیہ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کو یاد کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مشہور ہندی کوی اور ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئر پرسن پروفیسر گوبند پرساد نے سینٹر کی جانب سے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ اردو کے مشہور ناول و افسانہ نگار جوگندر پال مرحوم کی صاحب زادی، انگریزی کی پروفیسر ڈاکٹر سکریتا پال کی صدارت میں منعقد اس پروگرام میں بطور مہمان خصوصی ادیب و ناقد پروفیسر اسرائیل رضا نے شرکت کی۔ پروفیسر اسرائیل رضا نے اپنی تقریر میں اس عہد کو یاد کیا جس عہد میں رضیہ سجاد ظہیر جیسی خواتین ادب تخلیق کر رہی تھیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے رضیہ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے کئی اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ پروفیسر فاطمی نے اس بات پر فخر اور اطمینان کا اظہار کیا کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کی آخری بہاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ انھوں نے رضیہ سجاد ظہیر کے کئی افسانوں کا خوبصورت تجزیہ بھی پیش کیا۔ پروفیسر انور پاشا نے رضیہ سجاد ظہیر کی تمام ادبی تحریروں کو دوبارہ منظر عام پر لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب نئی نسل کے نقادوں کو رضیہ سجاد ظہیر کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا چاہیے۔ پروفیسر ثروت خان نے اپنا افسانہ ’انکشاف‘ بڑے دلکش انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے پروگرام کی نظامت کی۔ ڈاکٹر سکریتا پال نے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر علی احمد فاطمی کے لکچر کی بھرپور تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر فاطمی کا لکچر اس قدر آسان اور دلکش تھا کہ غیر اردو داں خواتین و حضرات نے بھی غور سے سنا اور محظوظ ہوئے۔ پروگرام کے آخر میں پروفیسر انور پاشا نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 13 ستمبر 2018

ملک محمد جائسی کی پدماوت اور تصوف

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام نظام سالانہ خطبات بعنوان ’ملک محمد جائسی کی پدماوت اور تصوف‘ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موضوع پر خصوصی خطبہ پروفیسر ہریش ترویدی، شعبہ انگریزی، دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر ظہیر الحسن جعفری، سابق صدر، شعبہ تاریخ، دہلی یونیورسٹی نے کی۔ اپنی استقبالیہ تقریر میں پروفیسر ابن کنول، صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی نے کہا کہ شعبہ اردو میں نظام سالانہ خطبات کا طویل سلسلہ ہے۔ 1966 میں اس شعبے کے بانی پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے دور صدارت میں اس کا آغاز ہوا۔ پہلی مرتبہ اس پروگرام میں خواجہ غلام السیدین نے خطاب کیا۔ 1966 سے اب تک ملک کی نامور شخصیات نے یہ خطبات پیش کیے ہیں۔ اپنے خصوصی خطاب میں پروفیسر ہریش ترویدی نے کہا کہ شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے 1966 سے اب تک نظام سالانہ خطبات کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ پدماوت پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی تمام اسکرپٹ نستعلیق میں لکھی گئی۔ اس لیے پدماوت کو سب سے پہلے پڑھنے کا حق نستعلیق یعنی اردو والوں کا ہے۔ اردو و ہندی میں یکسانیت بہت اہم بات ہے۔ اردو و ہندی ادب ایک ہی ماحول میں ایک ہی ہوا پانی سے تخلیق ہوا ہے۔ پدماوت کی ابتدا بابر کے زمانے میں ہوئی لیکن تکمیل شیر شاہی عہد میں ہوئی ہے۔ پدماوت میں دراصل فلسفہ وحدۃ الوجود کو پیش کیا گیا ہے۔ فلسفہ وحدۃ الوجود تکثیری معاشرے میں جینے

کا سلیقہ سکھاتا ہے، کبیر اور حضرت بابا فرید کے یہاں خالص وحدت موجود ہے۔ ان ہندوستانی ایپک کتابوں کا سلسلہ جاکر مثنوی مولانا روم سے مل جاتا ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی اور شکریہ شعبے کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 ستمبر 2018

شہپر رسول کے اعزاز میں تقریب

نئی دھلی: ''شہپر رسول کی شاعری کو کسی ازم کسی

رجحان یا نظریے کا پابند قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وہ شاعری کی آفاقی روایات کے امین ہیں۔ ان کی شاعری ہمیں میر و غالب کی یاد تو دلاتی ہے، لیکن وہ ان کے خوشہ چیں نہیں، بلکہ انھوں نے ان سے مستفیض ہوکر ایک نیا تخلیقی چراغ روشن کرتے ہوئے اپنا چہرہ اور اپنی آواز دونوں کو دریافت کرلیا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے ٹیگور ہال، دیار میر، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر شہپر رسول کے اعزاز میں منعقد کیے گئے 'ایک شام: ایک چہرے ایک آواز کے نام' پروگرام میں کیا۔ انھوں نے 'شاعری کی آفاقی روایات کا امین شہپر رسول' کے عنوان سے وقیع اور پرمغز مقالہ پیش کرتے ہوئے شہپر رسول کی شاعری کی داخلی ساخت، لفظیاتی نظام اور فکری ارتعاشات پر روشنی ڈالی۔ پروگرام میں پروفیسر خالد محمود نے 'قصہ شہپر رسول کا' کے عنوان سے خاکہ پیش کیا۔ اس خاکے میں نہ صرف شہپر رسول کا چہرہ، سراپا اور شخصیت کا نہایت شگفتہ اسلوب میں احاطہ کیا گیا ہے بلکہ اس میں شعبہ اردو کی پوری ادبی اور تہذیبی فضا متحرک تصویر بن گئی ہے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ شہپر رسول کے یہاں وسیع المشربی کی خصوصیت بہت اہم ہے اور ان کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ڈانڈے تصوف، انسان دوستی اور خلوص و رواداری سے جا ملتے ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ شہپر رسول جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ پروفیسر احمد محفوظ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ میں ثروت مند علمی، ادبی اور تہذیبی ماحول کے فروغ میں طلبا اور اساتذہ کے ساتھ پروفیسر شہپر رسول کا اہم کردار ہے۔ اس موقعے پر صاحب اعزاز پروفیسر شہپر رسول نے سامعین کو اپنے تازہ کلام سے نوازا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد مبشر نے انجام دیے۔ پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر سید تنویر حسین، تبسم حیات، ڈاکٹر ثاقب عمران اور اس اعزازی تقریب کے روح رواں کنوینر ڈاکٹر عادل حیات نے گلدستے سے مہمانوں کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 ستمبر 2018

متین طارق باغپتی: فن اور شخصیت

نئی دھلی: ضیاء انصاری: متین طارق باغپتی نثر نگاری، شاعری، بچوں کے ادب میں مقبول ہیں ہم بھی ان کو کافی

قریب سے جانتے ہیں اور ان کی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں۔ متین طارق پر گفتگو تو ہوئی ہے، لیکن جس قدر ہونی چاہیے وہ نہیں ہوئی کیوں انھوں نے روایت کو قائم رکھا، یہی نہیں بلکہ وہ علامہ اقبال اور حالی جیسی عظیم شخصیات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کے موجودہ صدر دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے جماعت اسلامی ہند کے سمینار حال میں منعقد ایک روزہ نیشنل سمینار بعنوان 'متین طارق باغپتی: فن اور شخصیت' پر اپنے صدارتی خطبہ میں کی، سمینار میں صدر مکرم کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی شعبہ اردو کے پروفیسر ابن کنول نے بھی شرکت کی، جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اردو کے پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر کوثر مظہری، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی شریک ہوئے۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ماہنامہ آجکل و یوجنا کے مدیر ابرار رحمانی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے بھی شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول نے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ متین طارق نے سیرت پر کافی کام کیا ہے اور سیرت کو منظوم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج یہاں ان کی شخصیت اور فن پر جو مقالے پیش کیے گئے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ متین طارق ایک اہم اور بڑی شخصیت کے حامل تھے اور ان پر پورے دن کا سمینار منعقد کیا جانا چاہیے تھا۔ مہمان ذی وقار پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ متین طارق ایک اہم اور بڑے شاعر، تخلیق کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی انسان تھے۔ اس کے علاوہ پروفیسر کوثر مظہری اور ابوبکر عباد، ابرار رحمانی نے بھی متین طارق کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر متین طارق باغپتی: فن اور شخصیت کتاب کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ مہمانوں کے خطاب سے قبل ریسرچ اسکالروں نے 'متین طارق باغپتی: فن اور شخصیت' پر مقالے پیش کیے۔ سمینار کے اختتام پر متین طارق کے صاحب زادے ڈاکٹر ذکی طارق نے کلمات تشکر ادا کیے جبکہ ڈاکٹر حامد علی اختر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور نظامت خان رضوان نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 ستمبر 2018

اترپردیش:

معروف ایرانی اسکالر پروفیسر احسان اللہ کو استقبالیہ

الہ آباد: شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی میں بنیاد سعدی، ایران کے مشہور و معروف استاد پروفیسر احسان اللہ شکر اللہی تشریف لائے۔ وہ ان دنوں رئیس مرکز تحقیقات فارسی، ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی ہیں۔ واضح ہو کہ الہ آباد

یونیورسٹی کا شعبہ عربی و فارسی 1872 سے قائم ہے۔ حال کے دنوں میں شعبے کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ملک اور بیرون ملک کے اسکالرس نے اس شعبے کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ پروفیسر شکر اللٰہی کی آمد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر صالحہ رشید نے طلبا کے ہمراہ ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ انھوں نے تقریباً تین گھنٹے شعبے میں گزارے۔ صدر شعبہ کو انھوں نے چار زبان فارسی، انگریزی، اردو اور ہندی میں لکھی ہوئی لغت اور چند مفید کتابیں تحفے میں پیش کیں۔ اس کے بعد پروفیسر احسان اللہ شکر اللٰہی نے طلبا کو خطاب کیا۔ فارسی زبان کی اہمیت اور افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ جس نے فارسی زبان سیکھ لی اسے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے اور جسے ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہے اسے فارسی زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔ آخر میں انھوں نے دور حاضر کے مشہور شاعر پرویز ناتل خانلری کی طویل نظم کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا جسے سامعین نے بے انتہا پسند کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 ستمبر 2018

ملکۂ غزل بیگم اختر کے نام سے میوزیم کی تعمیر

فیض آباد: اتر پردیش کے فیض آباد میں 'ملکۂ غزل' بیگم اختر کی یاد میں ان کے نام پر ایک میوزیم اور اکیڈمی

قائم کی جائے گی۔ پانچ کروڑ روپے کی لاگت سے بننے والا میوزیم اور اکیڈمی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اودھ یونیورسٹی کے تحت ہوگی اور اس میں آٹھ آڈیٹوریم ہوں گے۔ یونیورسٹی کی ایگزیکیٹیو کونسل کے اوم پرکاش سنگھ نے 'یو این آئی' کو بتایا کہ یونیورسٹی نے اس کے لیے 10 ہزار مربع فٹ زمین دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ فیض آباد میں اس عظیم گلوکارہ کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ میوزیم اور اکیڈمی یونیورسٹی کے تحت ہونے کے ساتھ ایک آزاد یونٹ ہوگی اور ایک اسٹیئرنگ کمیٹی اس کی نگرانی کرے گی۔ انھوں نے بتایا کہ موسیقی کے سات سروں کے نام پر سات بلاک بنیں گے اور ہر بلاک میں 250 سیٹوں کا ایک آڈیٹوریم ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک بڑا آڈیٹوریم بھی ہوگا۔ اس طرح کل آٹھ آڈیٹوریم ہوں گے جن میں موسیقی اور آرٹ کے پروگرام ہوں گے۔ مسٹر سنگھ نے بتایا کہ یہ سنگیت کلا اکیڈمی ایشیا کی سب سے بڑی اکیڈمی ہوگی جس میں نوجوان فنکاروں کو تربیت دی جائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ بیگم اختر کے نام پر میوزیم میں بیگم اختر سے جڑی چیزیں ہوں گی۔ ان اداروں کی تعمیر کے لیے ایک ایڈوائزری کمیٹی تشکیل کی گئی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 24 ستمبر 2018

علم الحساب سائنس اور زبان کا باہمی رشتہ

وارانسی: انسانی ضرورتوں میں زبان کی حیثیت بنیادی

ہے، اسی لیے زبان سیکھنے اور سکھانے کی ایک طویل انسانی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ زبان کے ساتھ ہی ریاضی کی ابتدا ہوئی ہوگی۔ لین دین اور ماہ و سال کا حساب، اپنے مال و دولت اور جانوروں کو شمار کرنے اور ان کی کمی و بیشی کو یاد رکھنے کا عمل بھی انسانی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح زبان اور ریاضی کے ساتھ سائنس کا ارتقا بھی انسانی زندگی کے ساتھ ہوا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ زبان، سائنس اور ریاضی الگ الگ ہیں، انسانی تاریخ سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔ متذکرہ خیالات کا اظہار سائنس اور ٹکنالوجی کے معروف محقق اور شعبہ انجینئرنگ، آئی آئی ٹی بی ایچ یو کے استاد پرفیسر راجیو منڈل نے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ خصوصی لیکچر 'بعنوان علم الحساب، سائنس اور زبان' کا باہمی رشتہ کے تحت کیا۔ انھوں نے زبان، ریاضی اور سائنس کی مختلف اقسام کا تذکرہ کرتے ہوئے زبان کی اہمیت، زبان کو فروغ دینے میں سائنس کا کردار اور ریاضی نیز سائنس کو سمجھنے کے لیے زبان کی اساسی ضرورتوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ وقت میں زبان سائنس سے الگ ہوکر زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح دنیا کا کوئی علم زبان کے بغیر سکھانا ناممکن ہے۔ زبان کا بنیادی کام اظہار اور ترسیل ہے۔ سائنسی مضامین یا ریاضی کے فارمولے پڑھنے پڑھانے کے لیے کسی ایک زبان کا علم ہونا ضروری ہے۔ پروگرام کی ابتدا میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے تحت منعقدہ مختلف لیکچرز کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ساری کاوشیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ طلبہ کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو صیقل کیا جاسکے۔ جلسے کی صدارت شعبۂ ہندی کے سابق صدر پروفیسر بلراج پانڈے نے کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے اردو ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں سائنسی مضامین کی خاطر خواہ عدم موجودگی پر افسوس کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے کی جبکہ اظہار تشکر کی رسم شعبہ کے استاد جناب عبدالسمیع نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2018

مجروح سلطانپوری کے صد سالہ یومِ پیدائش پر تقریب

لکھنؤ: معروف ترقی پسند شاعر مجروح سلطانپوری کے صد سالہ یوم پیدائش پر مہیلا پی جی کالج امین آباد کے شعبۂ اردو میں ایک تقریب پرنسپل نشا گپتا کی سرپرستی میں ہوئی۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر بشریٰ بانو نے کہا کہ مجروح سلطانپوری ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور ترقی پسند تحریک میں ایک فعال رکن کی حیثیت سے ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی شاعری احتجاج و انقلاب کے خوبصورت امتزاج سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے شعبۂ کیمسٹری کی ڈاکٹر قدسیہ بانو نے کہا کہ مجروح نے جب تخلیقی ادب کے افق پر قدم رکھا تو ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا۔ اس کے باوجود مجروح

نے ترقی پسندی کی روایت سے الگ اپنی منفرد شناخت قائم کرتے ہوئے غزل کے ذریعے ہی ترقی پسندی کے تمام عناصر کو شعری قالب میں ڈھالا۔ انھوں نے کہا کہ مجروح نے اپنی شاعری کے ذریعے قومی یکجہتی، مساوات اور جمہوری قدروں کی ترجمانی کی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مجروح صاحب نے اپنی غزلوں کے ذریعہ نہیں بلکہ فلمی نغمہ نگار کے طور پر عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو کی طالبات نے بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اکتوبر 2018

'افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری' پر سمینار

لکھنؤ: حیات اللہ انصاری کی شخصیت مختلف الجہات تھی، صحافی اور ادیب ہونا ان کی اہم ترین صفات تھیں، کمیونزم

کی مخالفت کے باوجود وہ ترقی پسند تھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر علی احمد فاطمی الہ آباد یونیورسٹی نے کیا۔ 9 ستمبر کو احساس ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر فاؤنڈیشن کے تحت کیفی اعظمی اکیڈمی کے ہال میں 'افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری' کے موضوع پر منعقد قومی سمینار کے افتتاحی خطبے میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ پروگرام کا انعقاد اتر پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر صغیر افراہیم اور نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کا پہلا افسانہ 'بڈھا سود خور' 1930 میں شائع ہوا۔ یہ عین جوانی میں لکھا گیا افسانہ تھا۔ عالمِ شباب میں بھی حیات اللہ انصاری نے رومانی و عشقیہ موضوعات کے بجائے سماجی موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے حیات اللہ انصاری کے ناولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ حیات اللہ انصاری کا اسلوب سپاٹ و سادہ ہوتا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ ان کا بظاہر یہ سپاٹ و سادہ اسلوب بڑا منجھا ہوا اسلوب ہے۔ ان کے سادہ اندازِ بیان میں بھی بڑی دلکشی اور معنی خیزی ہوتی ہے۔ وہ مواد اور بیان دونوں اعتبار سے ایک متمول قلمکار و فنکار تھے۔ سینئر صحافی احمد ابراہیم علوی نے کہا کہ حیات اللہ انصاری کے افسانوں میں جو حقیقت نگاری ہے وہ ان کی زندگی کے وہ تجربے اور تلخیاں ہیں جو انھوں نے اپنی غربت کے دنوں میں بہت قریب سے دیکھی تھیں۔ اس کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔

اخیر میں صدر سمینار پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے خطبہ صدارت میں حیات اللہ انصاری کے افسانوی ادب پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا بھی فنی تجزیہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہنا کہ حیات اللہ انصاری پریم چند یا کسی اور ادیب سے متاثر تھے، درست نہیں ہوگا۔ حیات اللہ انصاری راشد الخیری کو بہت پسند کرتے تھے لیکن اپنی کہانیوں میں انھوں نے ان کی بھی اتباع نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ حیات اللہ انصاری نے اردو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور اس سمینار میں ان کے کارناموں پر تحقیق کے لیے نئی جہتیں اور موضوعات دیے ہیں۔ سہ ماہی 'امکان' کے نائب ایڈیٹر پرویز ملک زادہ نے اخیر میں شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 ستمبر 2018

قدرت اللہ شہاب کی فکشن نگاری

میرٹھ: قدرت اللہ شہاب ہند و پاک کا ایک معتبر نام ہے جنھوں نے اپنے سیاسی و ادبی اور سماجی شعور سے برصغیر کے سماجی، ادبی اور سیاسی طبقے میں اپنے لیے ایک الگ پہچان بنائی۔ آپ کی خودنوشت 'شہاب نامہ' ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستانی ادبی حلقوں میں آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ باتیں پروفیسر شہاب

عنایت ملک نے کہیں جو شعبہ اردو میں منعقد گیسٹ لیکچر بعنوان 'قدرت اللہ شہاب کی فکشن نگاری' میں مہمان مقرر کی حیثیت سے اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ اس تقریب کی صدارت کے فرائض پروفیسر اسلم جمشید پوری، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دی۔ جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر معروف شاعرہ سنیتا رینا اور مہمان اعزازی کے بطور معروف شاعر طالب زیدی شریک ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 ستمبر 2018

اردو صحافت اور تحریک آزادی

سکندرآباد: انجمن ترقی اردو ہند شاخ بلند شہر کے زیر اہتمام اردو صحافت اور تحریک آزادی پر ایک پروقار سمینار کا انعقاد ادیب منزل اسلام آباد میں کیا گیا۔ ضلع کی ممتاز ملی اور سیاسی شخصیت اور سیانہ میونسپل بورڈ کے سابق چیئرمین بدرالاسلام نے صدارت کی اور نظامت کے فرائض ایڈووکیٹ صہیب احمد خاں نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطاب میں بدرالاسلام نے کہا کہ 1857 سے لے کر 35-1930 تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جنگ کرنے کا سہرا زیادہ تر اردو اخبارات کے سر رہا۔ 1857 میں اردو صحافت نے جو بے مثال کردار ادا کیا اس کو تمام مورخین نے خراجِ تحسین پیش کیا۔ اردو صحافت کو جنگ آزادی کا ہراول دستہ قرار دیا۔ سمینار کے مہمان خصوصی اور بگراسی میونسپل بورڈ کے سابق چیرمین آفاق الرحیم خاں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ 1882 میں کولکاتہ سے جام جہاں نما کی اشاعت سے لے کر ملک کی آزادی تک اردو صحافت کا کردار بلاشبہ روشن اور تابندہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات نے تحریک آزادی کے دوران جو انقلابی کردار ادا کیا ہے اسے تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھا جانا چاہیے، کیونکہ اردو صحافیوں نے قلم کی آزادی کی قیمت اپنے سروں کا نذرانہ پیش کر کے ادا کی تھی۔ اس موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2018

بہار:

موجودہ طبی مسائل: اسباب اور حل

پٹنہ: علم طب یونانی کی معنویت آج بھی برقرار ہے اور

اب لوگ دوبارہ اس طرف رخ کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی سائنٹفک تجارت کی جائے اور اسے فروغ حاصل ہو۔ پروفیسر حکیم شاکر جمیل، جامعہ ہمدرد نے علم طب کی معنویت اور اس کی اہمیت سے روشناس کراتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ کیورا آیورویدک اینڈ یونانی لمیٹڈ سدرا ایجوکیشنل اینڈ ہیلتھ کیئر سوسائٹی اور کائنات انٹر پرائزیز کے زیر اہتمام 'موجودہ طبی مسائل اسباب اور حل' کے موضوع پر بہار اردو اکادمی کے کانفرنس ہال میں منعقد سمینار و ورک شاپ سے وہ خطاب کر رہے تھے۔ پروفیسر شاکر جمیل نے کہا کہ طب یونانی میں نئی تحقیقات جاری ہیں اور عربی و فارسی کے لٹریچر اردو اور دیگر زبانوں میں ترجمے کیے جا رہے ہیں تا کہ اسے زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچایا جاسکے اور اس کا فائدہ انھیں حاصل ہو۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ انگریزی کی دواؤں کا استعمال کرنے کے بعد لوگ طب اور حکمت سے رجوع کر رہے ہیں اور اس کا انھیں خاطر خواہ فائدہ بھی حاصل ہو رہا ہے۔ پروگرام کے سرپرست پروفیسر حکیم سید فضل اللہ قادری نے کہا کہ طب یونانی جدید تقاضے کے تحت بخوبی کام انجام دے رہا ہے اور اس کے بڑے روشن امکانات ہیں۔ آیوش کے تحت ہومیوپیتھی، آیوروید اور یونانی طب مشترکہ طور پر اس حکمت عملی کو فروغ دے رہے ہیں اور جدید تقاضے کے مدنظر کامیاب دوائیں بنا رہے ہیں جس کا کوئی سائڈ افیکٹ نہیں ہے۔ مہمان اعزازی نے کہا کہ طب یونانی ایک بڑی حکمت عملی ہے جو ہمارا ورثہ ہے جس کا تحفظ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آج حکومت بھی آرگینک فرٹیلائزر اور آرگینک دواؤں کی بات کر رہی ہے، اس لیے ہمیں اس کی اہمیت سمجھنی چاہیے اور اسے فروغ دینے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اس موقعے پر آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے جنرل سکریٹری حکیم سید احمد خاں، پروفیسر عبدالناصر وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اکتوبر 2018

مہاراشٹر:

کتاب آپ کے گھر پر

پربھنی: پربھنی میں منعقدہ ایک روزہ سیمینار و مشاعرے کی مناسبت سے باذوق قارئین کے لیے کتابوں کی نمائش

کا بھی اہتمام کیا گیا۔ واضح رہے کہ پربھنی کے شالیمار ہال میں ادارہ ادب اسلامی ہند، اورنگ آباد کی جانب سے ایک روزہ علاقائی ادبی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر عبدالعظیم کے اصرار پر مہاراشٹر کے مشہور اشاعتی ادارے مرزا ورلڈ بک ہاؤس اورنگ آباد کو کانفرنس میں کتابوں کی نمائش کے لیے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ بک ہاؤس کے ڈائریکٹر اور ریاست میں اردو زبان و ادب کے تحفظ و بقا کے لیے سرگرم مرزا عبدالقیوم ندوی نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ اس کانفرنس میں پربھنی کے باذوق حضرات نے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آج بین الاقوامی تجارتی ادارے اپنی مصنوعات کو گھر گھر پہنچا رہے ہیں، Free home service بھی دے رہے ہیں، شہر کے بازاروں، چوراہوں، میلوں میں اپنے اسٹال لگا رہے ہیں۔ ہمیں بھی انہی کے طرز پر عوام میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے اسی طرح کی کوششیں کرنی ہوں گی۔ فاران ایجوکیشن سوسائٹی کے ذمہ دار فیروز سر نے اپنے ادارے کے لیے 5000 ہزار روپے کی کتابیں خریدیں اسی طرح مشہور سماجی شخصیت ڈاکٹر انور علی شاہ نے بھی اپنے دار المطالعہ کے لیے 7000 روپے کی کتابیں خریدیں۔ اسی طرح کثیر تعداد میں طلبا نے بھی کتابیں خرید کر اپنی مادری زبان اور کتابوں سے محبت کا ثبوت دیا۔ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے سرگرم مرزا عبدالقیوم ندوی نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ طلبا میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن اورنگ آباد کی جانب سے کئی پروگرام چلائے جاتے ہیں، ملک کی مشہور شخصیات کے یوم پیدائش و وفات پر مختلف پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے اور طلبا کو ان کی زندگی پر شائع کتابوں کو مفت میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں انہوں نے ایک نیا و انوکھا طریقہ اختیار کیا جس کا نام تھا 'چلو لائبریری کی سیر کو' اس کے تحت اسکولوں کے طلبا کو شہر کی بڑی بڑی لائبریریوں میں لے جایا جاتا ہے، جہاں طلبا دو تین گھنٹے گزارتے ہیں اور کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا۔

پریس ریلیز: مرزا عبدالقیوم ندوی فاؤنڈیشن، مہاراشٹر، 3 اکتوبر 2018

مغربی بنگال

عصر حاضر میں اردو تحقیق مسائل اور وسائل

کلکتہ: مشہور تاریخی ادارے مسلم انسٹی ٹیوٹ میں نئی نسل میں تحقیقی رجحان میں اضافے کے لیے یک روزہ نیشنل ریسرچ اسکالر سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ریسرچ اسکالروں نے 'عصر حاضر میں اردو تحقیق کے مسائل اور وسائل' پر کھل کر بات کی۔ اردو کے معروف ادیب و دانشور ابوذر ہاشمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق کے لیے ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں دلچسپی ہو اور جس موضوع کا حق ادا کیا جاسکے۔ انھوں نے موجودہ دور میں اردو تحقیق کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس وقت جو اردو میں کثیر مقدار میں تحقیقی مقالات سامنے آ رہے ہیں، ان کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ادبی تحقیق اپنے معیار کی تلاش میں ہے اور جس محنت و مشقت کی ضرورت تحقیق کو درکار ہے وہ کیفیت آج کے ریسرچ اسکالر میں ناپید ہے۔ نثار احمد سکریٹری مسلم انسٹی ٹیوٹ نے کہا کہ سرزمین بنگال کی تاریخ میں یہ پہلا سمینار ہے جس میں تمام مقالہ نگاروں کا تعلق ریسرچ سے ہے۔ سمینار کی صدارت

کررہے پروفیسر منصور عالم نے کہا کہ مقالہ نگاروں نے جس خوبصورت انداز میں مقالات پیش کیے وہ قابل رشک ہے اور جس طرح کی خوداعتمادی و بے باکی کا مظاہرہ انھوں نے کیا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے طالب علمی کے زمانے میں نہیں تھیں۔ انھوں نے کہا کہ وہی اسکالر اعلیٰ اور بہترین تحقیق کرسکتا ہے، جو فارسی زبان اور عربی کے مبتدیات سے واقف ہو۔ مختلف یونیورسٹیز کے ریسرچ اسکالروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دونوں نشستوں کی نظامت ڈاکٹر نوشاد مومن نے کی۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 4 اکتوبر 2018

پروفیسر عبدالرؤف کی حیات وخدمات

کلکتہ: مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے پروفیسر عبدالرؤف کی حیات وخدمات پر یک روزہ قومی سمینار کا اہتمام مولانا آزاد آڈیٹوریم میں ہوا۔ مقررین نے انھیں کثیرالجہات قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی کتابوں کی نئی تراش خراش، ادارت نگاری مع حواشی دوبارہ شائع کی جائیں۔ اپنے کلیدی خطبے میں جے این یو دہلی کے پروفیسر معین جینا بڑے نے کہا کہ 1857 یعنی پہلی جنگ آزادی کے دور کو اردو زبان کا کلاسیکل زمانہ کہا جاتا ہے۔ اردو زبان دہلی اور لکھنؤ سے کلکتہ پہنچتی ہے۔ وہ شہر جس نے اردو کو فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے نئی زبان دی۔ یہاں سے یہ زبان لاہور پہنچی جس نے اسے نیا موضوع دیا۔ سفرِ منتقلی کا یہ دور اردو اور کلکتہ کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عبدالرؤف نے ماقبل فورٹ ولیم اور مابعد فورٹ ولیم پر کام کیا ہے۔ انھوں نے محمد شاہ کے ایک عہد کے شاعر جعفر علی خان ذکی کی 210 مثنوی پر کام کیا۔ اس کی ایڈیٹنگ کرکے دوبارہ شائع کیا۔ انھوں نے امریکی شاعر والٹ وہیٹ من (Walt Whitman) کی 52 نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر محمد فاروق انصاری (این سی ای آر ٹی) نے کہا کہ عبدالرؤف استاد تھے اور اپنے شاگردوں کو قریب رکھا کرتے تھے۔ وہ کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ اس طرح کا سمینار ان کی ادبی اور عملی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں اکادمی کے عبوری نائب چیئرمین سید محمد شہاب الدین حیدر نے کہا کہ آج بھی ایسی بہت سی آنکھیں ہیں جنھوں نے عبدالرؤف صاحب کو دیکھا ہے۔ وہ اخلاص کے پیکر تھے، باوقار استاد تھے۔ وہ ادیب، شاعر اور محقق کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی تھے۔ روزانہ ہند اور آزاد ہند سے ان کا برسوں کا واسطہ رہا۔ نقابت کی ذمے داری ڈاکٹر غلام سرور نے بحسن وخوبی انجام دی۔ محمد راشد، غلام معین الدین، ڈاکٹر اقلیمہ خاتون، ڈاکٹر مشتاق انجم، ڈاکٹر شاہد اختر، ڈاکٹر ایس بی آئی حیدر، ڈاکٹر عمر فاروق انصاری اور اشفاق احمد نے اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کلکتہ، 1 اکتوبر 2018

یک روزہ نیشنل ریسرچ اسکالر سمینار

کلکتہ: 2 اکتوبر کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کے زیرِ اہتمام یک روزہ نیشنل ریسرچ اسکالر سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ یہ پروگرام تین نشستوں پر مشتمل تھا، کلیدی خطبہ پیش کرتے

ہوئے جناب ابوذر ہاشمی نے عصرِ حاضر میں اردو تحقیقی مسائل اور وسائل پر بھرپور روشنی ڈالی اور ریسرچ اسکالر کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے جن میں آپ لوگوں کی دلچسپی ہو؛ نیز انھوں نے اردو کے مشہور محققین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح انھوں نے تمام طرح کی مصروفیات کو چھوڑ کر محنت، لگن اور جانفشانی سے تحقیق کے میدان میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے موجودہ دور میں اردو تحقیق کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس وقت جو اردو میں کثیر مقدار میں تحقیقی مقالات سامنے آرہے ہیں۔ ان کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ادبی تحقیق اپنے معیار کی تلاش میں ہے اور جس محنت و مشقت کی ضرورت تحقیق کو درکار ہے وہ کیفیت آج کے ریسرچ اسکالر میں ناپید ہے۔ خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے جناب نثار احمد سکریٹری مسلم انسٹی ٹیوٹ نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ نیشنل ریسرچ اسکالر سمینار میرے خیال میں سرزمین بنگال کی تاریخ میں پہلا سمینار ہے جس میں تمام مقالہ نگاروں کا تعلق ریسرچ سے ہے۔ صدارتی کلمات کریم رضا مونگیری نے ادا کیے جس میں انھوں نے اس پروگرام کے تعلق سے خوشی کا اظہار کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر منصور عالم نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آج مقالہ نگاروں نے جس خوبصورت انداز میں اپنے مقالات پیش کیے وہ قابل رشک ہیں اور جس طرح کی خوداعتمادی و بے باکی کا مظاہرہ کیا یہ چیزیں ہمارے طالب علمی کے زمانے میں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر افتخار احمد نے اصلی متون و ماخذ پر زور دیا۔ ڈاکٹر نعیم انیس نے کہا کہ تمام مقالے موضوع کے متعلق تھے اور واقعی تمام نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا۔ اس نشست میں جناب امیر حمزہ دہلی یونیورسٹی، محمد رکن الدین جواہر لال یونیورسٹی، نہال افروز، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد، شاداب شمیم دہلی یونیورسٹی، جرار احمد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور امام الدین دہلی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ظہرانے کے بعد دوسرے سیشن کا آغاز ہوا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر عمر غزالی نے کی۔ تمام مقالات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سیشن کے سبھی مقالے پرمغز تھے اور تحقیق کے مسائل پر اس سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر دبیر احمد نے کہا کہ ریسرچ اسکالروں نے بہت خوبصورتی سے اپنی بات اور مسائل کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس نشست میں جناب عبدالحلیم انصاری بردوان یونیورسٹی، محمد راشد کلکتہ یونیورسٹی، محمد شفیق الحسن شہاب، ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش، محترمہ طلعت فاطمہ عالیہ یونیورسٹی کلکتہ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ دونوں اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نوشاد مومن نے بہ حسن وخوبی انجام دی۔ اخیر میں انھوں نے شرکا اور طلبا و طالبات کا شکریہ ادا کرکے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' کلکتہ، 3 اکتوبر 2018

ہریانہ:

بھوانی میں مشاعرے کا انعقاد

چنڈی گڑھ: ہریانہ اردو اکادمی پنچ کولہ اور بزم ادب ساہتیہ سنگم کے تعاون سے ضلع بھوانی میں مشاعرے کا

انعقاد کیا گیا۔ یہ بھوانی کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ جب ہریانہ اردو اکادمی کے اشتراک سے مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے انعقاد سے بھوانی کے لوگوں بالخصوص شاعروں میں ایک خوشی کی لہر تھی۔ اس موقعے پر بہ نفس نفیس ڈاکٹر نریندر کمار اپنیو، ڈائرکٹر ہریانہ اردو نے خود شرکت کی اور لوگوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ ہریانہ میں

اردو کے کسی بھی قلم کار اور شاعر و ادیب کا استحصال نہیں ہوگا۔ اردو اکادمی خاص طور سے ہریانہ کے لوگوں کے لیے ہی قائم کی گئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اکادمی زبان وادب کی ترقی وفلاح کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی اور ان شاء اللہ کرتی رہے گی، ہمیں سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا اور پورے ہریانہ کے آخری چھور تک پہنچنا ہے۔ یہی ہمارا مشن ہے۔ مشاعرے میں شریک شرکا اور شعرائے کرام نے اکادمی کے ڈائرکٹر کا گلدستوں سے استقبال کیا۔ اس موقعے پر بھوانی کے بزرگ ومعروف شاعر وجیندر غافل نے کہا کہ اکادمی درحقیقت مبارک باد کی مستحق ہے کہ جنھوں نے بزمِ ادب ساہتیہ سنگم کے ساتھ مل کر مشاعرے کا اہتمام کرایا نیز شاعروں سے ملاقات کرکے ان کے دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مشاعرے کے ناظم پروفیسر شیام وششٹ نے کہا کہ اردو اکادمی نے اچھی پہل کی ہے۔ مشاعرے میں لگ بھگ ایک درجن شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا جن میں وجیندر غافل، کرشن منظر، لیش کیرتی، ڈاکٹر منوج بھارت، یوگیش سمدرشی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 ستمبر 2018

اعزاز و اکرام:

کرشچین ڈبلیوٹرال اور مسٹر سنجیو صراف کو رواں سال کے 'سرسید ایکسیلنس ایوارڈ'

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے بانی سرسید احمد خاں اور ان کی تعلیمی تحریک پر کام کرنے والے ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر کرشچین ڈبلیوٹرال اور اردو کے فروغ کے لیے کام کرنے والے 'ریختہ' ویب پورٹل' کے بانی معروف سماجی کارکن اور صنعت کار مسٹر سنجیو صراف کو رواں سال کے 'سرسید ایکسیلنس ایوارڈ' کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ اس باوقار ایوارڈ کے لیے پروفیسر ٹرال کی نامزدگی عالمی زمرے اور مسٹر صراف کی نامزدگی قومی زمرے میں کی گئی ہے۔ یہ ایوارڈ 17 اکتوبر 2018 کو یومِ سرسید کے موقعے پر تفویض کیا جائے گا۔ مذکورہ ایوارڈ کے لیے عالمی زمرے میں دو لاکھ روپے کا نقد انعام دیا جاتا ہے جبکہ قومی زمرے میں ایک لاکھ روپے کی رقم بطور انعام دی جاتی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 ستمبر 2018

مناظر عاشق ہرگانوی کو 'گولڈن پرسنالٹی ایوارڈ'

فضا امام (دربھنگہ): ماہر تعلیم اور معروف ادیب کی حیثیت سے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کو فرینڈ شپ فورم، دہلی کی طرف سے Best Indian Golden

Personality Award سے سابق گورنر تری پورہ اور چھتیس گڑھ لیفٹیننٹ جنرل کے ایم سیٹھ کے ہاتھوں 25 ستمبر 2018 کو نوازا گیا۔ اس ایوارڈ میں گولڈ میڈل بھی شامل ہے۔ فرینڈ شپ فورم کی طرف سے انگریزی میں کتاب بھی شائع ہو رہی ہے جس میں پروفیسر ہرگانوی کی تفصیل مع تصویر شامل ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 27 ستمبر 2018

ڈاکٹر رضیہ پروین کو 'ڈاکٹر رادھا کشن' ایوارڈ

رام پور: تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں میں نہایت فعال اور سرگرم سماجی خدمت گار ڈاکٹر رضیہ پروین کی ادبی

کاوشوں کو سراہتے ہوئے دی انٹرنیشنل ایسوی ایشن آف لائنس کلب نے انھیں 'ڈاکٹر رادھا کشن ایوارڈ' سے سرفراز کیا ہے۔ کلب کی چیئرپرسن، ڈاکٹر رجنی رانی اگروال، ڈاکٹر پربھا شرما، انیتا اگروال اور سمن تومڑ نے انھیں سرٹیفکٹ اور انعامات سے سرفراز کیا۔ یہ انعام ڈاکٹر رضیہ کو بہتر ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی 15 ستمبر 2018

غلام نبی کمار کو 'تعمیل ارشاد ادبی ایوارڈ'

نئی دہلی: اردو زبان وادب کے نوجوان ادیب، نقاد اور صحافی غلام نبی کمار ریاست جموں وکشمیر کے مشہور و معروف اخبار روزنامہ تعمیل ارشاد کی جانب سے 'تعمیل ارشاد ادبی ایوارڈ 2018' سے نوازے گئے۔ غلام نبی کمار کا تعلق کشمیر کے قصبہ چرار شریف سے ہے۔ وہ دنوں شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ یہ ایوارڈ انھیں سری نگر کے ایک مقامی ہوٹل میں 'نگینہ انٹرنیشنل گولڈن جوبلی تقریب' کے دوران پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2018

جنید شیخ کو مثالی معلم کا ایوارڈ

سولاپور: لائنس کلب آف سولاپور (مرکزی) اور ضلع سولاپور سوشل ورک کمیٹی کے اشتراک سے یوم اساتذہ کے موقعے پر سوشل اردو ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج آف سائنس سولاپور کے معلم اور سائنسی قلم کار جنید عبدالقیوم شیخ

کو مثالی معلم کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ سولاپور یونیورسٹی کی وائس چانسلر ڈاکٹر ایم فرنولیس کے دست مبارک سے جنید شیخ کو ٹرافی، سند اور شال دی گئی۔ جنید شیخ کے ساتھ ڈاکٹر نبھا کاکڑے، ڈاکٹر دتا واگھمارے، نرمل کمار کاکڑے اور انورادھا کاجڑے کو معلم انعام سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر وائس چانسلر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معلم ہی ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرسکتے ہیں۔ اس موقعے پر لائنس کلب آف سولاپور مرکزی کے صدر وٹھل سارنگی، ضلع سولاپور سوشل ورک کمیٹی کے صدر الیاس پاٹل اور پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر شری کانت یلیگاوکر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ڈاک سے: جنید شیخ، سولاپور، مہاراشٹر 7 ستمبر 2018

مسرور جہاں کے اعزاز میں تہنیتی پروگرام

نئی دہلی: شیکھرا این جی او بہ اشتراک الیومنائی ایسوسی ایشن آف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام نہرو گیسٹ ہاؤس کے کمیٹی روم میں جمعہ 7 ستمبر 2018 مشہور و معروف اردو فکشن نگار محترمہ مسرور جہاں کے اعزاز میں ایک تہنیتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کی اور نظامت کے فرائض مشہور شاعرہ و کہانی کار محترمہ عذرا نقوی نے اپنے منفرد انداز میں انجام دیے۔ بطور مہمان خصوصی ڈاکٹر مردولا ستیش ٹنڈن صاحبہ ساکشی این جی او کی ہیڈ نے شرکت کی۔ مہمانانِ اعزازی ڈاکٹر پرویز شہریار ایڈیٹر این، سی، ای، آر، ٹی اور ڈاکٹر مظفر حسین غزالی سینئر جرنلسٹ و کالم نگار تھے۔ نامور افسانہ نگار و سابق ڈائرکٹر ڈی ڈی اردو دہلی انجم عثمانی نے محترمہ مسرور جہاں صاحبہ کا تعارف پیش کیا اور اردو ادب میں ان کی گراں قدر خدمات پر روشنی ڈالی۔ بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ نے فرمایا کہ اس وقت

مسرور جہاں کے اعزاز میں تہنیتی پروگرام

کے سارے کہانی کاروں کو جمع کیا جائے تو بھی اکیلی مسرور جہاں کا کام ان سب سے زیادہ ہے۔ وہ کم و بیش 500 کہانیوں اور 65 ناولوں کی مصنفہ ہیں۔ اس موقعے پر نعیمہ جعفری، شمع افروز زیدی اور ڈاکٹر پرویز شہریار نے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر جاوید حسن نے مسرور جہاں کے افسانے گنجی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مسرور جہاں کے اس افسانے کو فطرت انسانی کی ترجمانی کا بے باک انداز کہا۔ ڈاکٹر مظفر غزالی نے کہا کہ کہانی ایک ایسا فن ہے جو اپنے آپ کو خود لکھواتی ہے اور وہی کہانی کامیاب کہانی ہے جو اپنے کو خود پڑھوالے۔ مسرور جہاں کی کہانیاں اپنے کو خود پڑھواتی ہیں۔ 'شیکھر این جی او' کی ادبی شاخ 'تلاش' کی منتظم اور پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے مسرور جہاں کی کہانی 'سہاگن' کے اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ رخشندہ روحی نے اس بات پر زور دیا کہ قلمکاروں کی زندگی میں ان کی پذیرائی اور اہمیت پر جلسے منعقد کرنے چاہیے نہ کہ ان کی موت کے بعد۔ مہمانِ خصوصی محترمہ مردولا ٹنڈن نے اپنے دل آویز اور مشفق لب و لہجے میں کہا کہ میں حیرت زدہ ہوں کہ کوئی قلم کار اتنی زیادہ تعداد میں فن پارے کیسے تحریر کرسکتا ہے۔ میں اس عہد کی ایک بڑی اور بہترین کہانی کار کو سیلوٹ کرتی ہوں۔ آخر میں صدرِ محفل پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ادب وہی مقبولِ عام ہوتا ہے جس کی زبان سادہ، سلیس اور پراثر ہوتی ہے اور مسرور کے ادب کی بے پناہ مقبولیت ان کی سادہ اور جذبات سے بھرپور زبان میں مضمر ہے۔ آخر میں شکھر این جی او کے مینیجنگ ڈائرکٹر ندیم اختر نے تمام مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور آجی کے نائب صدر فراز خان، ایگزیکیوٹو ممبر، عاطف شیروانی وغیرہ نے اردو ادب و اردو ادب کے قلمکاروں کے تئیں اپنی عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے مستقبل میں اس طرح کی تقریبات کے انعقاد کا ارادہ ظاہر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 ستمبر 2018

رسم اجرا:

خواب

سری نگر: شمالی کشمیر کے ضلع بانڈی پورہ کے نائد کھے سوناواری میں جمعرات کو منعقد ہونے والی ایک روزہ ادبی تقریب میں ثناء اللہ ملک مخمور کے شعری مجموعہ 'خواب' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ ساگر کلچرل فورم ژکر پٹن اور جہلم بزم ادب نائد کھے کے باہمی اشتراک سے نیو کریسنٹ پبلک اسکول نائد کھے کے احاطے میں منعقد ہوئی۔ اس ایک روزہ تقریب کی صدارت معروف براڈ کاسٹر رشید نظامی نے انجام دی۔ ریڈیو کشمیر سری نگر کے سابقہ ڈائرکٹر سید ہمایوں قیصر نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 5 اکتوبر 2018

تو زندگی سنور گئی

نئی دھلی: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کی عمارت اردو گھر کے مولوی عبدالحق آڈیٹوریم ہال میں اردو دوست شاعر

سردار راجندر سنگھ اردرابہ تخلص دلدار دہلوی کے دوسرے شعری مجموعہ (تو زندگی سنور گئی) کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ تقریب میں اہل اردو نے کثیر تعداد میں شرکت کی اور دلدار دہلوی کو مبارکباد پیش کی۔ باضابطہ وش اسماعیل کے زیر اہتمام منعقد تقریب کی صدارت حلقہ تشنگان ادب کے جنرل سکریٹری سیماب سلطانپوری نے فرمائی، جبکہ نظامت کے فرائض مشہور ناظم مشاعرہ معروف رائے بریلوی نے انجام دی۔ ابتدا میں مہمانان ذی وقار سنیل وشٹ، ملک زادہ جاوید، انوسنہا، استاد ثروت جمال کا گلدستے پیش کرکے استقبال کیا گیا۔ صدر تقریب سیماب سلطان پوری نے کہا کہ اردو کا کیا مقام ہے، یہ غزل کے چاہنے اور اس کے لکھنے سننے والے بخوبی جانتے ہیں۔ اردو ہی نہیں کسی بھی زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا صحیح نہیں ہے۔ سنیل وشٹ کے مطابق اردو کے ذریعے ہم ملک میں پھیلتی جارہی تعصب کی شعلگی کو امن و آشتی کے گلوں میں بدل سکتے ہیں۔ ملک کی نمائندگی دنیا میں کرنے والی مشہور رقاصہ انوسہانے کہا میں اردو سے بہت متاثر ہوں، تمام زبانوں سے بڑھ کر اردو کی لفظیات مجھے خوشی کا احساس کراتی ہے، غزلیہ شاعری تو اور بھی مزہ دیتی ہے۔ پنکج جیسوانی و ہمنوا نے کلام دلدار دہلوی سے تقریب کو چار چاند لگائے اور بہترین غزل سرائی سے شرکا کو مسحور کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 ستمبر 2018

نقوش علی نگر: تبصرے اور تجزیے

دربھنگہ: الفاروق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام ادبستان، محلّہ گنگوارہ، پوسٹ سارا موہن پور، ضلع دربھنگہ میں 2 ستمبر 2018 کو ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب 'نقوش علی نگر: تبصرے اور تجزیے' کی رونمائی ڈاکٹر نجیب اختر (سکریٹری، فخر الدین علی احمد ٹیچرس ٹریننگ کالج، دربھنگہ) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مرتب کتاب نے اس کتاب کا پس منظر اور سبب اشاعت بیان کرتے ہوئے کہا ''جناب غلام فرید (علی نگر، دربھنگہ) نے بڑی کدوکاوش سے 'نقوش علی نگر' نامی کتاب لکھی ہے، جس میں علی نگر کی تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی وراثتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کتاب کی بڑی پذیرائی ادبی حلقوں میں ہوئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 ستمبر 2018

اوم پھٹ پھٹاک

علی گڑھ: معروف ادیب و شاعر اشوک انجم کے ڈرامائی خاکوں کا مجموعہ 'اوم پھٹ پھٹاک' کا اجرا کمشنر علی گڑھ اجے دیپ سنگھ نے کیا، مقامی اسکول میں منعقد پروقار

تقریب میں اردو و ہندی کے متعدد ادیبوں کی موجودگی میں اشوک انجم کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی اور ان کی خدمات کو سراہا گیا۔ ڈاکٹر پریم کمار نے اشوک انجم کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں سے سورج کی تپش اور چاندنی کی ٹھنڈک کا احساس ہوتا

ہے۔ ڈاکٹر مجیب شہزر نے کہا کہ اشوک انجم نے اپنے ناٹکوں کے ذریعے سماج میں پھیلی برائیوں کی نہ صرف نشاندہی کی ہے بلکہ ان پر نشتر بھی لگائے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وید پرکاش، سبودھ نندن شرما اور فادر سنی کٹور نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 ستمبر 2018

ڈاکٹر امام اعظم کی باز آفرینی

دربھنگہ: پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب 'ڈاکٹر امام اعظم کی باز آفرینی' کا اجرا 17 ستمبر 2018 کو معروف علم دوست وسماجی شخصیت جناب بلال حسن (صدر، بزم شہر نشاط) کے ہاتھوں مانو ریجنل سینٹر، کولکاتا میں انجام دیا گیا۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے جناب بلال حسن نے کہا

کہ ''ڈاکٹر امام اعظم کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف، مرتب ومترجم ہیں۔ ان کی ادارت میں رسالہ 'تمثیل نو' تقریباً 17 برسوں سے شائع ہورہا ہے۔ انھوں نے شہر کولکاتا کی منظوم ومنثور تاریخ بعنوان 'یہی کولکاتا ہے!' بھی لکھی ہے جو بہت جلد کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آئے گی۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی اردو ادب کے قد آور ادیب ہیں۔ ان کی تقریباً 225 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ انھوں نے 96 صفحات کی یہ کتاب لکھی ہے جو 18 ابواب پر مشتمل ہے۔'' ڈاکٹر مظہر قادری، غلام محمد، ڈاکٹر سعیدی امان اور سید ایاز احمد روہوی نے بھی اس کتاب کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا جبکہ ڈاکٹر مظہر قادری نے کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 ستمبر 2018

بہ نگاہ شرف

پانی پت: ریاست بہار کے رہنے والے علامہ قیوم خضر کی شہرۂ آفاق تصنیف 'بہ نگاہ شرف' کا اجرا ہریانہ وقف بورڈ کے صدر دفتر انبالہ میں ہوا۔ اسی مناسبت سے منعقدہ تقریب کی صدارت علامہ کے فرزند اور بورڈ کے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر امتیاز خضر اور نظامت عبدالسمیع انصاری نے کی۔ علامہ مرحوم کی یہ آخری کتاب ہے جس کو اب نئے پیرائے اور نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ یہ کتاب حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی مشہور ومعروف کتاب 'مکتوبات صدی و دوصدی' کا ایک انتخاب ہے جو حضرت کے ارشادات عالیہ اور بیش قیمت اقوال زریں پر مبنی تصنیف ہے۔ قیوم خضر کی تصوف پر یہ ایک اچھوتی تصنیف ہے۔ زیر نظر کتاب اردو زبان کے محاورات اور فصیح الفاظ کے ساتھ بھوجپوری اور مگھی زبانوں کے الفاظ کے استعمال کا ایسا مرکب ہے جس کا لب ولہجہ اور اسلوب اردو زبان ک اسلوبیائی ساخت کی ایک نئی شکل ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 ستمبر 2018

بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

نئی دھلی: معروف تنقید نگار ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری کی کتاب 'بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' کا اجرا ممتاز فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کے بدست انصاری اسلامک کلچرل سینٹر میں ہوا جس کی صدارت مرزا اعجاز بیگ راجیہ منتری درجہ صدر چھتیس گڑھ مدرسہ بورڈ رائے پور نے کی۔ مہمانان خصوصی مشہور ومعروف شاعر وصحافی حبیب سیفی اور معروف ادیب وایڈیٹر این سی ای آر ٹی پرویز شہریار تھے۔ اس موقعے پر مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ آزادی سے قبل یا آزادی کے وقت کے ہندوستان کو سمجھنا ہے تو بلونت سنگھ کو پڑھنا ہوگا۔ ہر بڑے شخص نے اپنا نظریہ پیش کرکے ہی اردو ادب کو بامِ عروج بخشا ہے۔ اس کتاب میں امتیاز احمد انصاری نے اپنا نظریہ پیش کرکے بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری وناول نگاری کی وسعت کو سمجھنے میں آسانیاں پیدا کی ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقعے پر صحافی فلاح الدین فلاحی، انصاری اطہر حسین، ابوصارم، ساجد عبید، سہیل احمد خان، ڈاکٹر نعمان قیصر، پردیپ بھٹناگر، این اے رضا، نعیم احمد انصاری، مبشر عالم، صابر میاں جان خان وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 28 ستمبر 2018

جنگ یہ کتنی بڑی ہے

نئی دھلی: معروف شاعر دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر شہپر رسول نے غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں منعقدہ خان جمیل مرحوم کے

شعری مجموعہ 'جنگ یہ کتنی بڑی ہے' کی رسم اجرا کے موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ خان جمیل ایک بہترین شاعر تھے جنھوں نے زندگی کے حقائق کو اپنی شاعری کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے کلام میں نیاپن ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر خالد محمود نے تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ خان جمیل کی شاعری معروضیت اور تسلسل کا پرتو ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر خالد جاوید نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اکتوبر 2018

قوم کا کوہ نور

علی گڑھ: شاہ جمال میں واقع تاریخی عیدگاہ پر لکھی گئی کتاب 'قوم کا کوہ نور' کا اجرا عمل میں آیا۔ مقررین نے اس موقعے پر کتاب کی اہمیت وافادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب نہ صرف تاریخی ہے بلکہ خود یہ کتاب تاریخ رقم کرے گی، کیونکہ ایسی کتابوں کی اشاعت اور اس کے پڑھنے سے نوجوان ذہنوں کا نہ صرف حقائق کا علم ہوتا ہے بلکہ ان کے ذہنوں کو جلا بھی ملتی ہے۔ تقریب رسم اجرا کی صدارت کرتے ہوئے مفتی شہر محمد خالد حمید نے کہا کہ کتاب کے مصنف محمد اکرام وارث نے 1984 میں تعمیر عیدگاہ کی تاریخ اور حقائق کو تلاش کیا۔ مہمانان خصوصی اور ادیب ارون آدتیہ نے کہا کہ اپنی تاریخ اور وراثت کو سنبھال کر رکھنا اپنی ذمے داری ہے۔ سید مازن علی زیدی نے کہا کہ جو تاریخوں کو محفوظ رکھتے ہیں تاریخیں بھی ان کو محفوظ رکھتی ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 ستمبر 2018

پردۂ سخن کا

جموں وکشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز نے محکمۂ اطلاعات وکشمیر اور اے آر آزاد میموریل فاؤنڈیشن کے اشتراک سے محکمہ اطلاعات کے آڈیٹوریم میں ایک روزہ ادبی تقریب کا انعقاد کیا جس میں وادی کے معروف شاعر وادیب اور ماہر تعلیم ڈاکٹر نذیر آزاد کے شعری مجموعہ 'پردہ سخن کا' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ تقریب کی صدارت معروف براڈ کاسٹر فاروق نازکی نے کی جبکہ ریٹائرڈ جسٹس بشیر احمد کرمانی بطور مہمان خصوصی کے موجود تھے۔ ایوان صدارت میں معروف ادیب وشاعر، رفیق راز، معروف نقاد وقلمکار محمد یوسف ٹینگ اور کلچرل اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عزیز صاحب موجود تھے۔ اس کے علاوہ

صلحہ سامعین میں وادی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض اکیڈمی کے چیف ایڈیٹر محمد اشرف ناک اور معروف براڈ کاسٹر محمد امین بٹ نے انجام دیے۔ بعدازاں جسٹس بشیر احمد کرمانی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر شخص کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے اور ہر کوئی شخص اپنی ذات کو ظاہر کرنے میں مختلف طریقے اپنا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عصر حاضر میں شاعر اور ادیب کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر نذیر آزاد کی ذہانت ان کے اشعار اور کلام سے آشکار ہوئی ہے۔ انھوں نے ان کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد فاروق نازکی نے اپنے صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر نذیر آزاد کو مبارک باد دی اور منظوم پیرائے میں شاعر کی شاعری کی داد دی۔ آخر میں اے آر آزاد میموریل کے جنرل سکریٹری شکیل آزاد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کا۔

روزنامہ...... کشمیر، 30 ستمبر 2018

'فکروتحریز' کا 'ریسرچ اسکالرز نمبر'

کلکتہ: 2 اکتوبر کو شام 7 بجے شہر کے معروف ادبی ادارے 'بزمِ افضل' کے زیر اہتمام شائع ہونے والے سہ ماہی ادبی رسالہ 'فکر وتحریز' کے خصوصی شمارہ 'ریسرچ اسکالرز نمبر' کی رونمائی مسلم انسٹی ٹیوٹ کے کمپیوٹر ہال میں جناب امام الدین (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ روایتوں سے انحراف کرتی اس تقریب میں صدارت بھی ایک ریسرچ اسکالر جناب محمد رکن الدین (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی) نے کی جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے بھی ایک ریسرچ اسکالر جناب جرار احمد (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد) جلوہ افروز تھے۔ تقریب کی نظامت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر نعیم انیس نے 'فکر وتحریز' کے زیر نظر شمارے کے متعلق کہا کہ اس شمارے میں صرف ریسرچ اسکالرز کی نگارشات شامل ہیں خواہ وہ شعری ہوں یا نثری۔ شمارے میں 20 مقالے، 1 انشائیہ، 2 افسانے، 6 غزلیں اور 3 نظمیں شامل ہیں۔ تقریب کا افتتاح جناب کریم رضا مونگیری نے کرتے ہوئے بزم افضل کی ادبی سرگرمیوں کی ستائش کی۔ اپنے استاد گرامی پروفیسر اعزاز افضل مرحوم کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بزم افضل رسالہ 'فکر وتحریز' کے ذریعے ادب کی صالح اقدار کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اعزازی جنرل سکریٹری جناب نثار احمد نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کے فعال ذمہ داران میں سے ایک ڈاکٹر نعیم انیس بھی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے ایجوکیشن سکریٹری ہونے کے علاوہ ایک ادیب اور ادبی رسالے کے مدیر کی حیثیت سے بھی ان کی مصروفیت بہت ہیں، تاہم وہ ان تمام ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ آج کی یہ تقریب ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'فکر وتحریز' کے خصوصی شمارہ 'ریسرچ اسکالرز نمبر' کی رونمائی کی تقریب ہے۔ معروف ڈراما نگار اور ناقد جناب ظہیر انور نے نوجوان ریسرچ اسکالرز کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی تقاریب آپ کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوں گی۔ راستہ بہت طویل اور پرخطر ہے اور منزل بہت دور ہے۔ سنبھل کر چلیں۔ تخلیقیت پر غور کریں۔ متن سے اپنا رشتہ مضبوط کریں۔ کٹ اور پیسٹ کے اس زمانے میں سرقہ بازی عام ہے۔

ان سب سے یکسر گریز کرتے ہوئے، انھیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سفر طے کریں۔ آصف علی مرزا نے غزل پیش کی۔ تقریب سے جناب محمد رکن الدین، جناب امام الدین، جرار احمد، شاداب شمیم، امیر حمزہ، محمد راشد اور محمد شہاب (ڈھاکہ، بنگلہ دیش) وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ تقریب کا اختتام جناب اختر حسین (صدر، بزم افضل) کے کلمات تشکر سے ہوا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کلکتہ، 13 اکتوبر 2018

وفیات:

وشنو کھرے

نئی دھلی: ہندی اکادمی کے نائب صدر وشنو کھرے کا 19 ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ انھیں برین ہیمرج کے بعد دہلی کے جی بی پنت اسپتال میں داخل کرایا تھا جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کی حالت نازک بنی ہوئی تھی۔ وشنو کھرے مدھیہ پردیش کے چھندواڑہ

میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں وہ میورو ہار کے ہندوستان اپارٹمنٹ میں کرایہ کے ایک کمرے میں اکیلے رہتے تھے۔ انھوں نے اندور کے کرسچین کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد ہندی صحافت سے اپنے کریئر کی شروعات کی۔ وہ کچھ وقت تک 'دینک اندرو' میں ڈپٹی ایڈیٹر رہے اور بعد میں انھوں نے دہلی، لکھنؤ اور جے پور میں 'نو بھارت ٹائمس' کے ایڈیٹر کا کام سنبھالا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 ستمبر 2018

عبدالرؤف خوشتر

سولاپور (سلطان اختر) : ممتاز طنز ومزاح نگار عبدالرؤف خوشتر کا انتقال 8 ستمبر 2018 کو 74 سال کی عمر میں بیجاپور میں ہوا۔ آپ کی پیدائش 17 اکتوبر 1944 کو سولاپور میں ہوئی۔ عبدالرؤف خوشتر مخلص، خلوص ومحبت کے پیکر، بلند کردار محسن، زندہ دل، خوش مزاج اور شریف النفس انسان تھے۔ آپ کی کئی کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں جن میں غبارِ خاطر (1982)، آنکھ بیتی (2009)، صرف دربار (2012)۔ اس موقعے پر خان عبدالغفار خان ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اور بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام تعزیتی نشست منعقد کی گئی تھی جس کی صدارت ممتاز ادیب وشاعر، ظرافت نگار ایڈوکیٹ عبدالرشید عرف ارشد شولاپوری نے کی۔ مرحوم کے بھائی، معروف ناظم مشاعرہ جناب کمشنر انور حسین نے اپنے قلیدی خطبے میں عبدالرؤف خوشتر صاحب کے انتقال کو اپنا ذاتی نقصان قرار دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر شفیع چوبدار (صدر شعبہ اردو سوشل سینیئر کالج شولاپور) نے اپنے اظہار خیال میں مرحوم کی علمی وادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ خان عبدالغفار خان سوسائٹی کے صدر الطاف حسین کمٹھے نے اپنی والہانہ تقریر میں کہا کہ خوشتر صاحب کی اردو زبان وادب کے حوالے سے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، سولاپور، مہاراشٹر، 22 ستمبر 2018

نعمان فاروقی

نئی دھلی: معروف پرنٹر پبلشر نعمان فاروقی کا حرکت قلب بند ہوجانے سے 26 ستمبر 2018 کو انتقال ہوگیا۔ ہولی فیملی اسپتال میں انھوں نے آخری سانس لی۔ 57 سال کے نعمان فاروقی اردو کے معروف پرنٹر اور پبلشر ہیں جو

ذاکرنگر میں رہتے تھے۔ پسماندگان میں بیوی اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی آخری رسوم بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ادا کی گئی۔ جنازے میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 ستمبر 2018

پروفیسر وسیم بریلوی کی بہو قلمکار ثنا گل

سہارنپور: رکن ایوان بالا اور عالمی شہرت یافتہ شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کے صاحب زادے کی اہلیہ اور قلم کار ثنا گل کی کناڈا میں انتقال کی خبر سے ادبی حلقوں کی فضا سوگوار ہوگئی ہے۔ سماجی تنظیموں، شعرا اور سرکردہ لوگوں نے اظہار رنج و غم کرتے ہوئے مرحومہ کے درجات کی بلندی اور لواحقین کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ مرحومہ ثنا گل اپنے شوہر اور وسیم بریلوی کے صاحب زادے موزوں وسیم کے ساتھ کناڈا میں رہتی تھیں، ایک جان لیوا مرض نے ان کی جان لے لی، مرحومہ ہمدرد یونیورسٹی سے ایم بی اے کے بعد سے مختلف سماجی، اخلاقی اور دینی معاملات پر انگریزی میں مضامین لکھتی تھیں جو بہت سے انگریزی جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ اس موقعے پر اظہار تعزیت کرنے والوں میں ڈاکٹر نواز دیوبندی، افضل منگلوری، راؤ محبوب علی، مجیب ملک، آصف شمسی، ہارون صابر، فیاض ندیم، عمران ضیا، مہتاب عالم سمیت درجنوں مقامی شعرانے پرفیسر وسیم بریلوی سے اظہار ہمدردی کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 ستمبر 2018

خراج عقیدت:

ڈاکٹر مبارک انصاری

گورکھپور: معروف شاعر ڈاکٹر مبارک انصاری کے انتقال پر ایک تعزیتی میٹنگ شہر کی مختلف ادبی تنظیموں کے ارکان کی 'ادبی لہریں' کے جنرل سکریٹری عاصم رؤف کے مکان پر منعقد ہوئی، جس میں شرکا نے اظہار رنج و غم کرتے ہوئے ان کی ادبی اور سماجی خدمات کو یاد کیا اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ شرکا نے اتفاق رائے سے ڈاکٹر مبارک انصاری کو شہر کا ایک نامور شاعر اور ایک بہترین انسان قرار دیتے ہوئے ان کے انتقال کو ناقابل تلافی خسارہ قرار دیا۔ اس موقعے پر اظہار تعزیت پیش کرنے والوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 24 ستمبر 2018

صحافی لیاقت اللہ شیروانی کے لیے تعزیتی نشست

باغپت: اردو دنیا کے نامور صحافی لیاقت اللہ خان شیروانی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تعزیتی میٹنگ منعقد کی گئی۔ سابق صوبائی وزیر ڈاکٹر معراج الدین احمد نے میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ معروف صحافی لیاقت اللہ خان شیروانی نے اردو کے علاوہ جو رفاہی خدمات کی ہیں اسے زندگی بھر بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ معروف صحافی لیاقت اللہ خان شیروانی کے اندر قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہمیشہ زور دیتے رہے اور انھوں نے باغپت کے ساتھ کئی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم اور رفاہی کاموں کو سرانجام دیا۔ میٹنگ میں مصباح الدین عباسی، شیام سنگھ، چودھری ننھے، حاجی تنظیم قریشی، بابر چوہان، چودھری حاسی سرپنچ کے ساتھ بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 ستمبر 2018

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................ بتاریخ............ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زر تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

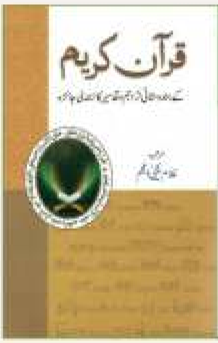

قرآن کریم کے ہندوستانی تراجم وتفاسیر کا اجمالی جائزہ

مرتب: غلام یحییٰ انجم
صفحات: 604
قیمت: 260 روپے

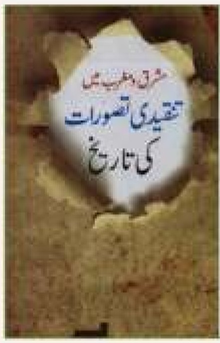

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

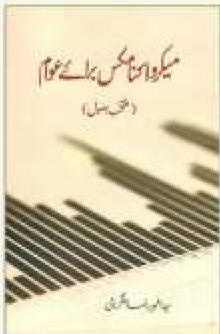

میکرواکنامکس برائے عوام

مصنف: سید اطہر رضا بلگرامی
صفحات: 196
قیمت: 110 روپے

رینگنے والے جانور

مصنف: قیصر سرمست
صفحات: 84
قیمت: 22 روپے

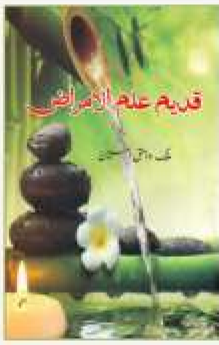

قدیم علم الامراض

مصنف: ملک وامق امین
صفحات: 131
قیمت: 50 روپے

گیلیلیو کی کہانی ان کی زبانی

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 37
قیمت: 40 روپے

یہ جسم وجان

مصنف: انصار احمد معروفی
صفحات: 51
قیمت: 20 روپے

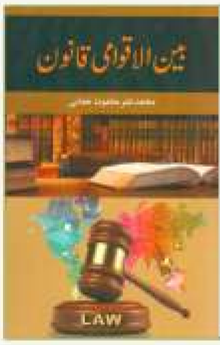

بین الاقوامی قانون

مصنف: محمد ظفر محفوظ نعمانی
صفحات: 264
قیمت: 135 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, November-2018, Vol.20, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2018
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025